عجائباتِ فرنگ

سفرنامہ





امریکہ میں رہتے بستے ہوئے کافی دن ہو گئے تو ہمیں اپنے آس پاس رہنے والے دوستوں کی یاد آئی۔ یاد تو پہلے بھی آتی تھی مگر نئے ملک میں نئے کاروبار کی تلاش اور پھر اسے جمانے میں اتنے مصروف رہے تھے کہ دوستوں کے پاس جانے آنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ جب ان کاموں سے ذرا فرصت ملی اور جان میں جان آئی تو ہم نے اپنے دوستوں کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا۔ سارے امریکہ میں ہمارا کوئی رشتے دار تو نہیں تھا۔ رشتے داروں جیسے چند دوست ضرور تھے اور انہی کی وجہ سے ہم نے اتنے بڑے ملک امریکہ کی ساری ریاستوں اور سارے شہروں کو چھوڑ کر ورجینا میں پڑاؤ ڈالا تھا کینیڈا میں ہمارے نہایت عزیز اور بے تکلف دوست عبدالخالق صاحب موجود تھے اور ٹورنٹو میں رہتے تھے۔ خالق صاحب ہمارے ابتدائی زمانے کے دوستوں میں شامل ہیں۔ جب ہم بھی صحافی تھے اور وہ بھی۔ ہم صحافت کے ساتھ ساتھ فلم میں بھی پیر پھیلا رہے تھے۔

خالق صاحب ہمارے سارے دوستوں میں اپنے قد کاٹھ اور صورت شکل کی وجہ سے ممتاز تھے۔ نکلتا ہوا قد سرخ و سپید رنگت دل کش خدو خال' بات کرنے کا ڈھنگ ایسا کہ جو دیکھے یہ سمجھے کہ شاید کوئی امریکن ایکٹر راستہ بھول کر آ نکلا ہے۔ نہایت ذہین' حاضر جواب' خوش ذوق' خوش لباس اور خوش مزاج۔ خوش باش ایسے کہ ہر دم دوستوں کے جمگھٹے میں گھرے رہتے۔ بلا کے فقرہ باز اور انتہائی شاہ خرچ۔ اس زمانے میں ایک صحافی بھلا کیا شہ خرچی کرتا ہو گا؟ یہ ہم سے سنئے۔ خالق صاحب کا یہ عالم تھا کہ پہلی تاریخ کو انہیں جو تنخواہ ملتی تھی' وہ اس کا ایک حصہ تو قرض خواہوں کو ادا کر دیا کرتے تھے اور باقی رقم اپنی جیب میں ڈال کر دوستوں کے ہمراہ شہر لاہور کے سب سے مہنگے ہوٹل کا رخ کرتے تھے۔ مہینے کے ابتدائی چند دن تو ان ہوٹلوں میں کھانے' چائے اور کافی کی دعوتوں

میں گزر جاتے۔ اس کے بعد درمیانہ درجے کے ہوٹلوں کی باری آجاتی اور دس بارہ دن کے بعد کینٹین سے کھانا منگانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ خالق صاحب کو ان شاہانہ عادتوں کے باعث ان کے بے تکلف دوست "نواب" کہا کرتے تھے اور وہ اس خطاب کے مستحق بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے قریبی دوستوں میں آج بھی نواب عبدالخالق کے نام سے مشہور ہیں۔

نواب صاحب صحافت چھوڑ کر محکمہ اطلاعات سے وابستہ ہو گئے۔ پھر وہاں سے بھی دل برداشتہ ہوئے تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یورپ کی راہ لی۔ یورپ کے سارے ملکوں میں انہیں فرانس اور تمام شہروں میں پیرس پسند آیا اور انہوں نے وہاں سکونت اختیار کر لی۔ لندن اور پیرس میں مختلف کام کئے۔ فرانس کی ایک دوشیزہ سے شادی کی جو چند سال قائم رہی۔ پھر انہوں نے کینیڈا کا رخ کیا اور ٹورنٹو میں جا کر پڑاؤ ڈال دیا۔ نواب عبدالخالق تخلیقی ذہن کے آدمی تھے۔ ہمیشہ صحافت کے پیشے سے متعلق رہے تھے مگر یورپ میں انہوں نے دوسرے شعبوں میں بھی اپنی ذہانت آزمائی اور پتا چلا کہ وہ تو ہر فن مولا ہیں۔ چناں چہ کینیڈا کے ایک سپر اسٹور "لوب لاز" سے وابستہ ہوئے اور چند ہی سالوں میں اتنی ترقی کی کہ "لوب لاز" کے وائس پریذیڈنٹ بن گئے۔ "لوب لاز" کینیڈا میں اسٹورز کا ایک بہت وسیع سلسلہ ہے۔ پورے ملک میں اس کے چھ سات سو کے قریب اسٹورز ہیں اور ان میں سے ہر اسٹور اتنا بڑا ہے کہ ابھی تک ہمارے ملک کے چار پانچ بڑے اسٹورز مل کر بھی اس ایک کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ دنیا کی ہر چیز وہاں ملتی ہے۔ ان دنوں خالق صاحب "لوب لاز" کے وائس پریذیڈنٹ تھے۔ وہ کینیڈا کے شہری بن چکے ہیں اور پھر "لوب لاز" جیسے ادارے کے نائب صدر ہیں اس لئے ویزا وغیرہ کی پرابلم ان کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہوتی۔ مختلف ملکوں کے ہوائی ٹکٹ اور کرنسی ہر دم ان کے پاس ہوتی ہے۔ کریڈٹ کارڈز سے ان کا پرس بھرا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب چاہیں، جس ملک میں چاہیں چلے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وقت پابہ رکاب رہتے ہیں۔ صبح کہیں، شام کہیں، کبھی مشرق بعید کے ملکوں کو جاتے ہوئے پاکستان میں بھی آنکلتے اور اپنے پرانے دوستوں سے ملنے اور پرانی یادیں تازہ کرنے کے لئے لاہور بھی پہنچ جاتے ہیں۔ لاہور میں نواب عبدالخالق کی سب سے پہلی فرمائش یہ ہوتی ہے کہ تانگے میں بٹھاؤ اور گردے اور چانپیں کھلانے لکشمی چوک لے چلو۔ اس کے بعد تانگے میں بھاٹی لوہاری کا اور مختلف پرانے علاقوں کا چکر لگاتے، گول گپے کھاتے، حلیم اور نہاری سے لطف اندوز ہوتے اور دوستوں سے ملنے ملانے کے بعد ہوائی جہاز میں بیٹھ کر کراچی اور پھر وہاں سے اپنے سفر پر روانہ ہو جاتے۔

ہم نے امریکہ پہنچ کر نواب صاحب کو اپنے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔ کیوں کہ پہلے تو ہم وہاں کوئی معقول کاروبار تلاش کرنے میں مصروف رہے تھے، پھر جب ایک ریستوران خریدنے کا فیصلہ کیا تو اس کے بعد اسے چلانے کی مشکل میں پڑ گئے۔ نواب صاحب کو فون کرنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ فوراً فرمائش کرتے کہ جلدی سے ٹورنٹو آ جاؤ۔ ظاہر ہے کہ ہم وہاں جا نہیں سکتے تھے۔ اس طرح نواب صاحب کو روٹھنے کا موقع مل جاتا لیکن امریکہ میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد جب ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اب ہمیں یہاں نہیں رہنا چاہئے اور اپنا بستر بوریہ گول کر کے واپس روانہ ہو جانا چاہئے تو ہمیں سب سے پہلے نواب عبدالخالق کی یاد آئی اور ہم نے انہیں ایک عدد ٹیلی فون ارسال کر دیا۔ خوش قسمتی سے نواب صاحب ان دنوں ٹورنٹو میں موجود تھے۔ حسب معمول انہوں نے نعرہ مارا "حضور، آپ کہاں ہیں؟"

ہم نے بتایا کہ ورجینیا سے بول رہے ہیں۔

"ورجینیا، یعنی امریکا؟ وہاں کب قدم رنجہ فرمایا؟"

نواب صاحب عموماً اس قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

ہم نے بتایا کہ کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ اب ہمیں پاکستان اور لاہور یاد آ رہا ہے اس لئے واپسی سے پہلے آپ کو فون کر رہے ہیں۔ انہوں نے پہلے تو سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ پہلے خبر کیوں نہ کی؟ آئے کیوں نہیں؟ بلایا کیوں نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ ہم نے عرض کی "یہ بہت لمبی باتیں ہیں جو فون پر نہیں بتائی جا سکتیں۔"

"تو پھر فوراً آ جائیے ٹورنٹو۔"

ہم نے کہا "بہت مشکل ہے۔"

بولے "تو پھر خاکسار وہاں آ جاتا ہے۔"

ہم نے کہا "یہ بہت مناسب ہے۔"

انہوں نے فوراً اپنی ڈائری دیکھی پروگرام چیک کئے۔ کچھ زبانی حساب کیا' سیکریٹری سے مشورہ کیا اور پھر ہمیں بتایا کہ انہیں پیرس اور ڈنمارک جانا ہے۔ اس سے پہلے وہ ہمارے پاس واشنگٹن آ جائیں گے۔ ایک دن اور ایک رات کے لئے۔ بعد کی باتیں بعد میں دیکھ لی جائیں گی۔ پروگرام کے مطابق انہیں ہفتے کی شام واشنگٹن پہنچنا تھا۔ اگلے دن اور رات ہمارے ساتھ قیام کرنا تھا اور پھر اپنے سفر پر روانہ ہو جانا تھا۔

جب ہماری ان سے واشنگٹن کے ہوائی اڈے پر ملاقات ہوئی تو انہوں نے فوراً اپنے مخصوص اسٹائل میں علیک سلیک کی۔ گلے لگایا' ہماری بیوی بچوں سے ہیلو ہیلو کی 'بچیوں سے ہنسی مذاق کیا' ہماری بیگم پر چند فقرے چست کئے اور یہ ثابت کر دیا کہ وہ پہلے والے نواب عبدالخالق ہی ہیں۔ وقت' ماحول اور حالات نے ان پر فرق نہیں ڈالا ہے۔ وہی شائستہ اور لچھے دار گفتگو' وہی منفرد انداز اور وہی شکل و صورت۔ وہ ہم سے کہتے رہے کہ آپ تو ویسے کے ویسے ہی ہیں اور ہم انہیں یقین دلاتے رہے کے وہ جوں کے توں ہیں۔ ان میں ذرہ برابر فرق بھی نہیں آیا ہے حالاں کہ ان کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی اور تن و توش میں بھی قدرے اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ ابھی تک خاص اور کھرے نواب عبدالخالق تھے اور بڑے اسمارٹ۔

نواب صاحب حسب پروگرام ایک دن اور دو رات ورجینیا میں ہمارے ساتھ رہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنی اپنی کتھا سناتے رہے۔ مختصراً تمام حالات زندگی بیان کئے گئے۔ آخر میں تان اس پر توڑی کہ ہم ٹورنٹو جائیں گے۔ وہاں ٹیلی ویژن اور فلم کے شعبے میں کافی روشن امکانات موجود ہیں۔ ان کا جائزہ لینے کے بعد ہم کوئی مناسب فیصلہ کریں گے۔ ان کا جائزہ لینے کے بعد ہم کوئی مناسب فیصلہ کریں گے۔ نواب صاحب یہ تمام پروگرام طے کرنے کے بعد جس تیزی سے آئے تھے اسی تیزی سے واپس روانہ ہو گئے۔ ہم نے انہیں واشنگٹن کے ایئرپورٹ پر خدا حافظ کہا اور وہ اپنے سفر پر روانہ ہو گئے جو انہیں آدھی دنیا کے ملکوں میں لے جانے والا تھا۔ رخصت ہوتے وقت بھی انہوں نے بہت تاکید کی' وعدہ لیا' اور پھر احتیاطاً ہماری بیگم لبنیٰ اور بچیوں کو بھی سمجھایا کہ اگر ہم ذرا بھی لیت و لعل کریں تو وہ ہم پر دباؤ ڈال کر کینیڈا جانے کے لئے مجبور کریں۔ جاتے جاتے وہ پھر پلٹ کر ہمارے پاس آئے۔ زور و شور سے مصافحہ کیا اور ایک بار پھر یاد دہانی کروائی۔ نواب صاحب کی محبت اور اخلاص کے ہم ہمیشہ سے قائل رہے ہیں۔ یہ سب اس کی مزید تصدیق سمجھ لیجئے۔

نواب صاحب تو چلے گئے' مگر اپنے پیچھے جو کارندے چھوڑ گئے تھے انہوں نے ہماری زندگی وبال کر دی۔ نادیہ اور پارو ہمیں قریباً ہر روز دو تین بار یاد دلاتی تھیں کہ ہمیں کینیڈا جانا ہے۔ اور ہم انہیں تسلی دے دیا کرتے تھے کہ جوں ہی فرصت ملی ہم لوگ ٹورنٹو روانہ ہو جائیں گے۔ اس دوران میں خود نواب صاحب بھی ٹورنٹو سے اور دنیا کے دوسرے شہروں سے گاہے گاہے ٹیلی فون کرتے رہتے تھے اور تقاضے کر رہے تھے کہ حضور آپ نے بہت دیر لگا دی اور ہم جواب میں عرض کرتے کہ حضورِ والا پہلی فرصت میں قدم بوسی کے لئے حاضر ہو جاؤں گا۔

امریکا اور کینیڈا دو ایسے ملک ہیں جو ساری دنیا کے لوگوں کی آنکھ کا تارہ ہیں دنیا کے کسی بھی گوشے میں جو شخص آباد ہے اس کے دل میں یہ خواہش پروان چڑھتی رہتی ہے کہ وہ امریکا یا کینیڈا میں جا کر آباد ہو جائے۔ ورنہ کم از کم اس کا ایک نظارہ تو ضرور کر لے۔ ہم نے بہت کم لوگوں کے دلوں کو اس آرزو سے خالی پایا ہے۔ امریکہ جانے کے لئے لوگ جائز و ناجائز ہر قسم کے ذرائع استعمال کرتے ہیں۔ جو وہاں ایک بار پہنچ جاتے ہیں وہ پھر وہاں سے واپس آنے کا نام نہیں لیتے۔ یا تو غیر قانونی طور پر لا پتا ہو جاتے ہیں یا پھر مناسب وکیل کی خدمات حاصل کر کے مقدمے لڑنے میں مصروف رہتے ہیں۔ ہم نے امریکا میں ایسے لوگ بھی دیکھے جو اٹھارہ سال تک مقدمہ لڑنے کے بعد آخر کار ہار گئے اور انہیں "امریکہ بدری" کا حکم مل گیا۔ ایسے بھی ملے جو آخر کار اللہ کو پیارے ہو گئے مگر ان کے مقدمات کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ اس سے آپ یہ مراد نہ لیں کہ امریکا میں مقدمات کا فیصلہ بہت تاخیر سے ہوتا ہے۔ جی نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ دوسرے مقدمات کے مقابلے میں امیگریشن کے مقدمات کی تاریخیں کافی تاخیر سے ملتی ہیں مگر اللہ وکیلوں کو زندہ سلامت رکھے، وہ مقدمے کو طول دینے کے بہانے ضرور ڈھونڈ نکالتے ہیں اور اس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

مگر ہمارا یہ معاملہ ہے کہ جب تک ہم امریکہ نہیں گئے تھے کبھی ہمارا دل نہیں چاہا کہ امریکا بھی جائیں حالاں کہ وہاں کی باتیں اور تعریفیں سن سن کر ہمارے کان پک گئے تھے مگر امریکا اور کینیڈا جانے کی خواہش اس دل ناتواں میں کبھی پیدا نہیں ہوئی جب کہ بار بار یورپ جانے کے لئے ہمارا دل ہر وقت تڑپتا رہتا تھا۔ پھر تقدیر ہمیں امریکا لے گئی۔

... نہیں تھا بلکہ امریکا میں کینیڈا کا تذکرہ عموماً ہوتا رہتا ہے۔ اکثر

امریکیوں کے دوست اور رشتے دار کینیڈین شہریوں کے لئے ایک دوسرے ملک میں جانے کے لئے ویزے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی اس لئے کسی روک ٹوک کے بغیر وہ ایک دوسرے ملک میں آنے جانے کے لئے آزاد ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک صاحب آج امریکا میں ملازمت یا کوئی کاروبار کر رہے ہیں اور کل دل میں نہ جانے کیا سمائی کہ کینیڈا روانہ ہو گئے۔ عملی طور پر کینیڈا تو امریکا ہی کی ایک ریاست کے مانند ہے۔ باہمی کاروبار اور لین دین میں بھی کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ ایک ملک کے بینک کا چیک دوسرے ملک کے کسی بھی بینک میں کیش ہو جاتا ہے۔ بڑے بڑے تجارتی اداروں کے دفاتر بھی دونوں ملکوں میں موجود ہیں اور بلا امتیاز ضرورت مندوں کے کام آتے رہتے ہیں۔ مثلاً ہم نے واشنگٹن میں شیورلے کمپنی سے کار خریدی تھی گارنٹی کی مدت پوری ہونے سے قبل اس میں خرابی پیدا ہو گئی۔ اس وقت ہم ٹورنٹو میں تھے۔ ہم نے فوراً شیورلے کمپنی کی مقامی ورکشاپ کو فون کیا اور انہوں نے ہمیں کار لے کر آنے کا مشورہ دیا۔ وہاں پہنچے تو انہوں نے سب سے پہلے ہماری گارنٹی کے کاغذات دیکھے اور جان گئے کہ ابھی ہماری گارنٹی کی مدت ختم نہیں ہوئی۔ لہٰذا انہوں نے گاڑی کا معائنہ کرنے کے بعد مختلف چیزیں تبدیل کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ ہم نے کار ان کے پاس چھوڑ دی۔ دو دن بعد مقررہ وقت پر پہنچے تو کار بالکل تیار تھی۔ انہوں نے اٹھارہ سو ڈالر کا ایک بل ہماری خدمت میں پیش کیا تو ہم پریشان ہو گئے۔ سیلز مین ایک ہندوستانی تھا۔ بولا "مسٹر آفاقی! پریشان نہ ہوں۔ آپ کو اس بل پر صرف دستخط کرنے ہیں۔"

ہم نے دستخط کئے اور کار لے کر چلے آئے۔ ایسی سہولتیں مغربی ملکوں ہی میں مل سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اور واقعہ بھی یاد آیا۔ ہم نے لندن میں "وولزورتھ" سٹور سے کچھ ملبوسات خریدے تھے مگر وہ سویٹر ہمیں پسند نہیں تھے۔ سوچ رہے تھے کہ لندن گئے تو واپس کر دیں گے یا پھر کسی کو تحفہ دے دیں گے۔ ایک دن ٹورنٹو میں گھومتے ہوئے ہمیں "وولزورتھ" کا اسٹور نظر آ گیا۔ اندر آ گئے تو قریب قریب وہی منظر تھا جو لندن کے اسٹورز میں ہوتا ہے۔ ایک اسمارٹ سیلز گرل سے ہم نے دریافت کیا کہ کیا لندن میں خریدا ہوا سویٹر آپ لوگ واپس لے سکتے ہیں؟

انہوں نے مسکرا کر آنکھیں گھمائیں "آف کورس۔ بھلا کیوں نہیں؟"

ہم نے کہا "مگر ہمارے پاس اس کی رسید موجود نہیں ہے۔"

وہ بولیں "تو کیا ہوا' آپ خریدنے والے تو موجود ہیں۔"

ہم نے دوسرے دن سوئٹر واپس کر دیے۔ ان کے بدلے ہماری بیگم نے اپنے لیئے ایک لباس خرید لیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

مگر اب ہمارے دل میں کینیڈا جانے کی تمنا کروٹیں لینے لگی تھی اور اس کا سب سے بڑا سبب نواب عبدالخالق تھے۔ ادھر بچیاں بھی کینیڈا دیکھنے کی آرزو مند تھیں۔ نواب صاحب نے ان کے سامنے ایسا نقشہ کھینچا تھا کہ وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے بے تاب ہو گئی تھیں۔ پھر ہمارے لئے ایک دلچسپی یا لالچ یہ بھی تھا کہ امریکہ میں تو ہم ایک ریستوران چلا رہے تھے اور اس کام میں ہمارا ذرا بھی دل نہیں لگتا تھا' مگر نواب صاحب کے بقول کینیڈا میں ہمارے لئے فلم اور ٹیلی ویژن سے وابستہ ہونے کا موقع موجود تھا اور یہ دونوں ہمارے مطلب کے کام تھے بلکہ دل پسند مشغلے تھے۔

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ہمارے ریستوران میں ایک نوجوان جوڑا پنیر کھانے کے لئے آیا۔ ہمارے منیجر سے انہوں نے ہمارے بارے میں دریافت کیا کہ کیا یہ صاحب بھارتی ہیں؟

بسام ایک فلسطینی اور خالص مسلمان تھے۔ یہ اور بات کہ امریکا میں سولہ سترہ سال سے قیام پذیر تھے اور امریکیوں کے لہجے میں انگریزی بولتے تھے مگر اندر سے تو مسلمان تھے۔ انہوں نے بڑے فخریہ انداز میں بتایا کہ یہ صاحب پاکستانی ہیں۔ مسلمان ہیں اور آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ وہاں کے فلم ساز بھی ہیں۔ بسام صاحب کو جب سے ہمارے بارے میں ایک پاکستانی ٹیکسی ڈرائیور نے یہ معلومات فراہم کی تھیں وہ ہر گاہک کو یہ اطلاع ضرور فراہم کرتے تھے کہ مسٹر آفاقی ایک فلم ساز ہیں۔

کچھ دیر بعد بسام' جنہیں امریکا میں سام کہا جاتا تھا' ہمارے پاس آئے اور بتایا کہ وہ سامنے جو صاحب بیٹھے ہیں وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہم سمجھے کہ شاید کھانے کی تعریف کریں گے یا پھر اس میں کیڑے نکالیں گے۔ ظاہر ہے ایک ریستوران کے مالک سے گاہک یہی دو باتیں کرتے ہیں' مگر جب ہم ان کی میز کے قریب پہنچے تو وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور خالص امریکی لب و لہجے میں اپنا تعارف کرایا۔ ان کا نام جیکب تھا اور ہمراہ جو خاتون

تھیں ان کو وہ میری کہہ کر بلاتے تھے۔ میری ایک خوش شکل خاتون تھیں اور خاصا قیمتی اور فیشن ایبل لباس پہنے ہوئے تھیں۔ جیکب نے بتایا کہ وہ امریکہ میں دستاویزی فلمیں بناتے ہیں مگر فیچر فلمیں بنانے کی خواہش مند ہیں۔ وہ انڈیا اور پاکستان کے بارے میں دستاویزی فلمیں بنانے کے بارے میں سوچ رہے تھے اور اسی موضوع پر ہم سے بات چیت کرنا چاہتے تھے۔ ہم تو اس وقت بات چیت کے لئے تیار تھے کیوں کہ شام کا وقت تھا اور ہمارے پاس کوئی مصروفیت نہیں تھی مگر جیکب صاحب کی میری کے ساتھ ڈیٹ تھی اس لئے وہ اپنی شام خراب کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ہمارے ریستوران سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں۔ اپنا پتا اور فون نمبر بتانے کے بعد انہوں نے ہمیں دعوت دی کہ اگلے روز ہم شام کو چھ بجے ان کے ساتھ چائے نوش کریں۔ ہم نے دعوت منظور کر لی۔ ان کا گھر زیادہ دور نہیں تھا اور اکثر ہم اپنی گاڑی اسی جگہ پارک کر کے جرمانے ادا کرتے رہتے تھے کیوں کہ وہ پارکنگ محض وہاں کے رہنے والوں کے لئے تھی۔

دوسرے دن ہم نے جیکب کے فلیٹ کی گھنٹی بجائی تو وہ خود تشریف لائے۔ گھر خوب صورت اور سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ اوپر پہنچے تو ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم ٹائپ کا ایک کمرا تھا۔ باورچی خانہ بھی اس کے اندر تھا۔ ایک چھوٹی سی کھانے کی میز پر دو کرسیاں آمنے سامنے رکھی ہوئی تھیں۔ موم بتیاں جل رہی تھیں اور ایک کرسی پر مس میری جلوہ فرما تھیں۔ انہوں نے مسکرا کر ہمارا خیر مقدم کیا۔ جیکب صاحب نے ہمارے لئے میز کے سامنے ایک اور کرسی ڈال دی۔ ہم نے دیکھا کہ میز پر کھانا لگا ہوا تھا بلکہ جب ہم وہاں پہنچے تو وہ دونوں ڈنر کھانے میں مصروف تھے۔ جیکب صاحب ہم سے معذرت کر کے اٹھے سامنے والے باورچی خانے میں جا کر چائے دانی میں سے ایک پیالی چائے بنائی اور ہمارے ہاتھ میں پیالی تھما دی۔ چائے میں نہ دودھ تھا اور نہ چینی۔ خیر دودھ تو اتنی ضروری چیز نہیں ہے مگر چینی کے بغیر کوئی شریف آدمی چائے نہیں پی سکتا اس لئے ہم نے ان سے چینی کی فرمائش کی وہ فوراً چینی کے ٹکڑے اٹھا لائے جب ہم نے تین چار ٹکڑے پیالی میں ڈالے تو ان دونوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں پوچھنے لگے "کیا آپ کے ملک میں لوگ اتنا ہی میٹھا پیتے ہیں؟"

ہم نے کہا" اس سے بھی زیادہ ہم تو سمجھو کہ پھیکی چائے پینے کے عادی ہیں۔"
انہوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور جیکب نے میری سے کہا" میری' یہ بات نوٹ کرلو۔"
میری نے برابر والی میز سے ایک چھوٹی نوٹ بک اور پنسل اٹھا کر اس پر یہ معلومات تحریر فرمالیں۔
اب باتیں شروع ہوگئیں وہ دونوں کھانا بھی کھاتے جا رہے تھے مگر کیا مجال جو ایک بار بھی ہم کو جھوٹے منہ کھانے کے لئے پوچھا ہو۔ اس کا عذر جیکب نے ہمیں رخصت کرتے ہوئے پیش کیا اور بولے "معافی چاہتا ہوں کہ آپ کو کھانا پیش نہیں کر سکا۔ دراصل یہ کھانا دو آدمیوں کے لئے ہی تھا جو میں نے گزشتہ روز پکا کر رکھ لیا تھا۔"
ہم نے فراخ دلی سے کہا "کوئی بات نہیں۔" ہم باسی کھانا ویسے بھی نہیں کھاتے بلکہ اسے بہت معیوب سمجھتے ہیں۔"
وہ بولے "کیا آپ کے ملک میں سبھی لوگ ایسا کرتے ہیں؟"
ہم نے کہا "اور کیا بلکہ باسی کھانا پیش کرنے پر میاں بیوی میں جھگڑا بھی ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی تو طلاق تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔"
واقعی!" ان کی آنکھیں مزید کشادہ ہوگئیں۔ پھر وہ میری سے مخاطب ہوئے" میری! یہ بات بھی نوٹ کرلو۔"
ہم نے اپنی چائے کی پیالی ختم کی تو میری نے ایک اور پیالی بنا دی اور اس میں تین چار چینی کے ٹکڑے ڈال دیے۔ اس طرح جب تک ہم وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے' وہ دونوں باری باری ہماری پیالی میں چائے انڈیلتے رہے' یہاں تک کہ ان کے پاس تمام چینی ختم ہوگئی۔ جب انہوں نے ہمارے لئے چائے کی دسویں یا گیارھویں پیالی بنائی اور دیکھا کہ چینی ختم ہو چکی ہے تو چائے کا یہ سلسلہ ختم کر دیا اور ہم نے اطمینان کی سانس لی۔
جیکب کو ہم نے پاکستان اور ہندوستان کے بارے میں کافی معلومات فراہم کیں جو واقعی درست تھیں' مگر ہماری رسوم کے بارے میں بہت سی باتیں اس کے لئے حیران کن تھیں اور وہ دونوں باری باری کہتے۔ کیا واقعی؟ اور پھر میری ان کو نوٹ بک میں درج کر لیتی۔ جیکب صاحب نے ہمیں فوراً پیش کش کر دی کہ وہ امریکی جانب کے نیاگرا کے

بارے میں دستاویزی فلم بنانے والے ہیں اگر ہم پسند کریں تو ان کے ساتھ شریک ہو جائیں۔ ہم نے معذرت کرلی اور کہا کہ ہم فلم ساز ہیں' فیچر فلمیں بناتے ہیں۔ دستاویزی فلمیں نہیں بناتے۔
میری نے ہماری تائید کی اور کہا' جیکب! تمہاری عقل کہاں چلی گئی ہے۔ ایک فلم میکر سے تم دستاویزی فلمیں بنانے کی امید کر رہے ہو؟"
جیکب نے کہا "مگر ہنی! یہ فلم میکر ہونے کے باوجود ایک ریستوران چلا رہے ہیں کیا تم کسی فلم میکر سے ایسی توقع کر سکتی ہو؟"
میری نے کہا "وہ بالکل مختلف چیز ہے۔ ریستوان کا فلم سے کوئی تعلق نہیں ہے فلم میکر کوئی دوسرا کاروبار تو کر سکتا ہے مگر فیچر فلم چھوڑ کر دستاویزی فلمیں نہیں بنا سکتا۔"
ہم نے کہا "یہ بات نہیں ہے۔ دراصل دستاویزی فلم کی تکنیک بالکل علیحدہ ہوتی ہے' جس سے ہم واقف نہیں ہیں البتہ ٹی وی کے لئے ہم تفریحی فلمیں بنا سکتے ہیں۔"
جیکب نے کہا" تو پھر کینیڈا اس کام کے لئے بہت موزوں جگہ ہے۔ وہاں کی حکومت بھی آپ کے ساتھ تعاون کرے گی اور وہاں آپ اپنی زبان میں بھی ٹی وی فلمیں بنا سکتے ہیں۔"
پھر جیکب نے بتایا کہ وہ کینیڈا میں بھی دستاویزی فلمیں بناتا رہا ہے۔ کینیڈا کی فلم کارپوریشن کے بارے میں اس نے ہمیں بہت سی مفید باتیں بتائیں۔ ہم نے سوچا کہ دس بارہ چائے کی پیالیوں کے عوض یہ معلومات بری نہیں ہیں ابھی گفتگو جاری تھی کہ جیکب نے یکایک کلائی پر نظر ڈالی اور فقرہ نامکمل چھوڑ کر کھڑا ہو گیا "معاف کیجئے گا علی دراصل ہمارے تھیٹر جانے کا وقت ہو رہا ہے اس لئے اجازت چاہتا ہوں۔"
ہم نے کہا "اجازت تو ہمیں لینی چاہئے تھی۔"
کہنے لگے "بات تو ایک ہی ہے۔ بہر حال' آپ سے ملاقات بہت پُر لطف اور کار آمد رہی۔ مناسب ہوا تو دوبارہ ملاقات ہوگی۔ میں تو لاس اینجلس جانے والا ہوں۔ میری آپ سے رابطہ قائم کرے گی۔"
میری نے اپنے سنہرے بالوں والے سر کو زور زور سے جھٹک کر اس بات کی

تصدیق کر دی اور بہت گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "علی اطمینان رکھو۔ جیکب کے جاتے ہی میں تم سے ضرور ملوں گی۔ مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں معلوم کرنی ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے رازداری کے انداز میں ہمارا ہاتھ دبایا اور مسکرائی۔ خدا جانے اس کے دل میں کیا تھا مگر ہمارا دل ضرور دھڑکنے لگا۔

میری نے ہمارا ہاتھ چھوڑا تو جیکب ہمیں بازو سے پکڑ کر قریباً کھینچتا ہوا زینے کی طرف لے گیا اور وہیں کھڑے کھڑے "بائی۔ سی یو۔ ٹیک کیئر" کہہ کر دروازے سے باہر دھکیل دیا۔

دوسرے دن ہم کینیڈا کے سفارت خانے پہنچ گئے جو ہمارے ریستوران کے نزدیک ہی تھا۔ ویزا کی درخواستوں کے لئے دس بارہ افراد موجود تھے۔ سفارت خانے کی عمارت بہت شاندار تھی۔ ایک چھوٹی سی میز پر ویزا فارم رکھے ہوئے تھے جو سب نے پر کر دیے۔ ایک خوش لباس خاتون نے سارے فارم اکٹھے کرنے کے بعد ہم سب کو آرام سے بیٹھنے کا مشورہ دیا اور بتایا کہ سب کو باری باری بلایا جائے گا۔ ہماری باری چند منٹ بعد ہی آئی۔ ایک دراز قد ڈپلومیٹ نے ہمارے پاسپورٹ پر ایک نظر ڈالی۔ امریکہ میں ہمارے قیام کے بارے میں دریافت کیا اور پوچھا "آپ کب جانا چاہتے ہیں؟"

ہم نے کہا "ایک ہفتے بعد۔"

وہ بولے آپ آج شام کو ویزے لے جائیں۔"

ہمیں اس آسانی اور تیز رفتاری سے ویزے ملنے کی توقع نہیں تھی۔ کیوں کہ امریکا میں پاکستانیوں کو عام طور پر یہ مشورہ دیا جاتا تھا کہ آپ اپنے ملک سے ویزا لے کر آتے۔ شام کو ہم ویزے اور پاسپورٹ لے کر واپس آ گئے۔ ریستوران میں میری ہماری منتظر تھیں۔

"علی! میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ کوئی وقت مل سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں" ہم نے کہا "آئیں، ہم اس میز پر بیٹھ جاتے ہیں" ہم نے کافی کے لئے کہا اور ہمہ تن گوش ہو گئے۔

میری نے فوراً مطلب کی بات شروع کر دی۔ کہا "علی! میں چاہتی ہوں کہ اگر تم کینیڈا میں ٹیلی ویژن کے لئے نئی فلمیں بناؤ تو مجھے بھی اپنے ساتھ کام کرنے کا موقع دو۔"

ہم نے حیران ہو کر میری کو دیکھا "مگر جیکب ......"

"جیکب سے میرا کوئی مستقل معاہدہ نہیں ہے۔ یوں بھی میں اس سے تنگ آ چکی ہوں۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے اپنا پارٹنر بنائے گا مگر آج تک یہ وعدہ پورا نہیں ہوا۔ اس کی خاطر میں نے بہت سے شاندار مواقع بھی ہاتھ سے گنوا دیے۔ اگر میں اس کے ساتھ نہ لگ جاتی تو اب تک میری شادی ہو چکی ہوتی۔ میں نے کیریئر بنانے کی خاطر چارلس کو چھوڑ دیا۔ خیر' اس کی تو مجھے پروا نہیں مگر افسوس یہ ہے کہ اس نے مجھے نہ پیسے دیے اور نہ ہی کریڈٹ۔ محض پیار کے لالچ میں کوئی لڑکی کہاں تک وقت ضائع کر سکتی ہے۔ اب میں اس کے ساتھ کام نہیں کرنا چاہتی اور پھر اس کی بیوی بھی یورپ سے آنے والی ہے۔ اس کے بعد تو یہ ملاقاتوں سے بھی جائے گا۔"

ہم نے پوچھا "اس کی بیوی؟"

بولی "ہاں' وہ ایک کمرشل فلم بنانے کے لئے چارلس کے ساتھ یورپ گئی ہوئی ہے۔ ماڈلنگ کرتی ہے۔"

ہم اس عجیب و غریب تعلق کے بارے میں سوچنے لگے۔ چارلس کی شادی میری سے ہونے والی تھی مگر اسے جیکب نے ایسا جھانسا دیا کہ وہ شادی کی پیش کش ٹھکرا کر جیکب کے ساتھ کام کرنے لگی۔ ادھر جیکب کی بیوی چارلس کی کمرشل فلم میں کام کرنے کے لیئے اس کے ساتھ یورپ چلی گئی۔ کیا خوب۔

ہم نے مشورہ دیا "اب چارلس واپس آ رہا ہے تو تم اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ کیا اس کی شادی کسی اور سے ہو چکی ہے؟"

بولی "شادی تو نہیں ہوئی مگر اس نے فی الحال شادی کا پروگرام ملتوی کر دیا ہے۔ دراصل چارلس کوئی بھی کام منصوبہ بندی کے بغیر نہیں کرتا۔ اس کے ہر کام کا شیڈول بہت پہلے مرتب کر لیا جاتا ہے۔ اب وہ دوسرے کاموں میں مصروف ہونے کی وجہ سے آئندہ دو سال تک شادی نہیں کرے گا۔ اس کا شیڈول بہت ٹائٹ ہے۔ اچھا یہ بتاؤ! کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟"

ہم نے اس اچانک سوال سے بوکھلا کر کہا "ہاں' قریب قریب۔"

کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہو ہی گئی ہے' بلکہ کافی پرانی بھی ہو چکی ہے۔"

"تمہاری بیوی جیلس ٹائپ تو نہیں ہے جیسی بعض عورتیں تنگ دل ہوا کرتی ہیں؟"

ہم نے کہا "بالکل نہیں۔ وہ بیوی تو ہے مگر بیوی ٹائپ نہیں ہے۔"

وہ حیران ہو کر ہمارا منہ دیکھنے لگی۔

"بھئی مطلب یہ کہ بیویاں تو سبھی جیلس اور شک و شبہ کرنے والی ہوتی ہیں مگر ہماری بیوی ایسی نہیں ہے۔ وہ ہماری کسی بات پر شک نہیں کرتی کیوں کہ ہم اسے پہلے ہی بتا دیتے ہیں۔"

"تعجب ہے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تمہارے ملک میں بھی ایسی کشادہ دل بیویاں ہوتی ہیں۔ ٹھہرو' میں ذرا نوٹ کر لوں۔"

اس نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے نوٹ بک نکال کر اس میں یہ معلومات بھی درج کر لیں اور بولی "پھر تو میں اور تم مل کر کام کر سکتے ہیں۔ میں کینیڈا کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔ یقین کرو کہ میں تمہاری بہت سی مشکلیں آسان کر سکتی ہوں اور پھر اس کے ساتھ ساتھ میں تمہیں وہ تمام سہولتیں بھی فراہم کروں گی جو جیکب کو فراہم کرتی ہوں۔"

"مثلاً وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ میں تمہارے لئے اپنی ساری ڈیٹس خالی رکھا کروں گی پہلے تم اپنا شیڈول بتا دیا کرنا۔ اس کے مطابق میں دوسرے لوگوں کو ایڈجسٹ کر لیا کروں گی۔ کیوں' مناسب بات ہے نا؟"

ہم نے کہا "ہاں بہت مناسب بات ہے۔"

"بہت خوب" اس نے خوش ہو کر ہماری طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا "میری کل کی ڈیٹ بالکل خالی ہے۔ تم چاہو تو میں تمہارے نام کر دوں؟"

ہم پریشان ہو گئے "ارے نہیں بھئی۔"

"کیوں' کیا تمہیں اپنی مسز سے مشورہ کرنا ہو گا؟"

"نہیں نہیں۔ بات یہ ہے کہ ابھی تو ہم نے ٹی وی فلمیں بنانے کا کوئی پروگرام ہی نہیں بنایا ہے۔ ابھی تو ہم ابتدائی جائزہ لیں گے۔"

"تو اسے بھی ابتدائی جائزہ ہی سمجھ لو۔ ویسے میں تمہیں مجبور بھی نہیں کرنا

چاہتی۔ اطمینان سے سوچ لو۔ یہ میرا فون نمبر ہے۔ کل صبح تک فون کر دینا اور بس۔ تمہارا فون آنے کے بعد ہی میں کسی اور کو ایڈ جسٹ کروں گی۔"

"ٹھیک ہے" ہم سوچ میں پڑ گئے "دیکھو اگر صبح نو بجے تک ہمارا فون نہ آئے تو تم کسی اور کو ایڈ جسٹ کر لینا۔"

وہ ہنسنے لگی "اتنی جلدی میں تو ایڈ جسٹمنٹ مشکل ہو گی مگر خیر۔ میں پول کلب چلی جاؤں گی۔"

"یعنی سوئمنگ پول؟"

"ارے نہیں بھئی۔"

سوئمنگ پول کی بات نہیں کر رہی۔ تم پول کلب نہیں جانتے؟"

"نہیں۔"

"پول کلب میں بہت سی ممبر لڑکیاں اپنی خالی ڈیٹس کمپیوٹر میں ڈال دیتی ہیں۔ جن مردوں کی ڈیٹس عین وقت پر کینسل ہو جائیں' انہیں اچانک ڈیٹ کی ضرورت پڑ جائے تو وہ پول کلب سے رابطہ قائم کر لیتے ہیں۔ کافی کار آمد چیز ہے۔ چاہو تو تم بھی اپنا کارڈ بنوا لو۔"

ہم نے کہا "میری! شاید تم جانتی نہیں ہو کہ ہماری ڈیٹ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ اس لئے ہمیں یہ پرابلم درپیش نہیں ہوتی۔"

"اوہ!" وہ حیران ہو کر رہ گئی "یعنی تم اپنی بیوی کے ساتھ ڈیٹنگ کرتے ہو؟ کیا تمہارے ملک میں دوسرے لوگ بھی ایسا ہی کرتے ہیں؟"

"کم و بیش" ہم نے جواب دیا۔

"مائی گڈ نیس۔ یہ بات تو نوٹ کرنے والی ہے" اس نے فوراً اپنی نوٹ بک میں یہ معلومات بھی درج کر لیں۔ جاتے جاتے اس نے ایک بار پھر ہم سے کہا "علی! تمہارے ملک کے بارے میں تم نے جو کچھ بتایا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ کوئی کہانی لگتی ہے تمہارا ملک کتنا پرانا ہے؟"

ہم نے کہا "میرا خیال ہے کہ وہ ساری دنیا کے ساتھ ہی معرض وجود میں آیا تھا۔ تمہیں شاید معلوم ہو گا کہ ساری دنیا ایک ہی بار وجود میں آ گئی تھی' قسطوں میں نہیں۔"

"پھر تو اور بھی زیادہ حیرت کی بات ہے۔ اچھا بئی۔ سی یو" وہ تیزی سے غائب ہو گئی۔

دوسرے دن سے ہم نے کینیڈا جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ہمیں کار کے ذریعے جانا تھا اور ٹورنٹو تک پہنچنے کے لئے راستہ معلوم کرنا تھا۔

"یہ کیا مشکل کام ہے بھائی صاحب! امریکا اور کینیڈا میں راستہ یاد رکھنا بہت آسان ہے۔ بس واشنگٹن ڈی سی سے نکلو گے تو فلاں نمبر کا ایگزٹ لے لو۔ اس کے بعد تمہیں وٹ فلاں مل جائے گا" یہ اکمل علیمی صاحب تھے جنہوں نے دو منٹ کے اندر سڑکوں اور راستوں کے نام اور اعداد و شمار بتا کر مسئلہ حل کر دیا اور منٹوں میں ٹورنٹو پہنچا دیا۔ اب مشکل یہ کہ ہم حساب کتاب میں ہمیشہ سے بہت کمزور ہیں۔ اتنے بہت سے نمبر تو ایک ساتھ یاد رکھنا بالکل ہی ناممکن تھا' چنانچہ ہم نے ان سے درخواست کی کہ وہ ہمیں ذرا اطمینان سے تمام راستوں کے نمبر وغیرہ لکھوا دیں۔ اکمل علیمی صاحب بذات خود ایک انسانی کمپیوٹر واقع ہوئے ہیں۔ ان کی اس خوبی کا علم ہمیں امریکہ پہنچنے کے بعد ہوا۔ جن دنوں وہ لاہور میں ہمارے ساتھ صحافی تھے تو نرے صحافی ہی تھے۔ ان کی اس خوبی کا کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ خداداد ذہانت کے ساتھ ساتھ قابل رشک قوت حافظہ کے بھی مالک ہیں۔ وہ وائس آف امریکا کی اردو سروس میں سالہا سال سے کام کر رہے ہیں۔ واشنگٹن اور ورجینیا میں تو وہ رہتے ہیں مگر سارے امریکا اور کینیڈا کی خاک چھان چکے ہیں' بلکہ اکثر چھانتے رہتے ہیں۔ انہیں ایک چھوٹی سی انسائیکلو پیڈیا کہنا مناسب ہو گا۔ امریکا کے بارے میں کوئی بات ایسی نہیں جس کا جواب ان کے پاس نہ ہو۔ پتا نہیں اتنے سال تک انہوں نے اتنی بہت سی معلومات اکٹھی کیں اور ازبریاد بھی کیں تو وہ وائس آف امریکا کی ڈیوٹی کس وقت دیا کرتے تھے؟

اکمل علیمی صاحب نے ہمیں زبانی تمام راستے' سڑکوں کے نمبر' ان کے فاصلے' اور کس کس جگہ جھیل' پل' ریلوے' پہاڑ' دریا وغیرہ سے واسطہ پڑتا تھا وہ سب لکھوا دیے۔ ہم نے دو چار بار لکھنے میں غلطی کر ڈالی مگر اس اللہ کے بندے نے بتانے میں ایک بار بھی غلطی نہیں کی۔ اس طرح ہمارے پاس ایک اچھی خاصی نوٹ بک تیار ہو گئی۔ انہوں نے اس کی ضخامت دیکھی تو مسکرائے اور کہنے لگے "اتنی ...

نہیں کہ آپ یہ سب زبانی یاد کر لیں؟"

ہم نے کہا "یہ طوطے کی طرح رٹنا اور یاد کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے اور نہ ہی ہمارا حافظہ اتنا اچھا ہے۔ اب آپ احتیاطاً ہمیں یہاں سے وہاں تک کا ایک نقشہ بھی فراہم کر دیں۔"

انہوں نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا "کیا اس کے بعد بھی آپ کو نقشے کی حاجت ہے؟"

ہم نے کہا "احتیاط کا تقاضہ یہی ہے۔ ہمیں اپنی یادداشت سے زیادہ چھپے ہوئے نقشے پر بھروسا ہے۔"

انہوں نے ہمیں راستوں کا ایک نقشہ بھی میز کی دراز میں سے نکال کر دیا۔ خدا جانے اتنی بہت سی چیزیں ان کے پاس کہاں سے آجاتی ہیں۔ جس چیز کی ضرورت ہو وہ اپنی دراز میں سے نکال کر پکڑا دیتے ہیں گویا دراز نہ ہو' عمرو عیار کی زنبیل ہو۔

راستے کے نوٹس اور نقشہ حاصل کرنے کے بعد ہمارا اعتماد کافی حد تک بحال ہو گیا تھا۔ ان ہتھیاروں سے مسلح ہونے کے بعد ہم اپنے گھر پہنچے۔ لبنیٰ اور بچیوں کو یہ خوش خبری سنائی کہ کل صبح ہم ٹورنٹو کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ "پاپا۔ کیا ٹکٹ لے لئے ہیں آپ نے؟" نادیہ نے سوال کیا۔

"کس چیز کے؟"

"ہوائی جہاز کے۔"

"ارے بھئی ہم اپنی کار میں جائیں گے۔"

نادیہ حیران رہ گئی "امریکا سے کینیڈا ہم اپنی کار میں جائیں گے۔ اتنی دور؟"

"تو پھر کیا ہوا؟"

"پاپا! پتا بھی ہے آپ کو۔ اکمل علیمی انکل کہہ رہے تھے کہ اینین ڈیل سے ٹورنٹو چھ سو میل سے بھی زیادہ دور ہے۔"

"ہاں ہاں پتا ہے۔ اسی لئے ہم صبح نو بجے نکل جائیں گے۔"

"تو پھر کتنے دن میں وہاں پہنچیں گے؟" اس بار پارو نے بھولپن سے پوچھا۔

ہم نے انہیں سمجھایا کہ یہ بہت اچھا' آسان اور پُر لطف سفر ہے۔ ہم شام تک ٹورنٹو میں ہوں گے۔ راستے میں کھانے پینے کے لئے بھی رکیں گے مگر ان دونوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ہم امریکا سے کینیڈا محض ایک دن میں کیسے پہنچ جائیں گے اور وہ بھی بذریعہ کار؟

اب پیکنگ شروع ہو گئی۔ ہم دو دن کے لئے بھی کہیں جاتے ہیں تو کم از کم دو ہفتے کا سامان ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ وہ جو شاعر نے کہا ہے کہ

سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

یہ ہمارے ہی بارے میں کہا ہے۔ آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جب دو چار ہفتے کے لئے جاتے ہوں گے تو کتنا سامان ہمراہ رکھتے ہوں گے؟ اور پھر اس بار تو ہم چار نفر تھے۔ یعنی ایک ہم' ایک ہماری بیگم اور دو بچیاں۔ ہم نے دیکھا کہ ہمارے کپڑے تو سوٹ کیس کے ایک کونے میں سمیٹ دیے گئے اور باقی دو سوٹ کیس ان تینوں کے کپڑوں وغیرہ سے بھر گئے۔

"بھئی یہ کیا ناانصافی ہے؟" ہم نے احتجاج کیا۔

لبنیٰ نے کہا "آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ عورتوں اور بچوں کا سامان ہمیشہ مردوں سے زیادہ ہوتا ہے۔"

بہر حال' پیکنگ بھی ہو گئی۔ اس زمانے میں ہم لوگوں نے اتنی دور دور کے اتنے بہت سے اور اتنے زیادہ سفر کئے تھے کہ پیکنگ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہ گئی تھی۔ دراصل پیکنگ کی ہمیں پریکٹس ہو گئی تھی اور عادت سی پڑ گئی تھی۔ اس لئے تھوڑی ہی دیر میں پیکنگ مکمل اور سوٹ کیس تیار ہو گئے۔ لبنیٰ کا اصرار تھا کہ ہم زیادہ سامان اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے چنانچہ دو بہت بڑے بڑے سوٹ کیسوں پر اکتفا کر لیا گیا' مگر اس کے بعد بھی انہوں نے مختلف بیگ بھرنے شروع کر دیے۔

"بھئی یہ کیا ہے؟"

"اس میں جوتے ہیں' دوسرے میں سینڈل ہیں' تیسرے میں آپ کے جوتے ہیں' چوتھے میں پارو کی گڑیاں اور کھلونے ہیں' پانچویں بیگ میں دوائیاں ہیں۔ چھٹے......."

"بس بس' سمجھ گئے۔" ہم نے فوراً ہینڈز اپ کر دیے اس طرح دو جہازی سائز کے سوٹ کیسوں اور درجن بھر مختلف سائز کے بیگوں کے "مختصر" سے سامان کے ساتھ

ہم اگلے دن عازم ٹورنٹو ہو گئے۔

کار میں سوار ہوئے تو پورے نو بج رہے تھے۔ ارادہ تو سویرے چھ بجے نکلنے کا تھا مگر ناشتا کرنے میں دیر لگ گئی۔ پھر ہر شخص کو کچھ ضروری سامان پیک کرنا یاد نہیں رہا تھا اس لئے بار بار سوٹ کیس اور بیگ کھولے اور بند کئے گئے۔ چند بار نیا سامان رکھنے کے لئے اور کئی بار یہ دیکھنے کے لئے کہ کون کون سا سامان رکھ لیا گیا ہے۔ کون کہتا ہے کہ سفر کرنا آسان ہے؟

لبنیٰ نے گھر سے نکل کر ایک اسٹور کا رخ کیا "بھئی کس لئے؟"

"بس ذرا دیر ادھر سے ہو لیجئے۔ کچھ کھانے کا سامان خرید لیں۔ بچیوں اور آپ کے لئے۔"

ہم نے کہا "یہ امریکا ہے اور جہاں ہم جا رہے ہیں وہ کینیڈا ہے۔ دونوں ترقی یافتہ ملک ہیں۔ راستے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہر قسم کا سامان مل جاتا ہے۔ جگہ جگہ شہر اور قصبے ہیں۔ ہر طرف دکانیں موجود ہیں سوئی سے ہوائی جہاز تک ہر چیز راستے کی دکانوں سے مل سکتی ہے۔ پھر یہ کھانے کا سامان لینے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم کوئی جنگل بیابان یا ریگستان میں تو سفر پر نہیں جا رہے ہیں؟"

"ٹھیک ہے، مگر تھوڑی دیر کے لئے وہاں رک جائیں تو کیا حرج ہے؟" یہ عورتوں کی پرانی منطق ہے جس کے آگے کوئی نہیں جیت سکتا۔

کے مارٹ سے انہوں نے کچھ خریداری کی۔ کھانے پینے کا سامان، فروٹ کے ڈبے، چٹ پٹی چیزیں، کوکا کولا، پھلوں کے رس کے ڈبے، نمکین، میٹھے بسکٹ، چاکلیٹ اور نہ جانے کیا کیا۔ اس طرح دو تین کاغذ کے بڑے بیگ بھی سامان میں شامل ہو گئے۔ اب باقاعدہ سفر کا آغاز ہوا۔ بچیوں نے کار کی پچھلی سیٹوں کو بچھا کر وہاں تکئے لگا لئے تھے اور گڑیوں اور دوسرے کھلونوں کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ ہم واشنگٹن تک تو اپنے روز مرہ کے راستے پر گئے۔ اس کے بعد ریاست میری لینڈ کا راستہ بھی دیکھا بھالا تھا۔ بس سڑکوں کے نمبر دیکھتے جاؤ اور چلتے رہو۔ منزل مقصود پر پہنچ جاؤ گے۔

قریباً دس ساڑھے دس بجے ہم نے دریائے پوٹامک کا پل کراس کیا اور ہمیں بھوک لگنی شروع ہو گئی۔ پچھلی جانب بچیاں بھی بھوک سے بلبلا رہی تھیں۔ لہٰذا کھانے کے سامان والے بیگ کھولے گئے اور خورد و نوش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہم نے بھی ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ کھانا پینا شروع کر دیا۔ نقشہ ہمارے سامنے کھلا ہوا تھا۔ اس میں دیکھتے جاتے تھے کبھی کافی، کبھی چائے کبھی جوس سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ بچیوں کو ڈانٹنے اور لبنیٰ سے باتیں کرنے کا سلسلہ بھی جاری تھا اور ہم ریاست میری لینڈ میں کشادہ ہائی وے پر نہایت روانی کے ساتھ جا رہے تھے۔ ماحول خوش گوار، گرد و پیش خوش منظر، سڑک انتہائی ہموار اور نفیس، ہمراہی باتونی اور شریر۔ کھانے پینے کا سامان لذیذ اور وافر مقدار میں موجود۔ ایسے میں گاڑی کی رفتار کا دھیان کسے رہتا ہے؟ ہمارے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ ہم جس ایکسپریس وے پر جا رہے تھے، اس پر زیادہ آمد و رفت نہیں تھی۔ پھر سفر بھی دلکش تھا۔ اس لئے رفتار کی حد کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا۔ ایک بار باتیں کرتے کرتے اور کھاتے پیتے ہم نے بیک ویو مرر پر نظر ڈالی تو پیچھے بہت دور سے ایک کار نظر آئی۔ کچھ دیر بعد پھر وہی کار نظر آئی۔ جب تیسری بار بھی وہی کار ذرا نزدیک نظر آئی اور اس کی چھت پر نصب سرخ روشنیاں بھی دائروں کی شکل میں گھومتی نظر آئیں تو ہم سمجھ گئے ہو نہ ہو یہ پولیس کار ہے۔ اسپیڈ دیکھی تو ایک سو دس میل سے بھی زیادہ تھی حالاں کہ وہاں رفتار کی حد ۸۰ کلو میٹر تھی۔ ہم نے آہستہ آہستہ اپنی رفتار کم کرنی شروع کر دی تو پولیس والے نے بھی اپنی رفتار بڑھانی شروع کر دی۔ چند لمحے میں وہ ہمارے برابر والی لین میں تھا اور ہمیں اشارے کر رہا تھا کہ ایک طرف شولڈر پر گاڑی کھڑی کر دو۔ ہم نے فوراً تعمیل کی۔

ہوا۔ اس کے برابر کی سیٹ پر ایک اس سے زیادہ لمبی چوڑی پولیس والی تشریف فرما تھیں۔ انہوں نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے گھورنے پر اکتفا کی۔

"گڈ مارننگ سر" پولیس مین نے پاس آکر مسکراتے ہوئے کہا۔

"گڈ مارننگ" ہم نے جواب دیا۔

"کتنا اچھا اور چمک دار دن ہے۔"

"واقعی" ہم نے کہا اور سوچا کہ شاید کوئی شاعر مزاج سپاہی ہے اور اس موضوع پر کچھ دیر بات چیت کرنے کا خواہش مند ہے۔

"معاف کیجئے گا" اس نے اور زیادہ مسکراتے ہوئے دانت نکال دیے "کیا میں آپ کا لائسنس دیکھ سکتا ہوں جناب؟" گویا ساری خوش اخلاقی کاروباری ہی تھی۔

"کیوں نہیں، بڑے شوق سے" ہم نے لائسنس اس کے حوالے کر دیا۔ پیچھے سے نادیہ نے گردن نکال کر پوچھا "پاپا! کیا آپ کا چالان ہو جائے گا؟"

"ہو سکتا ہے۔"

"تو کیا ہم ٹورنٹو نہیں جا سکیں گے؟"

"کیوں نہیں جا سکیں گے۔ بالکل جائیں گے۔"

اس اثنا میں دیو قامت پولیس والا ہر چیز کا جائزہ لے چکا تھا۔ قدرے سنجیدگی سے کہنے لگا "سر آپ کافی تیز گاڑی چلا رہے تھے۔"

ہم نے کہا "ہاں۔ تھوڑی سی رفتار بڑھ گئی تھی۔"

"تھوڑی سی نہیں، بہت زیادہ میں کئی میل سے آپ کا پیچھا کرتا آ رہا ہوں۔ آپ نے ایک نہیں، کئی قوانین کی خلاف ورزی کی ہے۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً آپ کی رفتار بہت زیادہ تھی۔ پھر آپ ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ کھانے پینے میں بھی مصروف تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کچھ مطالعہ بھی کر رہے تھے۔"

"ارے ہم تو نقشہ دیکھ رہے تھے۔"

"اسی کو مطالعہ کرنا کہتے ہیں جناب" اس نے جیب سے چالان والی کتاب نکالی اور اس پر لکھنے لگا "آپ کو پچاس ڈالر کا ٹکٹ دے رہا ہوں۔"

اف پچاس ڈالر! خدایا۔ یہ تو کافی رقم ہے ہم نے سوچا پھر اس سے کہا "مگر تاریخ ذرا لمبی ڈالئے گا۔ کیوں کہ ہم کینیڈا جا رہے ہیں۔ کم سے کم دو ماہ بعد آئیں گے۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں ڈھائی ماہ کی مہلت دے رہا ہوں" اس نے ٹکٹ کاٹ کر ہمارے حوالے کر دیا۔ پھر مسکرا کر ٹوپی کو ہاتھ لگایا "خوش گوار اور اچھے سفر سے لطف اندوز ہوں۔" یہ دعا دے کر وہ رخصت ہو گیا۔

پارو نے کہا "پچاس ڈالر؟ اس میں تو چار باربی ڈولز اور ان کے کپڑے آ سکتے ہیں مگر آپ ہمیں کچھ نہیں دلاتے۔ بس چالان کرا لیتے ہیں۔"

ابھی ہم امریکی سرحد ہی میں تھے کہ کھانے پینے کا سامان ختم ہو گیا۔ راستے میں کئی سربراہ ریستوران نظر آئے تھے۔ بچوں کی فرمائش تھی کہ وہاں چل کر آئس کریم کھائیں گے۔ ہم کافی پینے کے خواہش مند تھے۔

"اتنی تو پی ہے۔ لبنیٰ نے یاد دلایا۔

"بھئی تھک گئے ہیں بیٹھے بیٹھے۔ ذرا ٹانگیں سیدھی کر لیں گے۔"

چنانچہ ایک "جان سنز" کے سرراہ ریستوران کے آگے ہم نے کار روک دی۔ یہ لب سڑک ریستوران تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہیں اور انتہائی آرام دہ، خوب صورت اور دلکش ہیں۔ یہاں ضروری سامان اور ادویات بھی دستیاب ہو جاتی ہیں۔ بہت اچھا روشن اور رنگین ماحول ہوتا ہے۔ بچے کھیل رہے ہیں۔ لڑکیاں اٹکھیلیاں کر رہی ہیں۔ بوڑھے مٹر گشت کر رہے ہیں۔ خوب صورت اور نو خیز ویٹرس لڑکیاں نظر فریب یونیفارم میں ملبوس رنگین تتلیوں کی طرح ادھر سے ادھر رواں دواں ہیں۔ پھر کھانے پینے کا سامان بھی مناسب داموں پر مل جاتا ہے۔ اچھی خاصی تفریح کی جگہ ہوتی ہے۔ نادیہ اور پارو نے آئس کریم کھائی مزید چاکلیٹ خریدے، اسنیکس لئے اور لبنیٰ نے اپنے مطلب کی کچھ چیزیں ایک اسٹور سے خریدیں۔ ان ریستوران میں بھی ریلوے اسٹیشنوں یا ایئرپورٹس کا سا سماں ہوتا ہے کیونکہ آنے جانے والے بھی مسافر ہوتے ہیں مگر سفر کی کلفتوں سے نا آشنا۔ سفر اور وہ بھی بذریعے کار طویل سفر امریکا اور کینیڈا میں ایک پُر لطف، دلکش اور دلچسپ تجربہ ہے۔ یعنی ہمارے بالکل برعکس معاملہ ہے۔ وہاں لمبا سفر کرنا بذاتِ خود ایک

تفریح ہے اور ہمارے ہاں عذاب۔ ویسے دیکھا جائے تو ہمارے ہاں تو زندگی ہی ایک مسلسل عذاب بن کر رہ گئی ہے۔ ہمارے بہت سے دوست یہ کہہ کر دل کو تسلی دیتے ہیں کہ ان گوروں نے اس عارضی دنیا میں جنت کے مزے چکھ لئے ہیں مگر آخرت میں عذاب ان کے حصے میں آئے گا اور ہمارے لئے دائمی راحت اور جنت ہو گی۔

دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

دوپہر کے قریب امریکی سرحد ختم ہو گئی اور ہم کینیڈا کے دروازے پر پہنچ گئے۔ امریکا اور کینیڈا کے شہریوں کے لئے آمد و رفت پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ بس کارڈ دکھایئے اور سرحد عبور کر لیجئے مگر ہمارے پاس پاکستانی پاسپورٹ تھا اس لئے ایک ایگزٹ (اخراج) پر پہنچ کر ہم کو رکنا پڑا امیگریشن کا علاقہ نہایت صاف ستھرا اور خوب صورت تھا۔ دفتر کی عمارت بھی شاندار۔ ہم نے کار ایک طرف پارک کی اور دفتر میں داخل ہو گئے۔ ایک نوجوان خاتون مسکراتی ہوئی ہماری طرف بڑھیں۔ لگتا تھا جیسے ہمارے ہی انتظار میں وہاں بیٹھی ہوئی تھیں "گڈ ڈے سر"

ہم نے بھی انہیں معقول جواب دیا اور اپنے پاسپورٹ سامنے رکھ دیئے۔ وہ سمجھ گئیں کہ باقی لوگ باہر ہیں۔ انہوں نے بڑی محبت سے پاسپورٹ دیکھنا شروع کئے۔ کبھی کبھی نظریں اٹھا کر ہمیں بھی مسکرا کر دیکھ لیا کرتی تھیں۔ یکایک ان کی نظر ہمارے پیشے والے خانے پر پڑی تو وہ چونک پڑیں "اوہ کیا آپ فلم ساز ہیں؟"

ہم نے سرہلا کر اقرارِ جرم کیا۔

"آپ یہاں فلم بنانے آئے ہیں؟"

ہم نے بتایا کہ فی الحال تو ہم گھومنے پھرنے آئے ہیں۔ لوکیشنز وغیرہ بھی دیکھیں گے اور جی چاہا تو فلم بھی بنالیں گے۔ انہوں نے پاسپورٹ پر تو مہریں لگا دیں مگر ہمیں گھیر کر بیٹھ گئیں۔ پہلے تو ہمارے ملک کی فلموں کی بات چھیڑ دی ہم نے کہا کہ ہماری فلمیں بھی ویسی ہی ہوتی ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان بھی انڈیا ہی کی ایک ریاست ہے۔ ہم نے انہیں اصل صورت حال بتائی اور شرمندہ کرنے کی کوشش بھی کی۔ وہ بولیں "معافی چاہتی ہوں۔ دراصل میں جغرافیہ میں بہت کمزور ہوں۔"

ہم نے کہا "مگر یہ تو تاریخ کا معاملہ ہے"

"یقین کیجئے، تاریخ میں تو میں اور بھی زیادہ گئی گزری ہوں پچھلی تاریخ تو کیا مجھے تو روزانہ کی تاریخ تک یاد نہیں رہتی۔ بار بار گھڑی میں تاریخ اور دن دیکھتی ہوں۔ اس لئے آپ درگزر فرمائیں۔"

ہم نے بھی فراخ دلی سے کام لیا۔ ایک خوش انداز خاتون اس قدر عاجزی سے بات کرے تو آپ کیا کریں گے؟ ظاہر ہے وہی جو ہم نے کیا۔ یعنی انہیں معاف کر دیا اور مختصراً ہندوستان اور پاکستان کے بارے میں بتایا۔ وہ بے صبری سے سرہلاتی رہیں "او کے۔ او کے یہ تو تصفیہ ہو گیا کہ پاکستان ایک الگ ملک ہے۔ اب آپ یہ بتایئے کہ آپ لوگ صرف میوزیکل فلمیں ہی کیوں بناتے ہیں؟"

ہم نے کہا "ہم لوگ صرف میوزیکل فلمیں نہیں بناتے۔"

"تو پھر فلم میں ناچ گانا کیوں ہوتا ہے یا پھر مار کٹائی ہوتی ہے اور آپ کی فلموں میں عورتوں کی اتنی تذلیل کیوں کی جاتی ہے؟"

"وہ کیسے؟"

"ہر فلم میں ہیروئن ہی ہیرو کے آگے پیچھے گاتی پھرتی ہے اور ہیرو اگر گاتا بھی ہے تو ہیروئن کو پکڑنے کے لئے دوڑتا رہتا ہے اور وہ بے چاری بھاگ بھاگ کر تھک جاتی ہے۔ کیا آپ لوگوں کے ملکوں میں خواتین کی کوئی انجمن نہیں ہوتی؟"

ہم نے کہا "انجمنیں تو درجنوں ہیں اور لیڈر قسم کی خواتین کی بھی کمی نہیں ہے مگر ہماری عورتیں پسند کرتی ہیں کہ مردوں کی خوشامد کریں۔ ان کے آگے پیچھے پھریں یا پھر مرد انہیں پکڑنے کے لئے ان کے پیچھے دوڑتے رہیں۔"

"حیرت انگیز!" وہ تعجب سے بولیں۔ "آپ نے کوئی کینیڈین فلم دیکھی ہے؟"

انہوں نے بات بدل دی۔ دراصل ہمارے سوا دفتر میں کوئی اور مسافر بھی نہیں تھا اس لئے وہ فرصت میں تھیں اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا فلم کا موضوع ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ انہوں نے کالج میں فلم کا مضمون بھی پڑھا تھا مگر عملی طور پر کوئی موقع نہیں ملا تو امیگریشن میں ملازم ہو گئیں۔

ہم نے کہا "بدقسمتی سے ہم نے آپ کے ملک کی کوئی فلم نہیں دیکھی۔"

"آپ یقین کیجئے کہ ہمارے ملک میں ذہین، قابل اور باصلاحیت افراد کی کمی نہیں

ہے مگر یہ امریکا، ان سے خدا سمجھے" وہ اپنے موتیوں جیسے دانت پیسنے لگیں۔ ہم بہت خوش ہوئے کہ چلو یہ بھی امریکا کی مخالف نکلیں۔

"امریکیوں نے کیا قصور کر دیا ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں آپ کو۔ ہمارے ملک کی صنعت تو چھوٹی سی ہے۔ غیر معروف ہے۔ فن کار اور ہنر مند بھی گمنام ہیں۔ اب دیکھ لیجئے کہ آپ نے آج تک کوئی کینیڈین فلم نہیں دیکھی مگر بے شمار امریکی فلمیں دیکھی ہوں گی۔ بس جب یہاں کوئی اداکار، فلم ساز، مصنف، یا ہدایت کار ابھرتا ہے یہ کم بخت امریکی اسے زیادہ پیسے کا لالچ دے کر اڑا لے جاتے ہیں۔"

"مگر وہ کیوں چلے جاتے ہیں؟ کیا ان میں حب الوطنی کا جذبہ نہیں ہے؟"

"جنابِ والا! ایک طرف لاکھوں ڈالر اور عالم گیر شہرت ہو اور دوسری طرف صرف حب الوطنی، تو پھر کس کا پلڑا بھاری ہوگا؟" انہوں نے تلخی سے کہا اور ہالی وڈ کے درجنوں نام گنوا دیے جو کینیڈا سے گئے تھے ہمیں ابتدائی زمانے کی پاکستانی فلموں کا خیال آ گیا جب کراچی میں ابھرنے والا ہر فن کار اور ہنر مند نمایاں ہوتے ہی لاہور کا رخ کیا کرتا تھا اور کراچی والے انہیں روکتے رہ جاتے تھے، مگر شہرت اور دولت لاہور پہنچے بغیر نہیں مل سکتی تھی اس لئے وہ سب کے سب لاہور چلے گئے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔

"سر میں آپ کو ایک بات اور بتا دوں۔ یہ امریکی ہمیں اپنی نو آبادی سمجھتے ہیں۔ ہماری بڑی کمپنیاں خرید لیتے ہیں مگر کینیڈا والوں کو اپنی امریکی کمپنیاں نہیں خریدنے دیتے اپنی فیکٹریاں یہاں بنا دیتے ہیں مگر ہمیں امریکا میں کارخانے نہیں لگانے دیتے۔ ساری امریکی کاریں اب کینیڈا میں بن رہی ہیں۔ یہ ہم سے محکوموں اور غلاموں جیسا سلوک کرتے ہیں۔ ان سے خدا سمجھے گا۔" وہ خاصی ناراض اور بے زار معلوم ہو رہی تھیں۔

"آمین" ہم نے دل ہی دل میں کہا اور یہ سن کر خوش ہو گئے کہ امریکا کو کوئی برا بھلا کہے تو نہ جانے کیوں ہمیں اچھا لگتا ہے۔ شاید جیلسی کی وجہ سے؟ آپ اگر یہاں فلم بنائیں تو مجھے ضرور اطلاع دیجئے گا۔ یہ رہا میرا کارڈ اور پتا میں چار ہفتے کی چھٹی لے کر آپ کے ساتھ بلا معاوضہ کام کروں گی۔" ہم نے ان کے سراپا پر تنقیدی نگاہ ڈالی۔ خاصی خوش شکل اور دلکش خاتون تھیں۔

وہ ہمارا مقصد سمجھ گئیں بولیں "میں اداکاری کے لئے نہیں کہہ رہی۔ میں تو آپ کی اسسٹنٹ بن کر کام کروں گی۔" ہم نے سوچا کہ ایسی دلفریب اسسٹنٹ ہو تو فلم تو خواہ مخواہ اچھی بنے گی۔ یہ بعد میں سوچنے کی بات تھی کہ وہ کس معاملے میں ہماری اسسٹنٹ ہوں گی۔ وہ شاید کچھ دیر تک اور امریکا کے خلاف اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتیں مگر اسی اثنا میں ایک بھارتی خاندان اندر داخل ہوا یہ صاحب خاصے معقول آدمی تھے مگر ان کے بیوی اور بچے اتنے ہی نامعقول نکلے۔ اندر داخل ہوتے ہی بچوں نے میز کے پاس کھڑے ہو کر اچھلنا شروع کر دیا اور بیگم نے منہ بنا کر سامنے کھڑی گوری خوبصورت امیگریشن افسر کا معائنہ کیا اور پھر ایک تنقیدی نظر اپنے شوہر پر ڈالی جو میٹھی میٹھی نظروں سے امیگریشن والی خاتون کو دیکھ رہے تھے۔ مسز نے دیکھے بھالے بغیر اپنی موٹی سی کہنی اپنے دبلے پتلے شوہر کی پسلیوں پر ماری اور وہ لڑکھڑا گئے۔ غالباً انہیں اس کی پریکٹس ہوگی ورنہ عام حالات میں ان کی پسلیاں ٹوٹ جانا کوئی حیرت انگیز بات نہ ہوتی۔ انہوں نے بیوی کی خون خوار نظروں کو دیکھتے ہی گجراتی یا تامل زبان میں غالباً معذرت پیش کی اور اپنے پاسپورٹ لے کر خاتون کے نزدیک پہنچ گئے۔ اتنی دیر میں ان کا ایک تین سالہ کالا کلوٹا بچہ اچھل کر میز پر چڑھ چکا تھا اور وہاں رکھی ہوئی چیزوں کو سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مس امیگریشن نے ہماری جانب دیکھا اور دبی زبان میں پوچھا "کیا یہ بھی پاکستانی ہیں؟"

ہم نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ یہ انڈین ہیں۔" اور ان کو خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو لئے۔ باہر کار میں ہماری بیگم اپنی مخصوص بے نیازی کے ساتھ میگزین پڑھنے میں مصروف تھیں اور بچیاں پچھلی سیٹ پر سو چکی تھیں۔

"بہت دیر لگا دی آپ نے؟" انہوں نے پوچھا۔

"ہاں دراصل فلم سازی کے بارے میں بات چیت ہو رہی تھی۔"

"گویا آپ نے کینیڈا کی سرحد میں داخل ہوتے ہی فلم کی شوٹنگ شروع کر دی ہے؟"

ہم نے کار اسٹارٹ کی اور مختصر طور پر انہیں روداد سنائی۔

"میں تو سمجھی تھی کہ شاید انہوں نے داخلے کی اجازت ہی نہیں دی اور آپ ان سے لڑائی جھگڑا کر رہے ہیں۔"

اب ہم کینیڈا کی سرزمین پر تھے مگر ہمیں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔ نہ گردوپیش کے مناظر میں' نہ سڑکوں میں نہ ماحول میں۔ ہائی وے بھی اس طرح کی تھی۔ ہاں ایک فرق یہ دیکھنے میں آیا کہ کچھ فاصلے کے بعد جب ہم کسی قصبے یا شہر کے نزدیک سے گزرتے تو ایک تختی پر اس شہر کا نام اور آبادی لکھی ہوئی نظر آ جاتی۔ جب بہت سی تختیاں دیکھ چکے تو ہمیں اندازہ ہوا کہ کینیڈا کے شہروں اور قصبوں کی آبادی تو بہت ہی کم ہے۔ کہیں گیارہ ہزار کہیں بیس ہزار۔ کہیں چالیس ہزار۔ نکلٹن شہر کا نام ہم نے بہت سن رکھا تھا۔ پاکستانی اداکارہ اور گلوکارہ مسرت نذیر بھی اس زمانے میں وہیں مقیم تھیں۔ اس شہر کی آبادی 56 ہزار تھی کوئی شہر سوا دو ہزار کی آبادی والا تھا تو کوئی ایک سو چالیس شہریوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھا۔ یہ شہر کیونکہ قدرے ہائی وے سے ہٹ کر تھے اس لئے بعض اوقات ان کی بلند و بالا عمارتیں بھی نظر آ جاتی تھیں اور حیران کر دیتی تھیں مثلاً ایک لاکھ سولہ ہزار کی آبادی کے شہر میں اگر آپ کو بلند اور ماڈرن عمارتوں کی قطاریں نظر آئیں تو یوں لگے جیسے کوئی بہت بڑا شہر ہے تو آپ کیا سوچیں گے؟ چھوٹے چھوٹے شہروں میں بھی ہائی رائز عمارتیں فخر سے سر اٹھائے کھڑی ہیں' جب کہ ہمارے ایک دو شہروں کو چھوڑ کر بہت بڑے بڑے شہروں تک میں ڈھنگ کی عمارتیں دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ ہمارے ہاں نجی رہائش گاہیں البتہ بہت شاندار ہوتی ہیں مگر ان کی چار دیواری کے باہر گندگی اور ملبے کا ڈھیر لگا نظر آتا ہے۔ شہروں کو ڈسٹ بن بنانے کا فن تو کوئی ہم پاکستانیوں سے سیکھے۔

ہمیں ورجینیا میں اپنے گھر سے چلے ہوئے قریب قریب چھ گھنٹے ہو گئے تھے اور ابھی کافی لمبا سفر باقی تھا رات کو دیر سے سوئے تھے اور صبح بہت جلدی بیدار ہو گئے تھے اس لئے نیند آنے لگی تھی۔ کچھ دیر تو ہم نیند سے دست و گریباں رہے مگر جب آنکھیں بالکل ہی بند ہونے لگیں تو یہی مناسب جانا کہ کسی جگہ رک کر تھوڑی دیر سو لیا جائے۔ امریکا اور کینیڈا میں سڑکوں کے کنارے ایک پٹی اسی مقصد کے لئے بنائی جاتی ہے کہ اگر کار میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے یا ڈرائیور کو نیند آ جائے تو کار کو ہائی وے سے ہٹا کر اس پر کھڑا کر دیا جائے اور ڈرائیور کچھ دیر ستا کر تازہ دم ہو لے۔ اس سڑک کو شولڈر کہتے ہیں۔ جس کا ترجمہ ہے "کندھا"۔ اس نام کی معنویت ہمیں بہت پسند آئی۔ اردو میں محاورہ ہے کہ جب کوئی مشکل پیش آ جائے تو سہارے کے لئے کسی کندھے کی ضرورت پیش آتی ہے یا پھر آپ نے وہ محاورہ بھی سنا ہو گا کہ پرائے کاندھے پر رکھ کر بندوق چلائی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ "شولڈر" بھی بہت کام کی چیز ہے۔ ورنہ ہائی وے پر کار کھڑی کر دینا بذات خود ایک جرم ہے۔

پہلے تو ہم نے سوچا کہ شولڈر پر کار کھڑی کر کے کچھ دیر نیند لے لیں مگر پھر ایک جانب ایک قصبے کا بورڈ لگا ہوا نظر آیا۔ آبادی اس کی دو سو اڑتالیس نفوس کی تھی۔ قصبہ کیا اسے تو گاؤں ہی کہا جا سکتا ہے۔ ہم نے اگلے "اخراج" سے موڑ کاٹا اور قصبے کی جانب چل پڑے۔ نہایت کشادہ اور خوبصورت سڑک یکا یک دائیں جانب مڑ گئی اب جو دیکھا تو سامنے یہ قصبہ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کا نام تو ہمیں یاد نہیں رہا مگر خوبصورتی اور نفاست آج بھی آنکھوں میں بسی ہوئی ہے۔ قصبے کا نقشہ کچھ یوں تھا کہ ایک سو گز لمبی سڑک تھی جس کی دونوں جانب خوبصورت کھلونوں جیسے مکان بنے ہوئے تھے۔ اس سڑک پر دکانیں بھی تھیں جن میں روز مرہ کی ضرورت کا تمام سامان دستیاب تھا۔ ایک چھوٹی سی صاف ستھری دکان تھی جو ریستوران بھی تھا۔ اسی میں ایک جانب گیمز کی مشین بھی لگی ہوئی تھی۔ اخبارات اور میگزین کے علاوہ سگریٹ اور تمباکو بھی یہاں سے مل سکتا تھا۔ نہایت مختصر سی جگہ تھی مگر انتہائی صاف ستھری اور سلیقے سے سجی ہوئی۔ پارو نے ایک جانب رکھی ہوئی کون آئس کریم کی مشین بھی دریافت کر لی اور آئس کریم کی فرمائش کر دی۔ ریستوران کی مالکہ ایک پختہ عمر کی طرحدار خاتون تھیں۔ ریستوران میں کافی اور اسنیک وغیرہ فراہم کرتی تھیں۔ دکانداری بھی وہی کرتی تھیں۔ ہم نے قصبے کی اکلوتی سڑک پر ایک جانب اپنی گاڑی کھڑی کر دی تھی۔ پچھلی سیٹ پہلے ہی بستر بنی ہوئی تھی۔

لبنی اور بچیوں کو قصبے کی سیر کرنے کا مشورہ دے کر ہم پچھلی سیٹ پر لیٹ کر سو گئے۔ آنکھ کھلی تو نصف گھنٹا گزر چکا تھا اور بالکل تازہ دم ہو گئے تھے۔ دو تین گڑیا جیسی بچیاں کھڑکی میں سے جھانک کر ہمیں دیکھ رہی تھیں۔ ہمیں بیدار ہوتے ہوئے دیکھا تو ہنستی ہوئی بھاگ گئیں۔ ہم نے باہر نکل کر دیکھا تو لبنی اور بچیوں کا پتا نہیں تھا۔ اس چھوٹے بازار میں تو سوئی تک گم نہیں ہو سکتی تھی۔ چند لمحے بعد ایک دکان کے اندر مل گئیں۔ اس دکان کو چاکلیٹ، گروسری، مٹھائی، کراکری، تحائف اور ملبوسات فروخت کرنے کا مرکز سمجھ لیجئے، اتنی مختصر سی جگہ میں اتنی بہت سی چیزیں فروخت ہو رہی تھیں۔ اس قصبے کا واحد سپر اسٹور سمجھ لیجئے۔ ایک خوش مزاج بڑی بی سیلز گرل کے فرائض سرانجام دے رہی تھیں اور ان کی پھرتی دیکھنے کے قابل تھی۔ اتنے مختصر سے عرصے میں انہوں نے کئی اقسام کی چیزیں گاہکوں کے ہاتھ فروخت کر دی تھیں اور اگر ہم بروقت نہ پہنچ جاتے تو شاید اتنی ہی اشیا اور بیچنے میں کامیاب ہو جاتیں۔ ہم لوگ اس چھوٹی سی دکان سے لدے پھندے باہر نکلے "شہر" تو پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ اس اکلوتے بازار سے چند پتلی پتلی خوب صورت سڑکیں دائیں بائیں نکلتی تھیں مگر یہ سب کا سب رہائشی علاقہ تھا۔ پورے قصبے میں مکانوں کی تعداد سو کے لگ بھگ ہو گی مگر ایسے خوبصورت اور پھولوں سے لدے ہوئے گھر تھے کہ ان پر گڑیوں کے گھر کا گمان گزرتا تھا۔ بے حد سکون، دل فریب اور خوب صورت جگہ تھی۔ ان ملکوں میں گاؤں اور قصبے ایسے ہی حسین اور خوش منظر ہوتے ہیں اور یہاں زندگی کی تمام آسائشیں موجود ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں لوگ شہروں کے مقابلے میں نواحی قصبوں اور دیہات میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ جگہیں سستی بھی ہوتی ہیں اور شہر کی افراتفری اور بھاگ دوڑ سے محفوظ بھی ہوتی ہیں۔ مگر شہر والے بے چارے اپنے کاموں اور روزگار کی مصروفیات کے باعث دیہات میں نہیں رہ سکتے۔ البتہ موقع پا کر چھٹی کے کچھ دن وہاں ضرور گزار لیتے ہیں۔ واپسی میں ریستوران کے سامنے سے گزرے تو وہاں ویو کارڈ بھی رکھے ہوئے دیکھے۔ معلوم ہوا کہ ڈاک کے ٹکٹ بھی یہیں مل جاتے ہیں۔ وہیں سے ویو کارڈ خرید کر حوالہ ڈاک کر دیے اور سفر پر روانہ ہو گئے۔

کینیڈا کا راستہ اس قدر خوب صورت اور دل کش ہے کہ ان مناظر کو دیکھنے سے دل نہیں بھرتا۔ راستے میں ایک اور جگہ ٹھہر کر ہم نے کافی پی اور بچیوں نے تھوڑی بھاگ دوڑ کر کے اپنی بوریت دور کی۔ ہمیں لکھی ہوئی ہدایات اور نقشے کے مطابق ٹورنٹو پہنچنے کے لئے جو راستہ اختیار کرنا تھا وہ کچھ اس طرح تھا: کوئن الزبتھ وے پر سیدھے چلے جائیں، راہ میں نیاگرا آبشار آئے گا وہاں سے ہمیں گارڈن ایکسپریس وے پر سفر کرنا تھا۔ اس بڑی سڑک پر کافی دور چلنے کے بعد سی این ٹاور نظر آئے گا۔ سی این ٹاور کینیڈا نیشنل ٹاور کا مخفف ہے اور یہ ایک ایسی نشانی ہے جو ٹورنٹو کے گردو نواح میں بہت دور سے نظر آ جاتی ہے اور اگر آپ ٹورنٹو میں چند دن بھی قیام کریں تو بار بار اس کا تذکرہ سنیں گے اور لوگ مختلف مقامات کے بارے میں بیان کرتے ہوئے آپ کو سی این ٹاور کا حوالہ دیں گے۔ یہ ایک اونچا مینار ہے اور سیاحوں کے لئے ایک قابل دید مقام بھی۔ اس کے آس پاس بہت خوب صورت پارک ہے، نزدیک ہی ٹورنٹو لیک واقع ہے جو بذات خود ایک حسین منظر پیش کرتی ہے۔ ہم گارڈن ایکسپریس وے پر رواں دواں سی این ٹاور کا نظارہ کرتے ہوئے آگے بڑھے تو پل سے گزرنے کے بعد ہمیں یونگ اسٹریٹ کا ایگزٹ نظر آ گیا۔ ہمارے راہبر نے ہدایت کی تھی کہ آنکھیں بند کر کے بلا تامل اس اخراج کے راستے یونگ اسٹریٹ میں داخل ہو جانا اور بس سمجھ لینا کہ ٹورنٹو کے ڈاؤن ٹاؤن میں پہنچ گئے ہیں اور واقعی ہوا بھی یوں ہی۔ یونگ اسٹریٹ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ شاید دنیا کی طویل ترین سڑک ہے۔ جب ہم امریکہ میں تھے تو وہاں کی لی ہائی وے کے بارے میں بھی اسی قسم کی باتیں سنا کرتے تھے مگر فرق یہ ہے کہ وہ ایک ہائی وے ہے جب کہ یونگ اسٹریٹ شہر کے بیچوں بیچ سے گزرنے والی ایک سڑک ہے جو شیطان کی آنت کی طرح ٹورنٹو لیک سے شروع ہو کر خدا جانے کہاں تک چلی جاتی ہے۔ پتا نہیں یہ کہیں ختم بھی ہوتی ہے یا خلا میں پہنچ جاتی ہے۔ ہم نے اس سڑک پر بہت دور تک سفر کیا مگر اس کا آخری کنارہ تلاش نہیں کر پائے۔ پہلے ہم سمجھے کہ یہ شاید ینگ اسٹریٹ ہے مگر تختی دیکھی تو پتا چلا کہ یہ دراصل یونگ اسٹریٹ ہے اس کا مطلب تو ہمیں کوئی نہیں بتا سکتا مگر ٹورنٹو کے دوران قیام میں بار بار یونگ اسٹریٹ کا تذکرہ ضرور سننے میں آتا ہے۔ کافی دور تک تو یہ کمرشل علاقے پر مشتمل ہے۔ دفتروں کی عمارتیں، سینما گھر، شو روم، دکانیں، اسٹور، ورکشاپس، ریستوران، دیسی مٹھائی کی دکانیں اور نہ جانے کیا کیا چیزیں اس سڑک

پر واقع ہیں۔ بہت با رونق اور خوب صورت سڑک ہے۔ ایشیائی حضرات خصوصا سکھوں کی دکانیں بھی موجود ہیں جہاں مٹھائی' پراٹھا اور لسی سے لے کر پوری کچوری تک ہر چیز ملتی ہے۔ یونگ اسٹریٹ واقعی ایک عجوبہ ہے ہمیں اس یونگ اسٹریٹ پر کافی دور تک جانا تھا جس کے بعد قریبا ایک میل سفر کرنے کے بعد دائیں جانب الیگزینڈر اسٹریٹ کی تختی نظر آتی تھی۔ اس سڑک پر ایک بیس منزلہ سفید بلڈنگ میں نواب عبدالخالق صاحب کا دولت کدہ سب سے اونچی منزل پر واقع تھا۔ یہ اپارٹمنٹ تھا اسے مقامی اصطلاح میں پینٹ ہاؤس کہتے ہیں کیوں کہ یہ عمارت کی بالائی منزل پر ہوتا ہے اور عام فلیٹ کے مقابلے میں زیادہ کشادہ۔ آرام دہ اور بیش قیمت ہوتا ہے۔ نواب صاحب کے اس پینٹ ہاؤس میں ایک ڈرائنگ' ڈائننگ' ایک کشادہ ٹیرس' ایک کچن' چار بیڈ روم' اسٹور اور دو باتھ روم تھے جو مغربی ممالک میں عیاشی کے زمرے میں آتے ہیں۔ لطف کی بات یہ کہ نواب عبدالخالق یہاں بالکل اکیلے رہتے تھے۔

ہم نے جس وقت سفید ٹاور بلڈنگ کے سامنے اپنی کار کھڑی کی اس وقت رات کے ٹھیک آٹھ بج رہے تھے لیکن مغربی ملکوں کی طرح اندھیرا نہیں پھیلا تھا۔ اس بلند منزلہ اور وسیع و عریض عمارت کے زیریں حصے میں داخل ہونے کے لئے شیشے کا دروازہ تھا۔ ویسے بھی نیچے کے تمام حصے میں اینٹ اور سیمنٹ کی دیوار کے بجائے شیشے کی دیواریں تھیں جس کی وجہ سے اندر سے باہر کی اور باہر سے اندر کی تمام چیزیں نظر آتی تھیں۔ ہم نے نواب صاحب کے پینٹ ہاؤس کا نمبر دبا دیا اور انٹر کام پر ان کی آواز کا انتظار کرنے لگے۔

ان کی آواز آئی اور انہوں نے پوچھا "کون ہے؟"

ہم نے کہا "خالق صاحب ہم آئے ہیں۔"

"اوہ' حضور والا! آپ ہیں۔ میں دروازہ کھولتا ہوں آپ اندر داخل ہو کر لفٹ پر پہنچ جائیں۔" ایک کھٹکے جیسی آواز آئی اور موٹے شیشوں کا دروازہ کھل گیا۔ ہم لوگ اندر داخل ہوئے۔ بہت وسیع و عریض لاؤنج تھا۔ ماربل کا فرش' دیواروں پر تصویریں لگی ہوئی' جگہ جگہ خوشنما پودے اور صوفہ سیٹ رکھے ہوئے۔ یہ جگہ بلڈنگ کے تمام رہنے والوں کے استعمال کے لئے مخصوص تھی۔ وہ یہاں اپنی تقریبات بھی منعقد کرا سکتے ہیں۔ مہمانوں کو بٹھانے کے لئے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ پورا وسیع و عریض لاؤنج ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ ہم نے دور ہی سے لفٹ تلاش کی اور ابھی بٹن دبایا بھی نہ تھا کہ لفٹ کا دروازہ کھلا اور نواب عبدالخالق صاحب نمودار ہوئے۔ انہوں نے گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ گھڑی دیکھی اور کہا "ٹھیک ہے۔ آپ کھانے کے وقت پہنچ گئے ہیں۔"

اوپر جانے سے پہلے وہ اور ہم دوبارہ باہر نکلے اپنی کار کو عمارت کے تہ خانے والے کار پارکنگ میں پہنچایا۔ سامان نکالا اور تہ خانے کے اندر ہی لگی ہوئی لفٹ میں سوار ہو کر سب سے اوپر کی منزل پر پہنچ گئے۔ نواب صاحب کا مکان اگرچہ خاتون خانہ کی موجودگی سے محروم تھا مگر انتہائی نفاست اور سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ قیمتی اور خوب صورت فرنیچر' پینٹنگز' سامان آرائش' قالین' نوادرات اور سب سے بڑھ کر خود نواب صاحب۔ اس گھر کے اندر پہنچ کر یوں محسوس ہوا جیسے اپنے ہی ملک میں موجود ہیں کیوں کہ نواب عبدالخالق نے نہ صرف اسے مشرقی اور مغربی آرائش کا نمونہ بنا دیا تھا بلکہ بے شمار آرائشی چیزیں بھی مشرقی بلکہ خالص پاکستانی تھیں انہوں نے نہ جانے کب اور کیسے یہ اشیا جمع کی ہوں گی۔ یہاں تک کہ فرش پر بچھے ہوئے قیمتی قالین بھی پاکستانی اور ایرانی تھے۔ ان کے ڈرائنگ روم کے سامنے والی دیواریں بھی شیشے کی تھیں۔ اس کے باہر بہت خوبصورت ٹیرس تھا۔ ڈرائینگ روم کے اندر ہی بیٹھے بیٹھے ہم ٹورنٹو کی بلند و بالا اور روشنی سے جگمگاتی ہوئی عمارتوں کا نظارہ کر سکتے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ ہم واقعی کسی مغربی شہر میں ہیں۔

کافی دیر باتیں ہوتی رہیں' پھر کھانا کھایا گیا جو نواب صاحب نے خود پکایا تھا اور خالص پاکستانی پکوانوں پر مشتمل تھا۔ لبنیٰ نے کھانے کی تعریف کی تو خالق صاحب بولے "تعریف کا شکریہ' مگر یہ کھانا صرف آج ہی پیش کیا جا رہا ہے۔ کل سے آپ ہی کھانا پکایا کریں گی۔"

"بھئی وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ اول تو خاکسار اس گھر میں آپ کو نظر ہی نہیں آئے گا۔ صبح سے رات تک دفتر یا پھر ملکوں ملکوں کی خاک چھاننے میں مصروف رہے گا۔ دوسرے یہ کہ آپ جیسی ایکسپرٹ پکانے والی کے ہوتے ہوئے میرا کھانا پکانا کس قدر شرم کا مقام ہو گا۔

بھابی مجھے بھی دیسی کھانا کھائے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ میں نے ان کھانوں کی ایک فہرست بنا کر رکھی ہے جو آپ سے بنوائے جائیں گے" یہ کہہ کر انہوں نے ایک میز کی دراز کھولی اور کاغذات کا ایک پلندہ نکال کر ہماری بیگم کے حوالے کر دیا۔ یہ خاصی لمبی چوڑی فہرست تھی جس میں مغلیہ قسم کے پرانے کھانوں سے لے کر آج کل کے مروجہ کھانوں تک سبھی چیزیں موجود تھیں۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ بارہ پندرہ قسم کی تو دالیں تھیں۔ مسور کی دال' کھڑے مسور کی دال' بادشاہ پسند دال' بھنی ہوئی دال' وغیرہ وغیرہ۔ گویا نواب عبدالخالق نے واشنگٹن سے واپس آنے کے بعد وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ اچھی طرح ہوم ورک کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہماری بیگم کو بھی ایسا خوش ذوق کھانے والا بہت عرصے بعد نصیب ہوا تھا۔ انہوں نے بھی ایسے ایسے کھانے پکائے جو ہم نے محض سن رکھے تھے یا جن کے نام کتابوں میں پڑھے ہوئے تھے' اگر مداح مل جائے تو پھر باورچی کیسے باز آئے۔ نواب صاحب کا یہ عالم رہا کہ ہر قسم کے کھانے بہت ذوق و شوق سے کھاتے تھے۔ اس کی تعریف بھی خوب زور شور سے کرتے تھے اور پھر تعریف کی وجوہات بھی بیان کرتے تھے کہ اس ہنڈیا کی خصوصیت کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نواب صاحب کو خود بھی کھانوں کے بارے میں کافی تجربہ اور معلومات تھیں۔ نادیہ نے تو جب کھانوں کے بارے میں ان کی ڈسکشن سنی تو فوراً کہہ دیا کہ انکل آپ تو ایکسپرٹ ہیں۔ کینیڈا میں ایک کالج کھول لیں جہاں مغلئی اور دیسی کھانوں کی ترکیب سکھائی جائے۔

نواب عبدالخالق دو تین دن تو خاص طور پر ٹورنٹو میں ٹھہرے۔ ہمیں اپنے ساتھ لے جا کر مختلف علاقے' شاپنگ سنٹرز' تفریح گاہیں وغیرہ دکھائیں۔ مختلف سڑکوں سے روشناس کرایا۔ قابل ذکر مقامات کے بارے میں بتایا۔ چند لوگوں سے ملاقات کرائی اور پھر اپنے کسی سفر پر روانہ ہو گئے۔ پھر ان کا قصہ یہ تھا کہ ہم گھر والے تھے اور وہ مہمان۔ ادھر ادھر سے چند روز کے لئے آتے تھے اور پھر کہیں چلے جاتے تھے۔ اگر ٹورنٹو میں رہتے بھی تو صبح جاتے تو رات کو لوٹتے۔ ہمارے پاس گھر کی چابی تھی۔ جب چاہے جاؤ' جب چاہے آؤ' انہوں نے ہمیں یہ اجازت بھی دے رکھی تھی کہ بلا تکلف اپنے ملاقاتیوں اور دوستوں کو بلائیں ان کی دعوت اور خاطر مدارات کریں اور اس گھر کو اپنا گھر سمجھیں۔ خود نواب صاحب کا یہ معاملہ تھا کہ وہ بارہ پندرہ سال سے ٹورنٹو میں مقیم تھے۔ ہم نے پوچھا کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ تو بولے "حضرت! ہمارے پاکستانی بھائی ہر معاملے میں سیاست چلاتے ہیں۔ آپس میں لڑائیاں' پارٹی بازی' جھگڑے' ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی ترکیبیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ ان سے دور ہی رہا جائے" چنانچہ وہ اس نسخے پر عمل کرتے تھے اور بہت خوش و خرم رہتے تھے۔ ہمارے دوران قیام میں جو لوگ ہماری وجہ سے ان کے گھر آتے رہے ان سے وہ بہت خندہ پیشانی سے ملتے رہے۔ ہمارے ساتھ دعوتوں میں بھی شریک ہوتے رہے مگر جوں ہی ہم نے ٹورنٹو سے رخت سفر باندھا نواب صاحب نے بھی ان حضرات سے ملاقاتیں منسوخ کر دیں۔ بالکل انجان بن گئے۔ نواب صاحب کی صحت' خوش باشی اور پُر سکون زندگی کا راز ہماری سمجھ میں آ گیا تھا۔

کھانے تو ہماری بیگم نے خوب پکائے مگر جان پر کھیل کر۔ وہ کیسے؟ ہوا یہ کہ دو دن تو نواب صاحب نے دفتر سے بالکل چھٹی ہی کر دی تھی۔ گھر کی صفائی اور آرائش میں مصروف رہے۔ ہماری خاطر مدارات کا سامان فراہم کرتے رہے۔ پھر کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر پرانی دیگچیاں اور پتیلیاں' کفگیر' ڈوئیاں اور چمچے وغیرہ نکال کر بیگم صاحبہ کے حوالے کئے۔ بازار سے مرچ مسالے خرید کر لائے اور مغلئی کھانے تیار کرنے کا پورا اہتمام کر لیا۔ دوسرے دن جب لبنیٰ نے کچن میں پہلی بار ہنڈیا چولہے پر چڑھائی تو نواب صاحب نے فلیٹ کے دروازے اور کھڑکیاں بند کرنے شروع کر دیے۔ کچن کا ایگزاسٹ فین آن کر دیا۔ کافی دیر تک گھبرائے گھبرائے پھرتے رہے۔ ہم نے سبب دریافت کیا تو بولے کہ یہاں تمام تر یورپین اقوام کے لوگ رہتے ہیں اور یہ لوگ ہمارے دیسی کھانوں کی خوشبو خصوصاً مسالہ جات کو سخت ناپسند کرتے ہیں جن کو ہم نے پاکستانی پکوان کھلائے انہیں پسند تو بہت آئے مگر ان کی وجہ سے گھر میں جو خوشبو پھیلی اس سے وہ بہت نالاں رہے' چنانچہ یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ ہنڈیا بھوننے کی خوشبو گھر سے باہر نہ نکلنے پائے ورنہ ہمسائے ناراض ہو جاتے ہیں۔

ہم نے کہا کہ بھائی یہ تو وہی بات ہوئی کہ گڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز یعنی کھانے تو پسند ہیں مگر مسالوں کی خوشبو ناپسند۔ یہ بھلا کہاں کا انصاف ہے؟ دراصل بات یہ ہے کہ یورپین کھانوں میں مسالے بالکل نہیں ہوتے۔ یہ لوگ تو کھانا پکانے کے بعد بھی اس میں مرچ مسالا ڈالنے کے قائل نہیں۔ ہمارے ایک پاکستانی دوست کے الفاظ میں ابا!

ہوا یا تلا ہوا نیم کچا کھانا کھاتے ہیں۔ ان صاحب نے ابلے ہوئے گوشت اور نیم پخت مچھلی کا نام راتب رکھ چھوڑا تھا۔ ایک دن ہمارے ساتھ ٹورنٹو کے ایک ریستوران میں گئے تو بولے "بھائی جان یہاں صرف ابلا ہوا راتب ملے گا۔ بعد میں مجھے کچھ نہ کہئے گا۔"

یورپ والے ہر لحاظ سے ہم مشرق والوں سے مختلف ہیں۔ صورت شکل تو نظر ہی آ جاتی ہے۔ عادات و اطوار اور رسم و رواج بھی آپ کے سامنے ہیں۔ ہر وہ چیز جسے ہمارا معاشرہ برا سمجھتا ہے وہ اسے اچھا اور پسندیدہ قرار دیتے ہیں۔ کھانوں کے معاملے میں بھی یہی چلن ہے۔ انتہائی پھیکے' بد مزہ کھانے بہت مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔ اس میں نمک بھی بہت تکلف سے ڈالتے ہیں اور مرچ مسالے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حد یہ ہے کہ یورپین آملیٹ میں سوائے انڈے کے کچھ نہیں ہوتا۔ نہ پیاز نہ مرچ' نہ ٹماٹر۔ بس نرا انڈا ہوتا ہے۔ رہن سہن کے سلسلے میں بھی یہی فرق ہے۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ یہ دونوں کبھی نہیں ملے' نہ مل سکتے ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ ہم کھینچ تان کر انہیں ملانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں مگر جو نتائج بر آمد ہو رہے ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں۔ اس ملاپ سے جو نتائج بر آمد ہوتے ہیں۔ انہیں "گناہ بے لذت" کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا۔

ٹورنٹو کینیڈا کا سب سے بڑا شہر ہے۔ ریاست اونٹاریو کا دارالحکومت ہے۔ اس سب سے بڑے شہر کی آبادی صرف بائیس لاکھ ہے۔ بہت وسیع و عریض اور مالدار شہر ہے۔ عظیم الشان عمارتیں' شاندار سڑکیں' خوب صورت شاپنگ سنٹر' انتہائی اعلیٰ معیار کے اسکول کالج' یونیورسٹیاں اور تحقیقاتی مراکز۔ یوں تو اوٹاوہ کینیڈا کا دارالحکومت ہے لیکن حقیقی معنوں میں ملک کا تہذیبی' سیاسی' اقتصادی مرکز ٹورنٹو ہے۔ یہی وہ سنٹر ہے جو سارے ملک کا اعصابی مرکز قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ اس ملک کا سب سے خوب صورت' سب سے آباد' سب سے بارونق شہر ہے۔ دارالحکومت اوٹاوہ تو اس کے مقابلے میں ایک چھوٹا سا قصبہ لگتا ہے۔ اوٹاوہ کی آبادی صرف ساڑھے تین لاکھ ہے۔ خاصا بورنگ شہر ہے۔ یہاں سردی بھی ٹورنٹو سے زیادہ پڑتی ہے اور پہلے شروع ہو جاتی ہے۔ ڈراما' فلم' ادب' موسیقی' رقص جیسے فنون لطیفہ میں بھی ٹورنٹو کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ٹورنٹو میں ستمبر کے مہینے میں عالمی فلم فیسٹویل منعقد ہوتا ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں اب اسے بھی نیویارک' کان اور لاس اینجلس کے فلمی میلوں کی مانند اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ اس میلے کے دوران میں ملک کے مختلف شہروں میں دنیا بھر کی منتخب فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ عالمی شہرت یافتہ اداکار اور ہنرمند آتے ہیں۔ سیمنار منعقد ہوتے ہیں۔ تقاریب کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ٹورنٹو زندگی سے بھرپور شہر ہے۔ آرکسٹرا' کناڈین اوپیرا' نیشنل بیلے آف کناڈا ایسے ادارے ہیں جن کی دنیا بھر میں شہرت ہے اور انہیں عزت و توقیر بھی حاصل ہے اونٹاریو پلیس ایک انتہائی حسین اور وسیع و عریض پارک ہے۔ یہ جھیل کے اندر ایک جزیرے کی حیثیت رکھتا ہے اور وہاں تک جانے کے لئے اسٹیمر استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس جزیرے میں ہر عمر اور ہر ذوق کے

لوگوں کی تفریح کا سامان موجود ہے۔ سیاحوں کے علاوہ ہزاروں مقامی لوگ بھی اس کی سیر کے لئے آتے رہتے ہیں پھرونڈر لینڈ بھی ایک تفریح گاہ ہے۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے۔ یہاں تفریح کے حیران کن سامان موجود ہیں۔ ٹورنٹو کی ایک اور قابل ذکر چیز کناڈین نیشنل ایگزیبیشن ہے۔ سو سال سے زیادہ عرصے سے یہ نمائش ہر سال اگست کے مہینے میں ٹورنٹو شہر میں منعقد ہوتی ہے اور اسے ایک سالانہ میلے کی حیثیت حاصل ہے۔ نمائش گاہ تمام سال کھلی رہتی ہے۔ موسم سرما میں تو خیر ساری آؤٹ ڈور سرگرمیاں محدود اور مفقود ہو جاتی ہیں مگر گرمیوں کے موسم میں یہاں خوب چہل پہل گہما گہمی رہتی ہے۔ یہ نمائش گاہ جھیل کے سامنے ہی واقع ہے۔ دراصل جھیل کو بھی ٹورنٹو میں ایک نمایاں اور مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ کہنے کو اس کا نام "جھیل اونٹ آریو" ہے مگر دیکھنے میں یہ اچھا خاصا سمندر ہے۔ موسم گرما کے تمام عرصے میں جھیل کے آس پاس خوب ہل چل رہتی ہے۔ سمندر کے ساحل بھی خوب آباد رہتے ہیں۔ مغرب کی جانب ہائی پارک واقع ہے۔ یہ شہر کا سب سے بڑا اور وسیع پارک ہے۔ بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اس پارک میں وہ سب کچھ تو موجود ہے ہی جو یورپ اور امریکا کے باغوں میں ہوتا ہے یعنی خوب صورت سبزہ زار' پھول' درخت' پودے لیکن اس کے علاوہ بھی تفریح اور دلچسپی کے لئے بے شمار چیزیں ہیں۔ تھیٹر ہیں' قد آور خوب صورت سربلند درخت ہیں۔ پانی کے مختلف کھیل بھی ہیں جن میں چھوٹے بڑے سبھی دلچسپی لیتے ہیں۔

ٹورنٹو انتہائی خوب صورت اور صاف ستھرا شہر ہے لیکن امریکی شہروں کے ہنگاموں اور خرابیوں سے بہت حد تک محفوظ ہے۔ ٹورنٹو میں سب سے پہلے تو نظم و ضبط اور قاعدے قانون کی پاس داری کا احساس ہوتا ہے۔ حکومت نے قانون شکنی اور جرائم کے سد باب کے لئے بہت سے اقدامات کئے ہیں۔ جیسے رات کو ایک بجے نائٹ لائف کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ شراب خانے اور نائٹ کلب بند کر دئے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ڈیڑھ دو بجے تک سڑکیں قریب قریب ویران ہو جاتی ہیں۔ شراب کی دکانوں پر بھی پابندیاں ہیں۔ رات کو بارہ ایک بجے کے بعد شرابیوں کو سارے شہر میں نہ تو کوئی شراب خانہ کھلا ہوا ملتا ہے نہ ہی کسی دکان سے شراب دستیاب ہو سکتی ہے۔ رقص گاہیں اور میوزیکل ادارے بھی بستر گول کر دیتے ہیں۔

ٹورنٹو کی سیر کا حال تو ہم آپ کو سنائیں گے مگر سب سے پہلے جانی لمبارڈی صاحب کا تذکرہ سن لیجئے۔ نواب عبدالخالق صاحب نے ہم سے کہا تھا کہ کینیڈا میں ٹیلی ویژن کے میدان میں کافی گنجائش ہے۔ ان کے اس بیان کی بنیاد یہ تھی کہ کینیڈا میں مختلف قوموں اور نسلوں کے لوگ آباد ہیں اور اپنی اپنی تہذیبی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ حکومت بھی ان کی سرپرستی اور دلداری کرتی ہے اور ان کی علاقائی اور قومی شناخت کو برقرار رکھنے کے سلسلے میں انہیں مالی امداد بھی فراہم کرتی ہے۔ ٹورنٹو میں یوں تو انگریزی بولی جاتی ہے اور یہی صوبہ اونٹاریو کی سرکاری زبان ہے مگر دوسری زبان کی حیثیت فرنچ کو حاصل ہے کیونکہ کیوبک کے صوبے میں فرانس کے لوگوں کی اکثریت ہے اور کینیڈا میں فرانس اور انگریزوں کے مابین کتے بلی جیسا بیر پایا جاتا ہے اس کے باوجود مختلف اقوام کے لوگ اپنے کلچر اور تہذیبی ورثے کو حفاظت سے رکھتے ہیں۔ ٹورنٹو میں ٹیلی ویژن کے مختلف چینل ہیں جن سے انگریزی اور فرنچ کے علاوہ اطالوی' یونانی' چینی' ہنگرین زبانوں میں بھی پروگرام پیش کئے جاتے ہیں۔ بعد میں انڈین اس میں شامل ہو گئے اور اس کے بعد پاکستانی کیوں پیچھے رہتے۔ یہ بات اور ہے کہ پاکستانی پروگرام زیادہ نہیں ہوتے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن اس ملک میں بھی نجی ملکیت میں ہے۔ سرکار کا اس میں ذرا بھی دخل نہیں ہے۔ حکومت تو صرف ریڈیو اور ٹیلی ویژن اسٹیشن بنانے کے لئے اجازت دینے کی گناہ گار ہے۔

اٹلی کے لوگ کینیڈا میں بہت فعال اور سرگرم ہیں۔ جانی لمبارڈی ایک اطالوی شخص ہے۔ کئی ریڈیو اسٹیشن اور ٹیلی ویژن چینل اس کی ملکیت ہیں۔ ان سے اطالوی کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی پروگرام پیش کئے جاتے ہیں۔ جانی لمبارڈی نے ٹورنٹو میں ایک اور روایت کو بھی جنم دیا ہے: ہر سال یہاں اگست کے مہینے میں جانی لمبارڈی انٹرنیشنل پکنک منائی جاتی ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا بھر میں عظیم ترین فری پکنک ہے۔ بہت سے سنجیدہ لوگ تو اس کو پسند نہیں کرتے مگر اکثریت اس کی شیدائی ہے۔ تین دن تک شہر میں وہ ہنگامہ برپا رہتا ہے کہ خدا کی پناہ۔ کہیں مقابلۂ حسن ہو رہا ہے تو کہیں خواتین کے لباسِ پیراکی کے مقابلے ہیں۔ کھانا پکانے اور کھانے کے مقابلے ہوتے ہیں۔ سارے ملک ہی سے نہیں اٹلی سے بھی رقاص' بازی گر اور جادو گر

بلائے جاتے ہیں جو مختلف مقامات پر اپنے مظاہرے پیش کرتے ہیں۔ کہیں باکسنگ ہے تو کہیں کشتی ہو رہی ہے۔ کسی جگہ موسیقی کا مقابلہ ہے تو کسی جگہ رقص کا۔ مختصر یہ کہ ایک ہنگامہ جاری رہتا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ ہر چیز بالکل مفت۔ ان تماشوں کو دیکھنے کے لئے کوئی ٹکٹ نہیں ہوتا۔ مقابلوں میں کامیاب رہنے والوں کو انعامات ضرور دیے جاتے ہیں۔

ہم جن دنوں ٹورنٹو پہنچے تو یہ پکنک ختم ہو چکی تھی مگر اس کے چرچے باقی تھے۔ کینیڈا والے اس کو "جانی لمباردی سرکس" کے نام سے پکارتے ہیں۔

ایک بڑے میاں ہمیں نمائش گاہ میں مل گئے۔ پکنک کے ذکر پر انہوں نے بہت ناک بھوں چڑھائی اور بولے "فضول' بالکل بے ہودہ' یہ شخص اس شہر کی اخلاقی قدروں کو برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔"

بے زاری سے بولے "توبہ کیجئے۔ تین دن تک زمانے بھر کے لچے لفنگے خوب اودھم مچاتے ہیں۔ دنیا بھر کی آوارہ لڑکیاں ٹورنٹو میں اکٹھی ہو کر بے ہودہ حرکتیں کرتی ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہ نہایت مخرب اخلاق حرکت ہے۔"

جو لوگ اس کو پسند نہیں کرتے وہ بھی اس پر پابندی لگانے کا مطالبہ نہیں کرتے کیونکہ ان کے خیال میں یہ جانی لمباردی اور اس شو کو پسند کرنے والوں کا جمہوری حق ہے۔ ہم نے تو یہ دیکھا کہ ان ترقی یافتہ ملکوں میں حکومتوں کا عمل داخل دیکھنے میں نہیں آتا۔ جس کے جو جی میں آئے کرے۔ جب تک دوسروں کا سکون اور شہر کا امن خراب نہیں ہوتا نہ حکومت کو اعتراض ہے نہ مخالفین زبان کھول سکتے ہیں۔ ناپسند اور پسند کرنے کا اختیار بلاشبہ انہیں حاصل ہے مگر یہ بھی وہ اپنی ذات تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ نہ تو پابندی کے لئے مطالبات اور احتجاجی مظاہرے کرتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کے ہنگامے یا سر پھٹول کے مظاہرے دیکھنے میں آتے ہیں۔ دراصل ان کا فلسفہ یہ ہے کہ جب تک آپ میری ناک پر ضرب نہیں لگاتے مجھے آپ کے کسی معاملے میں اپنی ناک بڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ہم تو امریکہ سے کینیڈا گئے تھے اس لئے یہ ملک اور اس کا شہر ٹورنٹو مقابلتاً اس قدر صاف' پُر سکون اور پُر امن محسوس ہوا کہ کیا عرض کریں۔ امریکا میں سب سے بڑی مشکل کالے ہیں۔ کینیڈا میں کالے نظر ہی نہیں آتے۔ خال خال ملتے ہیں شہر کے لوگ قانون کے پابند' مہذب اور با اخلاق ہیں۔ سارے ملک کا یہی مزاج ہے۔ نواب خالق نے ہمیں اس کا سبب بھی بتا دیا بولے "امریکا کی تاریخ تو قتل و غارت' کاؤ بوائے کی خونریزیوں اور باہمی جنگوں سے بھری پڑی ہے مگر کینیڈا میں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی آپ کو یہاں بندوقیں اور قتل و غارت کے مناظر دیکھنے کو نہیں ملتے۔"

یہ واقعی درست ہے ہم مختلف اوقات میں بار ہا کینیڈا گئے اور مہینوں وہاں مقیم رہے' مگر لاقانونیت جرائم اور قتل و غارت کے واقعات برائے نام ہی دیکھے یا سنے۔ اخبارات میں بھی ایسی خبریں کبھی کبھار ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یورپ اور امریکا میں اسکن ہیڈیا دوسرے نوجوان گروہ جو گڑبڑ پھیلاتے ہیں یا آپس میں جنگ و جدل کرتے ہیں ٹورنٹو اور کینیڈا ان سے بھی محفوظ ہے۔

ٹورنٹو کی سڑکوں پر ہم گھومنے نکلے تو نہ پیرس جیسا فیشن نظر آیا نہ خوشبوئیں لیکن حسن و جمال کی کمی نہیں ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ یورپین لوگوں کے شانہ بشانہ دوسری نسلوں کی خواتین بھی کافی تعداد میں نظر آتی ہیں مگر لباس سب کا مغربی ہے۔ اس شہر میں بھی دنیا کے دوسرے بڑے شہروں کی طرح مختلف قوموں کے افراد کی آبادی ہے اور ان کی بستیاں بھی مخصوص ہیں جہاں انہی کے کلچر اور رہن سہن کا عکس نظر آتا ہے۔

ایک دن نواب صاحب ہمیں ٹورنٹو کے "تہذیبی دورے" پر لے گئے۔ آگے آگے نواب صاحب کی کار تھی اور اس کے پیچھے ہم۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نواب صاحب تو ٹورنٹو شہر میں "تبرک" کے طور پر آتے تھے اس لئے ہماری خواہش تھی کہ شہر کی مختلف سڑکوں اور علاقوں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہو جائیں۔ امریکا میں ہمیں مغرب کی ڈرائیونگ کا بخوبی تجربہ ہو چکا تھا۔ کینیڈا میں بھی سڑکوں اور شاہراہوں پر قریب قریب اسی قسم کے نشانات ہیں۔ ٹریفک کا نظام بھی اسی طرح کا ہے۔ ویسی ہی ایکسپریس وے سڑکیں' شاہراہیں' داخلے اور اخراج کا بھی وہی سسٹم ہے۔ اس لحاظ سے ہمیں کینیڈا میں کار ڈرائیو کرتے ہوئے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ سوائے اس کے کہ جب ہم اپنی "پاکستانی ٹریفک" کی عادت سے مجبور ہو کر کوئی قانون شکنی کر بیٹھتے تو فوراً اس کا رد عمل بھی سامنے آجاتا تھا۔ کینیڈا یوں تو برطانیہ کے زیر اثر رہا ہے اور انگریزوں کی بھی وہاں

بہت بڑی تعداد ہے۔ کیوبک کے فرنچ صوبے کے سوا ہر جگہ انگریزی اثر ہے بلکہ کہنے کو یہ برطانوی نو آبادی رہا ہے اور آج بھی کینیڈا کے کرنسی نوٹوں پر ملکہ برطانیہ کی تصویر نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود ٹریفک کا نظام امریکا کے مشابہ ہے یعنی سڑکوں پر دائیں ہاتھ ٹریفک چلتا ہے۔ ہمارے خیال میں انگلستان واحد مغربی ملک ہے جہاں ٹریفک بائیں ہاتھ ہے ورنہ یورپ کے تمام ملکوں میں اور امریکا کینیڈا میں بھی دائیں ہاتھ چلنے کا رواج ہے۔ اب اسے انگریزوں کی ہٹ دھرمی کہہ لیجئے، مستقل مزاجی کہئے یا روایت پرستی کا نام دیجئے کہ انہوں نے اس معاملے میں بھی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ ہی بنائی۔ اب یوروپین کامن مارکیٹ کے قیام کے بعد انگریزوں کو بھی اپنی تجارت اور طور طریقوں میں تبدیلی کرنی پڑ رہی ہے مگر پھر بھی ہر قدم پر وہ مدافعت ضرور کرتے ہیں۔ کینیڈا میں ہر معاملے میں وہی طریقہ کار ہے جو امریکا میں ہے۔ کہنے کو یہ برٹش کالونی رہا مگر امریکیوں سے لاکھ اختلافات اور تنازعات رکھنے کے باوجود انہوں نے امریکی نظام حیات کو ترجیح دی۔ شہروں کی تربیت اور گھروں کی قیادت بھی امریکہ سے مشابہ ہے۔ ویسے ہی ڈاؤن ٹاؤن کے علاقے۔ ویسی ہی نواحی آبادیاں، فرق صرف رکھ رکھاؤ کا ہے۔ کینیڈا زیادہ مہذب پر امن اور پُر سکون ملک ہے۔ یہاں آپ سڑکوں اور گھروں میں خود کو بہت زیادہ محفوظ سمجھتے ہیں جب کہ امریکہ میں ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے۔ امریکہ میں امن و امان کی خرابی کے بہت حد تک کالے ذمے دار ہیں۔ کینیڈا ان حضرات سے محفوظ ہے۔ اس لئے بے شمار ایسی علتوں سے بھی بچا ہوا ہے جو امریکی معاشرے میں کالوں کی دین ہے۔ سچ پوچھئے تو کالے امریکہ کے لئے درد سر ہیں۔ جمہوریت کے نعرے بلند کرنے کے باوجود امریکی سسٹم اور امریکی یوروپین آبادی میں ابھی پوری طرح یہ شعور پیدا نہیں ہو سکا ہے کہ "کالوں" کے مسائل کو وہ جس قدر نظرانداز کر رہے ہیں خود ان کے لئے مہلک اور تباہ کن ہے۔ بہت سے دوسرے لوگوں کے مانند ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ امریکا کو جتنا خطرہ "کالوں" سے ہے اتنا دنیا کی کسی اور چیز سے نہیں ہے۔ اس تہذیب اور نظام کی تباہی اور بربادی کا آغاز بھی کالے ہیں اور انجام بھی کالے ہی ہوں گے۔

کینیڈا کی خوش قسمتی یہ ہے کہ یہاں "کالے" نہ ہونے کے برابر ہیں، بلکہ ہیں ہی نہیں، مگر یہاں دوسرے "عطیات" موجود ہیں۔ مثلاً اطالوی، چینی اب کوریا، فلپائن، جاپان اور ویت نام وغیرہ کے لوگ بھی ٹوٹ پڑے ہیں۔ یونانی بھی ہیں، ہنگری کے لوگ بھی ہیں اور ان کی آبادی مسلسل بڑھ رہی ہے۔ اب تو ایشیائی آبادی خاصی زیادہ ہو گئی ہے۔ ہندوستانی اور پاکستانی بھی اب کافی تعداد میں ہو گئے ہیں اور ان کی آبادی ماشاء اللہ روز افزوں ہے۔ پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کی بہت بڑی آبادی ٹورنٹو اور اس کے گردو نواح میں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ رہا ہے کہ دوسری نسلوں کی بستیوں کی طرح اب ٹورنٹو میں پاکستانی اور ہندوستانی آبادی کے مخصوص علاقے بھی بن گئے ہیں۔ ایک "چاندنی چوک" ہے اس کے ارد گرد بھی انہی لوگوں کی آبادی ہے۔

"چاندنی چوک" ایک طرح کا شاپنگ سنٹر ہے۔ اس کے اندر قدم رکھتے ہی سب سے پہلے تو کبابوں کی خوشبو آپ کا خیر مقدم کرتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی انواع و اقسام کے ہندوستانی اور پاکستانی کھانے یہاں مل جاتے ہیں۔ پھر پاکستانی شلوار قمیص، ہندوستانی ساڑھیاں، پراندے، دوسری مخصوص اشیا، چوڑیاں، دیسی جوتیاں، کھانا پکانے کے برتن، مسالے اور خدا جانے کیا کچھ یہاں دستیاب ہے۔ پاکستانی مٹھائیوں کی دکانیں بھی ہیں، اس قسم کے ریستوران بھی ہیں، ویڈیو فلمیں بھی حاصل کر لیجئے۔ اور تو اور پان کی دکانیں بھی موجود ہیں۔ یہاں پہنچ کر یوں لگتا ہے جیسے ہندوستان یا پاکستان کے کسی شہر میں گھوم رہے ہیں۔ وہی چہرے، وہی لباس، وہی طور طریقے، اردو پنجابی زبانوں میں باتوں کی آوازیں سبھی کچھ اپنا اپنا لگتا ہے اور دیار غیر میں تو بہت ہی اچھا لگتا ہے۔ اردو کے اخبارات و رسائل بھی یہاں مل جاتے ہیں۔ کوئی صاحب شیروانی پہنے ہوئے ہیں تو ایک سردار جی پگڑی باندھے چلے آ رہے ہیں۔ شوخ و شنگ ملبوسات میں عورتیں مشرقی زیورات میں لدی پھندی ایک دکان سے دوسری دکان میں جا رہی ہیں، چاٹ کی دکان پر ان کا سب سے زیادہ رش نظر آتا ہے۔ مٹھائی کی دکان پر سموسے وغیرہ بھی بک رہے ہیں۔ خریدنے والے بھی دیسی، بیچنے والے بھی دیسی، ہمیں تو بہت اچھا لگا۔ مانا کہ ایک زمانے میں یورپ والے دنیا بھر میں اپنی نو آبادیاں بناتے تھے۔ مگر اب الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ یورپ امریکہ اور کینیڈا میں یہ ہم لوگوں کی نو آبادیاں ہی تو ہیں۔ چینی، جاپانی، ہندوستانی، پاکستانی، کورین، فلپینی بستیاں آباد ہو رہی ہیں اور جس تیزی سے یہ لوگ افزائش نسل کرتے ہیں وہ تو کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ آئندہ بیس سال بعد امریکا میں سفید اقوام کی

آبادی اقلیت میں تبدیل ہو جائے گی۔ انگلستان میں بھی ایسا ہی منظر ہے۔ ٹورنٹو میں بھی جب یہ نظارہ دیکھا تو جی خوش ہو گیا۔ چلئے ہم نہ سہی ہماری آنے والی نسلیں ان گوروں سے بدلہ لیں گی۔

جب کینیڈا میں دنیا بھر سے آباد کار آنے شروع ہوئے تو ان میں اکثریت اینگلو سیکسن لوگوں کی تھی انہوں نے تجارتی بنیادوں پر ہر جگہ قبضہ جمانا شروع کر دیا۔ مقامی آبادی سمٹتی چلی گئی یہاں تک کہ شہروں میں یہ لوگ اب خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ اس کی ایک مثال "ٹورنٹو آئی لینڈ" ہے۔ یہ جزیرہ ٹورنٹو شہر سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ آنے جانے کے لئے کشتیوں کے سوا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ضرورت کی تمام اشیا کشتیوں کے ذریعے وہاں پہنچائی جاتی ہیں۔ یہاں آپ کو سیاحوں کے علاوہ جو لوگ نظر آئیں گے وہ کینیڈا کی پرانی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ بے چارے اقتصادی لحاظ سے پسماندہ ہیں۔ گرمیوں میں تو زندگی اچھی ہے مگر سردیوں میں زندہ رہنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ گندمی رنگ کے گٹھے ہوئے جسموں کے لوگ ہیں۔ چہرے کے نقوش کچھ کچھ امریکی ریڈ انڈین لوگوں کی طرح ہیں۔ پتلون قمیص بھی پہنتے ہیں۔ اور بعض لوگ اپنا مخصوص قومی لباس بھی زیبِ تن کرتے ہیں۔ بہت جفاکش اور محنتی لوگ ہیں مگر ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

ہم کشتی میں سوار ہو کر جزیرے پر گئے تو ایک نئی دنیا نظر آئی۔ یہاں ماحول ٹورنٹو سے مختلف ہے۔ ایک پھل فروش سے ہم نے کیلے خریدے۔ سیب کا بھاؤ دریافت کیا۔ یہ صاحب ساٹھ باسٹھ سال کی عمر کے ایک مضبوط آدمی تھے۔ انگریزی بھی ٹوٹی پھوٹی بول لیتے تھے۔ ہماری رنگت دیکھی تو بہت خوش ہوئے۔ پوچھنے لگے۔ "انڈین؟"

ایک تو یہ بڑی مشکل ہے۔ دنیا میں جہاں بھی جاؤ سب سے پہلے لوگ ہندوستانی سمجھتے ہیں۔ ہم نے جواب دیا "نو۔ پاکستانی۔"

انہوں نے اپنے جھریوں بھرے چہرے پر تفکر کے تاثرات پیدا کئے۔ چند لمحے سوچا پھر مسکرا کر بولے "آئی نو ویری لٹل۔ ایکسکیوز می" (میں بہت کم جانتا ہوں معاف کیجئے گا) مگر ہمارے چہرے کا رنگ دیکھ کر وہ بہت مہربان ہو گئے۔

ہم نے پوچھا "آپ کس قوم سے ہیں؟"

بولے "بس کینیڈین نہیں ہوں۔"

انہوں نے اس بات کا شکوہ کیا کہ ہمیں یہ لوگ انسان ہی نہیں سمجھتے۔ پہلے ٹورنٹو سے باہر نکالا اب ہم سر چھپانے کے لئے جزیرے میں آئے ہیں تو کہتے ہیں کہ خالی کر دو۔ یہ رہنے کی جگہ نہیں ہے۔

ہم نے پوچھا "تو پھر یہ کس لئے ہے؟"

تلخی سے مسکرائے اور بولے "باغ بنانے کے لئے۔ سٹی کونسل کہتی ہے کہ ہم یہاں پارک بنائیں گے۔ تفریح گاہ بنائیں گے۔ انہیں ہمارے رہنے کی فکر نہیں ہے۔ بس تفریح کی پڑی ہے۔"

دراصل کینیڈا میں بھی قصہ قریب قریب وہی ہے جو امریکا میں ہے۔ یعنی جب یورپین اقوام کے لوگ تجارت اور آباد کاری کے سلسلے میں یہاں پہنچے تو مقامی لوگ سمٹ کر پہلے تو شہروں کے غریب علاقوں میں محدود ہو گئے اور پھر شہر چھوڑ چھوڑ کر دور دراز علاقوں میں نکل گئے۔ یہ پہلے والے لوگ بھی دراصل کسی زمانے میں باہر سے آ کر ہی یہاں آباد ہوئے تھے۔ جو زیادہ طاقت ور اور ترقی یافتہ تھے۔ انہوں نے دوسروں کو میدان سے بھگا دیا تھا۔

ایک چھوٹے سے صاف ستھرے ریستوران میں ہم برگر اور کافی کے لئے داخل ہو گئے۔ انتہائی صاف ستھرا مگر چھوٹا سا ریستوران تھا۔ مختصر مگر بے حد خوب صورت میزوں پر سرخ اور سفید چوکور خانوں کے میز پوش پڑے ہوئے تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے والے دروازے سے ایک خوب صورت سی لڑکی داخل ہوئی۔ انگریزی اچھی خاصی جانتی تھی مگر بولنے سے انکاری تھی۔ وجہ یہ کہ فرنچ تھی۔ ارے صاحب یہ فرانس والے بڑے کٹر اور متعصب لوگ ہوتے ہیں۔ ٹورنٹو میں رہنے والے فرنچ اپنی دکانوں کے سائن بورڈ فرنچ میں لکھتے ہیں۔ بعض ازراہ کرم انگریزی بھی لکھ دیتے ہیں، مگر انگریزی بولنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دوسرے فرنچ کیوں نہ بولیں۔ ان صاحب زادی کا بھی یہی نظریہ تھا۔

مسکراتی ہوئی آئیں اور "میغ موسیو" فرمانے کے بعد فرنچ میں رواں ہو گئیں۔ ہم نے کہا کہ ہمیں تو کافی اور برگر یا سینڈوچ درکار ہے۔ اتنا تو وہ سمجھ گئیں مگر پھر بھی

انگریزی کا ایک لفظ بھی منہ سے نہیں پھوٹا۔

ہمارے سامنے والی میز پر ایک درمیانی عمر کے گورے صاحب بیٹھے سگار پی رہے تھے۔ ہمیں حیران دیکھ کر مسکرائے اور آگے جھک کر بولے "چاہے کچھ کر لیں۔ یہ انگریزی ہرگز نہیں بولے گی۔

ہم نے پوچھا "مگر کیوں؟"

کندھے ہلا کر بولے "ہٹ دھرمی۔ زبردستی اور کیوں؟"

ہم نے اپنی میز والوں سے اجازت طلب کی اور ان کے پاس جا بیٹھے پتا چلا کہ وہ انگلستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک سو سال پہلے ان کے "بڑے" کینیڈا آئے تھے۔ کشتیوں وغیرہ کے بزنس سے تعلق رکھتے تھے۔

بولے "سیاح ہو؟"

ہم نے کہا "جی ہاں۔"

کہنے لگے "امریکا کی طرح کینیڈا بھی نیا ملک ہے۔ ان کی تاریخ ان کا کلچر سب کچھ نیا ہے' بلکہ سچ پوچھیے تو یہ سب تشکیل پا رہے ہیں۔ سو دو سو سال قوموں کی زندگی میں کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ پہلے سفید اقوام کے لوگ آئے۔ اب ایشیائی اور ہسپانوی بھی بڑی تعداد میں آرہے ہیں حالانکہ داخلے پر پابندیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ ایک وقت تھا جب حکومت کی خواہش تھی کہ دنیا بھر سے لوگ یہاں آئیں بے اندازہ زمین اور وسائل تھے مگر انسانوں کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

یورپ سے' وسط ایشیا سے جو طالع آزما یہاں آتے تھے انہیں بندرگاہ پر ہی دس ڈالر اور زمین کا ایک قطعہ دے دیا جاتا تھا کہ اسے آباد کرو۔ یہ تو جنگل بیابان تھا۔ سارا ملک خالی پڑا سائیں سائیں کرتا تھا۔"

خاصے دلچسپ اور باخبر آدمی لگتے تھے۔ زندہ دل بھی تھے۔

دوسری میز پر ہماری بیگم اور بچوں کو دیکھ کر مسکرائے اور بولے "کتنی آسانی سے بیوی بچوں کو چھوڑ کر میری میز پر آ گئے ہو۔ اگر گرل فرینڈ ہوتی تو کبھی نہ آتے۔ خیر لو سگار پیو' ہوا نا کا ہے۔"

انہوں نے ایک خوشبودار سگار' جیب سے نکال کر پیش کیا۔ اتنی دیر میں وہ صاحب زادی ہماری کافی اور برگر لے کر وہیں آگئیں اور فرنچ میں فرمانے لگیں کہ آپ کی مسز نے کہا ہے کہ یہ چیزیں آپ کو ادھر پہنچا دوں۔

ہم مینخ سی کہنے والے تھے مگر وہ صاحب بول پڑے "تھینک یو مس!"

اس کے جانے کے بعد ہم نے پوچھا "آپ فرنچ جانتے ہیں؟"

بولے "خوب اچھی طرح مگر میں بھی ان جان بن جاتا ہوں۔ یہ لوگ انگریزی نہیں بولتے تو میں فرنچ کیوں بولوں؟"

دلیل تو واقعی اچھی تھی۔ ہم نے کہا "آپ لوگ سالہا سال سے ایک جگہ رہتے ہیں۔ پھر بھی اس قدر دوری ہے؟"

کہنے لگے "رہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اصل چیز تو سوچ ہوتی ہے۔ ان کی وفاداریاں فرانس کے ساتھ ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔"

ہم نے کہا "اور آپ کی انگلستان کے ساتھ ہیں؟"

بولے "جی ہاں' مگر یہ تو رد عمل ہے۔ ہم سب ہی کینیڈین ہیں۔ تو پھر یہ جھگڑا کیوں ہے؟"

ہم کیا بتاتے' چپ رہ گئے۔ پھر ہم نے پوچھا "کچھ ٹورنٹو کے بارے میں بتائیے؟"

انہوں نے ہمارا سگار سلگاتے ہوئے کہا "ٹورنٹو ان دنوں اونٹاریو کا صدر مقام ہے۔ یہ بہت پرانا دارالحکومت ہے مگر پہلے یہ بالائی کینیڈا کا صدر مقام تھا۔ پہلے زمانے میں اس کا نام یارک تھا۔ ۱۸۶۷ میں اونٹاریو کا صوبہ بنا تو اس کا نام ٹورنٹو رکھ دیا۔ اس علاقے میں انگلستان سے آنے والوں کی اکثریت ہے۔ یہ تجارت پیشہ لوگ تھے انہوں نے خوب پیسہ کمایا۔ آج بھی بہت دولت مند ہیں۔ اور ڈیل اور فارسیٹ ہل کے علاقے میں آج بھی ان کے محل نما مکانات دیکھ لیجیے۔

حکومت کی کوشش تو شروع سے ہی یہ ہے کہ مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والوں کو یکجا اور ہم خیال بنا کر ایک قوم کی لڑی میں پرو دیا جائے مگر توبہ کیجیے۔ یہ فاصلے تو روز بروز بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔"

دیکھیے صاحب' دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ ہم جب اپنے ملک میں صوبائی عصبیت کا مظاہرہ دیکھتے ہیں تو اپنی پست ذہنی اور تنگ نظری پر نفرتیں کرتے ہیں اور

دوسری ترقی یافتہ اقوام کی مثالیں پیش کرتے ہیں کہ دیکھئے وہ کتنے پیار اور بھائی چارے سے رہتے ہیں' مگر وہاں جا کر دیکھئے تو اصلیت کا پتا چلتا ہے۔ شدید تعصب اور بے زاری وہاں بھی پائی جاتی ہے فرق صرف یہ ہے کہ وہ لوگ کھلے عام اس کا اظہار کر کے ایک دوسرے سے دست و گریبان نہیں ہوتے۔ ورنہ کھرچ کر پاس سے دیکھئے تو شدید اختلافات بلکہ نفرت تک نوبت پہنچ چکی ہے۔ اس میں کمی نہیں ہو رہی ہے۔ روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

نواب صاحب نے ہمیں ٹورنٹو کے "ڈاؤن ٹاؤن" کی سیر کرائی اور وہاں کے رنگا رنگ کلچر کا نمونہ دکھایا۔ یہاں وہی حال ہے جو دنیا میں ہر جگہ ہے۔ یعنی ایک نسل کے لوگ ایک آبادی میں یکجا ہو گئے ہیں اور وہ انہی کی آبادی بن کر رہ گئے لباس تو سب کا قریب قریب یکساں ہے یعنی کوٹ پتلون اور اسکرٹ' بلاؤز اور جینز وغیرہ۔ مگر چہرے الگ' حلیے الگ' سب دیکھنے میں بھی مختلف سے لگتے ہیں۔ چینی تو خیر اپنے نقوش کی وجہ سے دور ہی سے پہچانے جاتے ہیں۔ پیلے رنگ' کالے بال۔ سیاہ یا براؤن آنکھیں۔ کوریا' ویت نام' فلپائن وغیرہ کے لوگوں کا بھی ان سے ملتا جلتا ناک نقشہ ہے۔ یورپ کے مختلف ملکوں سے آئے ہوئے لوگ بھی ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں۔ اب ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ کہاں کہاں سے لوگ یہاں آکر آباد ہوئے ہیں۔ اٹلی سے' یونان سے' ہنگری سے' چین سے' پرتگال سے' یوکرین سے' جاپان سے' پولینڈ سے' ہندوستان سے' پاکستان سے' جمیکا سے' آئرلینڈ اور انگلستان سے۔ فرانس سے جو آئے وہ کیوبک کے علاقے میں یکجا ہو گئے۔ اب عالم یہ ہے کہ ان میں سے ہر قوم کے لوگوں نے شہر میں اپنی بستیاں بسائی ہیں۔ یہ علاقے اپنے رہن سہن اور تہذیب و تمدن کے حوالے سے الگ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ہر جگہ کا ماحول اور فضا مختلف ہے۔

اگر ان سب کو ایک گھاٹ سے پانی پیتے ہوئے دیکھنا ہو تو ٹورنٹو کے مشہور و معروف شہر کنگسٹن مارکیٹ جا کر تماشا دیکھ لیجئے۔ سب سے پہلے تو آپ کو صفائی اور ماحول میں نمایاں فرق محسوس ہو گا اور پھر وہی نقشہ نظر آئے گا جو مشرق سے مخصوص ہے۔ چھوٹی چھوٹی دکانوں' ریڑھیوں اور فٹ پاتھوں پر مختلف قسم کے لوگ دکانیں سجائے بیٹھے ہیں اور بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں۔ بڑی عمر کی چینی عورتیں۔ پرتگالی دکان

دار خواتین سے بھاؤ تاؤ کر رہی ہیں۔ کچھ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اور کچھ اشاروں میں قیمت کم کرنے کے لئے بحث کرنے میں مصروف ہیں۔ چینی عورتوں کا تو لباس بھی الگ ہوتا ہے۔ پرتگالی خواتین پھل فروخت کر رہی ہیں۔ اس مارکیٹ میں آپ کو کیش کی مشینیں بھی نظر نہیں آتیں۔ دکاندار اور گاہک انگلیوں پر حساب کرتے ہیں یا دماغی طور پر جمع تفریق کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ایک جانب ایک صاحب بلند آواز میں چلا چلا کر سودا بیچ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے سامنے ایک ریڑھی میں سموسہ ٹائپ کے پیٹیز اور بیئر کی بوتلیں سجا رکھی ہیں۔ ایک جانب کالج کے طلبا پرانے کپڑے تلاش کر رہے ہیں۔ اسے یہاں کا لنڈا بازار سمجھ لیجئے۔ اٹلی کی خواتین اپنے جثے اور باتونی پن کے باعث دور ہی سے پہچانی جاتی ہیں۔ انہوں نے ایک بازو میں فروٹ کی تھیلیاں لٹکائی ہوئی ہیں اور بلند آواز میں باتیں کرتی ہوئی جا رہی ہیں۔ یہ شاید بیوائیں ہیں کیوں کہ انہوں نے سیاہ لباس پہن رکھے ہیں مگر بیوگی کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ انسان باتیں کرنا اور ہنسنا ہنسانا چھوڑ دے۔ اور وہ بھی اٹالین عورت۔ چینی لڑکے لڑکیوں کے گروہ آپس میں ہنسی مذاق میں مصروف ہیں اور ایک دوسرے کے سامنے فیشن کے مظاہرہ بھی کر رہے ہیں۔

یہ مارکیٹ ٹورنٹو میں اپنی قسم کی واحد مارکیٹ ہے جہاں مختلف ملکوں اور تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے شیرو شکر ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں' مگر ان لوگوں کی الگ الگ بستیاں بھی ہیں۔ ٹورنٹو میں رہنے والے جانتے ہیں کہ کون سے علاقے میں کون سی نسل کے لوگ رہتے ہیں۔ یہ آبادیاں خاصی بڑی ہیں اور کافی دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ "چائنا ٹاؤن" چینیوں کی شناخت ہے۔ جس ملک میں دیکھیے وہاں آپ کو "چائنا ٹاؤن" مل جائیں گے جہاں پہنچ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چین کے کسی شہر میں آ گئے ہیں۔ ہر طرف چینی مرد' عورتیں اور بچے۔ وہی ماحول' اسی قسم کی دکانیں۔ ہر طرف چینی زبان سنائی دیتی ہے۔ ٹورنٹو میں چینی لوگ جہاں رہتے ہیں اسے ڈنڈاس اسٹریٹ کہتے ہیں۔ باتھرسٹ اسٹریٹ میں جمیکا والوں کی آبادی ہے۔ مشرقی یورپ کے ملکوں سے تعلق رکھنے والے یا روبورد اسٹریٹ اور پارلیمنٹ اسٹریٹ میں رہتے ہیں۔ جیرارڈ اسٹریٹ پر بھی مشرقی یورپ والوں نے قبضہ جما رکھا ہے۔ ٹورنٹو میں مختلف نسلوں اور قوموں کے لوگوں کی خاصی بڑی تعداد آباد ہے۔ انہوں نے اپنا تشخص بھی قائم رکھا ہے۔ کینیڈا کی حکومت کی پالیسی بھی یہ ہے کہ ہر نسل کے لوگ اپنے آبائی وطن سے تعلق اور رشتہ قائم رکھیں۔ اپنے آبائی کلچر کی حفاظت کریں۔ حکومت کا خیال ہے کہ مختلف تہذیبوں کی آمیزش سے جو تہذیب جنم لے گی وہ ایک مثالی تہذیب ہوگی۔ مختلف زبانوں کے اخبارات اور جرائد شائع کرنے کے لئے بھی حکومت مالی امداد دیتی ہے۔ اردو کے کئی میگزین ٹورنٹو میں شائع ہوتے ہیں۔ کچھ تو حکومت کی مالی امداد ہوتی ہے اور تھوڑی بہت آمدنی اشتہارات سے ہو جاتی ہے' اس لئے یہ اخبار اور جرائد مفت میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ ہندوستانی اور پاکستانی اسٹورز میں یہ نمایاں جگہ پر رکھ دیے جاتے ہیں۔ خریداری کے لئے آنے والے اپنی پسند کے اخبار اور جریدہ لے جاتے ہیں۔ اردو فلم بنانے کے لئے بھی حکومت کی جانب سے امداد دی جا چکی ہے۔ بھارت والوں نے بھی حکومت سے مالی امداد لے کر فلم بنائی تھی۔ بعد میں حسب روایت پاکستان اور بھارت کے لوگوں نے ان مراعات کا ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیا جس کے بعد حکومت نے آہستہ آہستہ یہ مراعات اور سہولتیں کم کر دیں۔ ایک خاص بات یہ دیکھی کہ تہذیبی اور لسانی فرق کے باوجود یہ سب لوگ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں۔ غیروں سے ان کا میل جول بس ضرورت کے مطابق ہی ہوتا ہے۔

کینیڈا میں اپنے ٹیلی ویژن چینل بھی ہیں' مگر امریکی ٹیلی ویژن پروگرام بھی دیکھے جا سکتے ہیں' بلکہ شب و روز دیکھے جاتے ہیں۔ کوئی امریکی پروگرام ایسا نہیں ہے جو براہ راست نہ دیکھا جا سکتا ہو۔ چینل فور سے مختلف اقوام کی زبانوں کے پروگرام پیش کئے جاتے ہیں۔ یہی چینل فور بھارتی پروگرام بھی دکھاتا ہے۔ ہمیں نواب صاحب نے بتایا کہ چینل فور پر بھارتی پروگرام ضرور دیکھیں تاکہ ہمیں بھارتی پروگرام کے معیار کا اندازہ ہو سکے۔ چنانچہ ہم نے مقررہ دن ٹیلی ویژن پر چینل فور لگا دیا۔ بھارتی پروگرام ہفتے میں صرف دو دن پیش کیا جاتا تھا۔ ہم نے بڑے اشتیاق سے ٹی وی کا چینل بدلا اور انتظار میں بیٹھ گئے۔ مگر جب پروگرام دیکھا تو بے حد مایوسی ہوئی۔ اس پروگرام میں ایک تو مختصر سا انٹرویو ہوتا ہے۔ جو عموماً کسی بھارتی اداکار یا اداکارہ کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد کسی بھارتی فلم کی چند ریلیں پیش کی جاتی ہیں۔ کیوں کہ وقت کم ہوتا ہے اس لئے یہ فلم تین چار قسطوں میں دکھائی جاتی ہے۔ باقی وقت اشتہارات کی نذر ہو جاتا ہے۔ فلم تو خیر جیسی بھی تھی مگر انٹرویو خاصا مایوس کن تھا۔ اسٹوڈیو کے ایک چھوٹے سے کونے میں دو کرسیاں

رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کرسی پر چندر شیکھر براجمان تھے جو انٹرویو لے رہے تھے دوسری کرسی پر رشی کپور تشریف فرما تھے۔ سوالات انتہائی خشک اور بد مزہ تھے۔ جوابات بھی انہی کے مطابق تھے۔ مجموعی طور پر سخت بیزار کن پروگرام تھا' مگر بھارتی فلموں اور فلمی ستاروں کے رسیا بہت شوق سے اپنے پسندیدہ فنکاروں کو دیکھتے ہیں اس لئے تقریباً تمام بھارتی گھرانوں میں یہ پروگرام دیکھا جاتا ہے۔ پاکستانی بھی اپنا شوق پورا کرنے کے لئے یہ پروگرام ضرور دیکھتے ہیں۔ وہ تین پروگرام دیکھے تو ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ تو کوئی معیار ہی نہیں ہے۔ ایک پروگرام میں چندر شیکھر صاحب کی پتنی کسی اداکار کا انٹرویو لیتی ہوئی نظر آئیں۔ انہیں انٹرویو لینا اور سوالات کرنا ہی نہیں آتا تو انٹرویو میں بھلا کیا دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے۔ ہم نے چینل فور کے دفتر میں فون کیا اور کسی ذمے دار آدمی سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ہمیں سیکرٹری نے ملاقات کے لئے اگلے روز کا وقت دے دیا مگر ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا کہ آپ اگر اپنا اسکرپٹ اور پروپوزل تحریری شکل میں دیں گے تو بہت موثر ہو گا۔ ہم نے اسکرپٹ کا آئیڈیل اور مکمل تجویز مرتب کی اور ایک خوشنما فائل بنا لی۔ دوسرے دن ہم گاڑی میں بیٹھے اور "چینل فور" کے دفتر پہنچ گئے۔ خاصا عالی شان دفتر ہے۔ مختلف راستوں اور لوگوں سے گزرتے ہوئے ہم ڈائریکٹر صاحب کے دفتر میں پہنچ گئے۔ باہر ان کی سیکرٹری تشریف فرما تھیں جنہوں نے ہمارا کارڈ فوراً اندر پہنچا دیا اور پھر مسکراتی ہوئی باہر آئیں اور مطلع کیا کہ بس چند منٹ بعد آپ کی باری آ جائے گی۔ اچھی خوش شکل خاتون تھیں۔ کینیڈا کے لوگ بھی امریکی لب و لہجے میں انگریزی بولتے ہیں۔ انداز گفتگو اور تلفظ بھی ویسا ہی ہے اس لئے ہمیں ان کی بات سمجھنے میں مطلق دشواری پیش نہیں آئی۔

انہوں نے کہا "کافی تو آپ کو وہ پیش کر ہی دیں گے اس لئے میں آپ کو پیش نہیں کر رہی۔"

ہم ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر انہیں کام کرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ دفتر خاصا شاندار تھا۔ فرش پر قالین' دیواروں پر تصاویر' قیمتی فرنیچر۔ ظاہر ہے یہ ایک کینیڈین ٹیلی ویژن کا دفتر تھا۔ چند منٹ بعد سیکرٹری نے ہمیں بتایا کہ آپ اندر جا سکتے ہیں۔ ہم اپنے کاغذات سنبھال کر ڈائریکٹر کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ سامنے دیکھا تو چہرہ شناسا نظر آیا۔ ذرا غور کیا تو یاد آیا کہ یہ تو چندر شیکھر صاحب ہیں جو بھارتی ٹیلی ویژن پروگرام پیش کرتے ہیں اور بھارتی اداکاروں کے انٹرویو بھی کرتے ہیں۔ دیکھنے میں وہ اور بھی کم عمر نظر آئے۔ بہت اخلاق اور تپاک سے ملے۔ کافی کے لئے سیکرٹری کو فون پر بتایا اور پھر ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ ہم نے اپنا کارڈ تو پہلے ہی پہنچا دیا تھا۔ اب گفتگو شروع کی اور بتایا کہ ہم بھی ایک اردو پروگرام پیش کرنے کے خواہش مند ہیں۔

وہ بولے "ضرور' شوق سے کیجئے آپ اپنے پروگرام کے لئے جتنا وقت لینا چاہتے ہیں لے لیں۔ مگر پہلے اسپانسر تو ڈھونڈیں خاصا مشکل کام ہے۔" پھر انہوں نے بہت لمبا چوڑا بھاشن دیا کہ کینیڈا میں کام کرنا کتنا دشوار ہے اور ٹی وی پر پروگرام پیش کرنا تو اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ ان کی گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ آپ یہ خیال چھوڑ دیں۔ یہ آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ کینیڈا ہے۔ یہاں معیار بہت اونچا ہے اور دیکھنے والے بھی اونچا معیار ہی مانگتے ہیں۔ ہم نے سوالات کئے تو معلوم ہوا کہ جب سے یہ چینل فور قائم ہوا ہے وہ اس کے ڈائریکٹر ہیں اور کسی پاکستانی کو پاس بھی نہیں پھٹکنے دیں گے۔ کچھ دیر تو ہم خاموشی سے ان کی باتیں سنتے رہے۔ کافی پیتے رہے۔ ان کی ڈینگیں بھی برداشت کرتے رہے۔ پھر جب انہوں نے بہت ہی زیادہ سرپرستانہ اور برتری کا رویہ اختیار کیا تو ہمارا برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

ہم نے ان سے کہا "سنئے شیکھر صاحب! ہمیں پتا ہے کہ یہ کیا کام ہے اور کیسے ہوتا ہے۔ ہم فلمیں بناتے رہے ہیں۔ کینیڈا میں کیا معیار ہے یہ بھی جانتے ہیں۔ ہم نے آپ کا ٹی وی پروگرام بھی دیکھا ہے اور سخت مایوس ہوئے ہیں۔ معاف کیجئے اس قدر گھٹیا پروگرام تو ہمارے پاکستان ٹی وی نے آغاز میں بھی پیش نہیں کیا تھا۔ اس سے ہزار درجہ اچھا پروگرام انہوں نے پاکستان میں بیٹھ کر مرتب کیا اور ساری دنیا میں پاکستان ٹی وی پروگراموں کی دھوم مچ گئی ہے۔ آپ سوائے ایک فلم کی چند ریلیں اور ایک انتہائی بھونڈا انٹرویو دکھانے کے اور کیا پروگرام پیش کرتے ہیں؟ انٹرویو بھی ایسا کہ سوالات بھی کرنے نہیں آتے۔ سارا اسٹوڈیو چھوڑ کر ایک دیوار کے سامنے دو کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں اور ایسے سوالات کرتے ہیں کہ جو اسکول کا بچہ بھی نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ آپ کیا پیش کرتے ہیں؟ اور اس پروگرام کو پیش کرنے میں آپ کو کیا مشکل در پیش ہے؟

ایسے پروگرام تو ہم دن میں دس بنا سکتے ہیں۔"

چندر شیکھر صاحب ہماری باتیں منہ کھولے سنتے رہے۔ دراصل وہ بوکھلا گئے تھے۔ ہماری تلخ کلامی کا سبب یہ تھا کہ ایک تو انہوں نے انتہائی رعونت آمیز "سرپرستانہ" رویہ اختیار کیا تھا۔ دوسرے ان کی باتیں سن کر ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ اس شخص کے ہوتے ہوئے چینل فور پر ہماری دال نہیں گلے گی۔ وہ شخص کسی پاکستانی کو اس ادارے میں قدم دھرنے کی جگہ دینے کو تیار نہیں تھا۔ اس لئے کیوں نہ اپنے دل کی بھڑاس تو نکال لی جائے۔ ہماری تقریر ختم ہوئی تو چندر شیکھر صاحب کچھ سنبھل کر بیٹھ گئے اور نہایت میٹھے لہجے میں بولے "آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو گئے ہیں۔"

ہم نے کہا "ناراضی کی بات نہیں ہے۔ ہم نے آپ کو صحیح صورت حال بتائی ہے۔"

وہ خاموشی سے مسکرا کر رہ گئے۔ پھر کہنے لگے "دراصل آپ یہاں کی مشکلات کو نہیں سمجھتے۔"

ہم نے اردو میں کہا "شیکھر صاحب' آپ اچھی اردو بول لیتے ہیں اور اس میں کہیں کہیں ہندی کا پیوند بھی لگا لیتے ہیں۔ کیوں نہ ہم دونوں اردو میں بات چیت کریں۔"

وہ ہنس کر اردو میں بولے" آپ نے ٹھیک کہا مجھے تو یہ خیال ہی نہیں آیا تھا۔ آیئے ہم ہندی میں بات کرتے ہیں۔"

جسے وہ ہندی کہہ رہے تھے وہ خالص اردو تھی۔ بہت سلیس اردو میں بات کر رہے تھے۔ بعد میں انہوں نے بتایا کہ وہ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ ان کی مسز بھی لکھنؤ کی رہنے والی ہیں۔ پھر تو وہ اتنے موڈ میں آگئے کہ اردو کے دو چار شعر بھی پڑھ گئے۔

ہم نے کہا "شیکھر صاحب! آپ اتنی اچھی اردو بول رہے ہیں۔ اشعار بھی اردو کے پڑھ رہے ہیں پھر بھی آپ اس زبان کو ہندی کہنے پر اصرار کر رہے ہیں حالانکہ اردو آپ کی مادری زبان ہے۔"

بولے "چھوڑیئے میری ماں کی بات نہ کیجئے۔ وہ تو فارسی بھی جانتی تھی۔"

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد ہم نے ان سے اجازت طلب کی۔ وہ دروازے تک ہمیں چھوڑنے آئے۔ پھر چلتے چلتے کہنے لگے "میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے لئے مانٹریال میں بہت اچھے چانسز ہیں میری مانئے تو آپ مانٹریال چلے جائیں۔"

اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ مانٹریال میں ایک تو فرنچ بولنے والوں کا بہت زور ہے۔ دوسرے اتنی بڑی تعداد میں پاکستانی نہیں ہیں جو ہمارے ٹی وی پروگرام کو اسپانسر کر سکیں مگر لالہ جی نے ازراہ ہمدردی ہمیں مشورہ ضرور دے دیا تھا اور ہمیں ان کی ذہنیت پر رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا۔

جانی لمبارڈی کے بارے میں خالق صاحب نے ہمیں بتایا تھا کہ ایک دو روز میں پیرس سے واپس آتے ہی وہ جانی کے ساتھ ہماری ملاقات کا بندوبست کریں گے۔ خالق صاحب پیرس چلے گئے۔ اب ہم تھے اور ٹورنٹو کا گشت۔ اسی شام ہمیں ٹورنٹو میں مقیم ایک پاکستانی دوست کی جانب سے یہ پیغام ملا کہ پاکستان سے فن کاروں کا ایک گروپ آیا ہوا ہے اور کالج کے ہال میں اپنا پروگرام پیش کر رہا ہے۔ اتنے عرصے کے بعد پاکستانی فنکاروں کا نام سنا تو ہمیں بھی اشتیاق پیدا ہونے لگا۔ ان صاحب نے تفصیل نہیں بتائی تھی کہ کون کون فن کار آئے ہوئے ہیں۔ کالج کا راستہ ہمیں معلوم تھا۔ کئی بار ہم اس طرف سے گزر چکے تھے۔ چنانچہ سرشام اپنی کار میں سوار ہوئے اور منزلِ مقصود کی جانب چل پڑے۔ ابھی ہم دو چار میل ہی گئے ہوں گے کہ اچانک پیچھے سے ایک کار کا ہارن سنائی دیا۔ ان ملکوں میں کار کا ہارن محض ہنگامی حالات میں بجایا جاتا ہے۔ پیچھے والی کار ہارن بجاتی ہوئی ہم سے آگے نکل کر کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔ کار کی کھڑکی سے ایک موٹا سا بازو باہر نکلا جس نے ہمیں ایک جانب رکنے کا اشارہ کیا۔ ہم نے کار ایک طرف کھڑی

کردی مگر حیران تھے کہ ماجرا کیا ہے۔ سامنے والی کار کا پچھلا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک گول مٹول شخص برآمد ہو کر ہماری کار کی طرف بڑھا۔ غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ مزاحیہ اداکار ننھا ہیں۔

ننھا اور کینیڈا کے شہر ٹورنٹو کی ایک سڑک پر؟ پہلے تو آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ پھر سوچا کہ ننھا تو مشکل سے فرشتوں نے ایک ہی نمونہ بنایا ہے۔ بھلا ایسا دوسرا نمونہ کہاں بن سکتا ہے؟ کچھ نیم دلی سے ہم بھی کار سے اترے۔ اتنی دیر میں وہ صاحب گولے کی مانند ہماری جانب لپکے آ رہے تھے۔ مزید نزدیک آئے تو معلوم ہوا کہ واقعی ننھا ہی ہیں۔ خوشی سے ان کی باچھیں تو کھل ہی رہی تھیں مگر ہمارا دل بھی باغ باغ ہو گیا وطن سے دور سات سمندر پار یکایک کسی ہم وطن سے ملاقات کسی خزانے کی دریافت سے کم اہمیت نہیں رکھتی اور پھر اگر وہ ہم وطن ننھا ہو تو پھر خوشی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ابھی ہم اپنی خوشی کا اظہار کرنے کا طریقہ سوچ رہے تھے کہ انہوں نے ہمیں اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور ہمیں یقین آگیا کہ واقعی وہ ننھا ہی تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کی شلوار قمیص میں ملبوس' خوشبو میں بسے ہوئے' سراپا لطیفوں اور دلچسپیوں کا بنڈل۔ بغل گیر ہونے کے بعد انہوں نے آمنے سامنے آکر ہم سے ملاقات کی اور لگے ادھر ادھر کی باتیں کرنے یہاں کب سے آئے ہوئے ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟ امریکہ سے کب پہنچے؟ پاکستان کب جائیں گے؟ وغیرہ وغیرہ ہم ان سے پوچھ رہے تھے کہ وہ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ کب آئے؟ کب تک ٹھہریں گے؟ پاکستان سے کب آئے اور وہاں کا کیا حال ہے؟

ابھی سوالوں کے جواب نامکمل ہی تھے کہ ہمیں احساس ہوا کہ ہمارے آس پاس کا ٹریفک تھم گیا ہے اور بے شمار کاروں والے اپنی کھڑکیوں سے منہ باہر نکال کر ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ ہمارا ملک ہوتا تو اب تو ہارنوں کا شور اور برا بھلا کہنے کی آوازوں سے سارا شہر گونج اٹھا ہوتا اور ٹریفک جام رونما ہو چکا ہوتا۔ مگر یہ کینیڈا کا شہر ٹورنٹو تھا اس لئے سب کاروں والے اپنی اپنی لین میں کھڑے بڑے صبر کے ساتھ ہم دونوں کو سڑک کے بیچوں بیچ ٹریفک بلاک کئے ہوئے دیکھ رہے تھے مگر دل ہی دل میں ہمیں یقیناً برا بھلا کہہ رہے ہوں گے۔

ہم نے ان کی توجہ ٹریفک کی رکاوٹ کی جانب مبذول کروائی تو وہ مسکرا کر بولے

"ان لوگوں کو کیا پتا کہ پردیس میں اپنوں سے مل کر کتنی خوشی ہوتی ہے۔ یہ تو سچی خوشی اور سچے غم سے بھی محروم لوگ ہیں۔"

مگر اب ارادہ کدھر کا ہے؟ ہم نے پوچھا۔

بولے "آپ کو معلوم نہیں؟ یہاں کسی سکول کے ہال میں ایک فنکشن ہو رہا ہے جس میں ہم پاکستانی فن کار حصہ لیں گے۔ میرے علاوہ مہناز اور عالم گیر بھی آئے ہوئے ہیں۔ امریکا سے ہو کر آئے ہیں۔"

ہم نے کہا "مہناز اور عالم گیر تو خیر گانا گائیں گے مگر آپ کیا کریں گے؟"

بولے "میں شامل باجے کے طور پر ساتھ آیا ہوں۔ بس ذرا اناؤنسمنٹ کر دیتا ہوں لطیفے وغیرہ سنا دیتا ہوں۔ بعض اداکاروں کی نقلیں کر دیتا ہوں۔ میں جن پاکستانیوں کے ہمراہ ٹھہرا ہوا ہوں وہ اس اسکول کا راستہ بھول گئے ہیں۔"

ہم نے کہا "آپ لوگ ہمارے پیچھے پیچھے چلے آئیں۔

ہم بھی وہیں جا رہے ہیں اور باقی باتیں وہیں جا کر ہوں گی۔"

ہم اپنی کار میں اور ننھے صاحب اپنے میزبانوں کی کار میں آگے پیچھے روانہ ہوئے دراصل ہمیں ٹورنٹو میں رہتے ہوئے اتنے دن ہو چکے تھے اور ہم نے اتنی زیادہ آوارہ گردی کی تھی کہ یوں لگتا تھا جیسے ہم ہمیشہ سے ٹورنٹو ہی میں رہتے آئے ہیں۔

اسکول کی عمارت کافی وسیع تھی اور ہال تو بہت ہی زیادہ شاندار تھا۔ ہزار بارہ سو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی اور اسٹیج وغیرہ بھی بنا ہوا تھا۔ اسکول کے ہال تک پہنچتے پہنچتے ہم تین تیرہ ہو گئے۔ ننھا کو منتظمین پکڑ کر لے گئے۔ ہمیں کچھ پاکستانی حضرات و خواتین مل گئے۔ ہال میں بہت بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ عورتیں بچے اور پاکستانیوں کے علاوہ تھوڑے سے کینیڈین بھی تھے۔ اس کے ساتھ ہی کچھ سردار جی بھی نظر آئے۔ کسی نے ہمیں بتایا کہ آج ہی کے دن ایک اور پاکستانی تنظیم نے بھی ٹورنٹو میں کسی جگہ اپنا پروگرام رکھ لیا ہے۔

"وہ کس لئے؟" ہم نے پوچھا۔

"اس لئے تاکہ یہ فنکشن کامیاب نہ ہو سکے"

بیرونی ملکوں میں جہاں جہاں پاکستانی خاصی بڑی تعداد میں موجود ہیں وہاں ہم نے یہ

دیکھا ہے کہ لوگوں نے درجنوں انجمنیں بنا رکھی ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف مصروف عمل ہیں بھارتی باشندوں کو ہم نے اس مرض میں مبتلا نہیں دیکھا پاکستانی حضرات یہ سب اس لئے کرتے ہیں کہ ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنانے کا خواہاں ہے۔ دوسرے کی لیڈری برداشت نہیں کرتا اور پھر اس طرح مالی فائدے بھی اٹھاتے ہیں۔ کینیڈا میں تو حکومت کی جانب سے مختلف نسلی انجمنوں کو مالی امداد بھی فراہم کی جاتی ہے اس لئے سر پھٹول زیادہ ہے۔ بہرحال دوسرے پروگرام کے باوجود کافی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ اگر شہر میں ایک فنکشن ہوتا تو ظاہر ہے کہ تمام پاکستانی وہیں اکٹھے ہو جاتے۔

پروگرام شروع ہوا تو ننھا صاحب کا تعارف کرایا گیا اور پھر تالیوں کی گونج میں وہ اسٹیج پر تشریف لائے۔ خاصی دلچسپ باتیں سنائیں۔ لطیفے، نقلیں، چٹکلے۔ پھر ممتاز نے نغمہ سرائی کی عالم گیر گانے کے لئے اسٹیج پر آئے تو انہوں نے سب سے پہلے جو گیت سنایا وہ ہماری فلم "جاگیر" کا تھا اور یہ فلموں کے لئے عالم گیر کا سب سے پہلا نغمہ تھا۔ وقفے میں ہم اسٹیج کے پیچھے گئے اور ان دونوں سے بھی ملے۔ عالم گیر نے کہا کہ سر میں جب بھی باہر پروگرام کرتا ہوں تو آغاز اسی نغمے سے کرتا ہوں کیوں کہ یہ میرا پہلا فلمی گیت ہے۔ آٹو گراف لینے والے بچے بھی پہنچ گئے۔

ننھا کہنے لگے "مجھے تو لکھنا ہی نہیں آتا۔ صرف انگوٹھا لگا سکتا ہوں۔"

ایک بچہ نہ جانے کہاں سے ایک مہریں لگانے والا پیڈ لے کر آ گیا اور بولا "انکل لائیے انگوٹھا"

انکل اتنے شرمندہ ہوئے کہ فوراً آٹوگراف دینے پر آمادہ ہو گئے۔

ایک لڑکی نے ننھا سے پوچھا "آپ تو خیر کامیڈین ہیں اس لئے موٹے ہیں، مگر ممتاز اتنی موٹی کیوں ہیں؟"

انہوں نے سنجیدگی سے جواب دیا "بیٹے! بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں دولت اور خوراک کی تقسیم برابر نہیں ہے۔ کسی کو زیادہ مل جاتا ہے اور زیادہ تر کو بہت کم۔ اب مثال کے طور پر آپ دیکھ لیجئے۔ ہم دونوں کو زیادہ خوراک مل رہی ہے اور آفاقی صاحب بے چارے کے حصے میں چند نوالے ہی آتے ہیں۔

یہ پروگرام رات گئے تک جاری رہا آخر میں اونٹاریو کے وزیر ثقافت نے سب مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور حکومت کی جانب سے منتظمین کی خدمت میں ایک چیک بھی پیش کیا۔ ننھا وغیرہ کو اگلے دن اپنی اگلی منزل کی جانب روانہ ہو جانا تھا اس لئے الوداع کہہ کر رخصت ہو گئے۔ ننھا نے ہمیں یہ خوش خبری سنائی کہ ان دنوں ہمارے ملک میں مار دھاڑ اور خونریزی والی فلموں کا دور ختم ہو رہا ہے۔ کامیڈی اور رومانی فلمیں مقبول ہو رہی ہیں۔

کہنے لگے "آپ جن فلموں سے گھبرا کر آ گئے تھے اب ان کا رواج ختم ہو گیا ہے۔ یہ سننے کے بعد واپس لوٹ آئیے۔ آپ کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

اگلے روز ہمیں "آئی لینڈ" جانا تھا۔ یہاں جانے کے لئے بحری جہاز استعمال کئے جاتے ہیں اور سیاحوں کا ہجوم ان پر جمع رہتا ہے۔ یہ جہاز یوں تو چھوٹے ہوتے ہیں مگر ایک بڑے بحری جہاز کی تمام خصوصیات اس میں موجود ہوتی ہیں اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ سیاحوں اور گورے لوگوں کا اژدہام۔ جھیل پر بندرگاہیں بنی ہوئی ہیں۔ حد نگاہ تک پانی نظر آتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے سمندر میں مصروف سفر ہوں۔

یہ جزیرہ انتہائی خوب صورت تفریح گاہ ہے۔ چھوٹے بڑے ہر ایک کی تفریح کا سامان یہاں موجود ہے۔ مختلف قسم کے کھیل تماشے' جھولے' گیمز' کشتی رانی' گھوڑ سواری اور بچوں کے لئے فن لینڈ قسم کی چیزیں بھی فراہم کی گئی ہیں۔ الیکٹرک چیئرز بھی ہیں' جزیرے میں مختلف قسم کا ماحول پیدا کیا گیا ہے۔ کہیں جنگل ہیں' کہیں چشمے اور آبشار نظر آتے ہیں۔ سبزہ زار اور خوب صورتی سے اٹے ہوئے درخت عجیب بہار دکھاتے ہیں۔ پھولوں کی بہتات ہے۔ اس جزیرے سے ٹورنٹو کا منظر نہایت شاندار ہے۔ اونچی اونچی سربہ فلک عمارتیں اور درمیان میں جھیل' غروب آفتاب کے وقت جب آسمان پر شفق رنگ ہوتا ہے تو یہ عجیب سماں ہوتا ہے۔ یہاں سیاحوں اور مقامی لوگوں کا ایک ہجوم رہتا ہے۔ کھانے پینے کے لئے مختلف قسم کے صاف ستھرے ریستوران' چائے خانے اور آئس کریم پارلر بھی موجود ہیں۔ ہر عمر کے لوگ تفریح کے موڈ میں ہنستے کھیلتے نظر آتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے مصائب بھری دنیا سے الگ تھلگ یہ خطہ ایک نئی اور مختلف دنیا ہے جہاں خوشیاں ہیں' قہقہے ہیں۔ رنگ و بو کے نظارے ہیں۔ بے فکر اور خوش باش لوگوں کے جمگھٹے ہیں۔ صاف ستھرے' رنگا رنگ ملبوسات پہنے ہوئے لوگ ہیں' ایسی جگہوں پر پہنچ کر بار بار یہ خیال دل کو اداس کر دیتا ہے کہ آخر یہ سب نعمتیں اور رنگینیاں

ہمارے ملک میں کیوں نہیں ہیں؟ ہمارے شہروں میں رہنے والوں کی قسمت میں یہ سب کچھ کیوں نہیں ہے؟ دنیا بھر کے غم' مصائب' مسائل اور دکھ ہمارے لوگوں کے حصے میں کیوں آ گئے ہیں؟ دنیا جہان کی روشنیاں دوسروں کے لئے اور اندھیرے ہمارا مقدر بن کر کیوں رہ گئے ہیں؟ ایک حساس دل کے لئے بیرونی ملکوں کے ان مناظر کو دیکھ کر ایک عجیب سی محرومی اور رشک کے جذبات کا احساس ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی فکر اور پریشانی ان لوگوں کو چھو کر بھی نہیں گزری ہے۔ ہنستے کھیلتے' موج اڑاتے ہوئے جوڑے آخر ہمارے ملک میں کیوں نظر نہیں آتے؟ تندرست اور صحت کی تازگی سے دمکتے ہوئے چہروں والے غیروں ہی کے کیوں ہوتے ہیں؟ حسن و جمال کی رعنائیاں ہمارے شب و روز کو کیوں نہیں جگمگاتی ہیں؟

خیر چھوڑیے ان خیالات کو۔ یہ دیکھئے سامنے کیا ہو رہا ہے؟ پیڈل سے چلنے والی کشتیوں میں بیٹھے ہوئے لوگ اس میں حصہ لے رہے ہیں۔ چھوٹے' بڑے' بوڑھے' جوان' عورت' مرد کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ یکایک دو پلاسٹک کی کشتیاں آپس میں ٹکرائیں اور ان میں سوار لڑکیاں پانی میں گر گئیں۔ فوراً دو غوطہ خوروں نے پانی میں چھلانگ لگا دی اور آس پاس کی کشتیوں والوں نے امداد کے لئے ان کی جانب رخ کر لیا' مگر وہ سب بہت اچھی پیراک ہیں۔ مچھلیوں کی مانند تیرتی ہوئی آپ ہی آپ کنارے میں پہنچ گئیں جہاں بڑے بڑے تولئے سنبھالے ہوئے محافظوں کا ایک دستہ موجود ہے۔ قہقہوں اور تالیوں کے شور میں ایک بار پھر سب اپنے اپنے شغل میں مصروف ہو گئے ہیں۔ شام ڈھلے جزیرے سے واپسی ہوئی تو ٹورنٹو کی روشنیوں کا منظر کچھ عجیب ہی بہار دکھا رہا تھا۔ سربہ فلک عمارتیں روشنیوں میں جگمگا رہی تھیں۔ بعض عمارتیں شیشے کی ہیں۔ ان پر دوسری روشنیوں اور شفق کے عکس جھلملا رہے تھے۔ ایک بہت اونچی عمارت شیشوں کی بنی ہوئی نظر آتی ہے۔ کافی مشہور عمارت ہے جس کا نام ہمیں یاد نہیں آ رہا۔ مگر سب سے الگ تھلگ نظر آتی ہے۔ ٹورنٹو کی "اسکائی لائن" ایک ماڈرن اور خوش حال شہر کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ جدھر دیکھئے اونچی اونچی عمارتیں سر اٹھائے ہوئے کھڑی ہیں۔ شہر کی آبادی مشکل سے بیس بائیس لاکھ ہے۔ جزیرے سے چھوٹے جہاز نے ہمیں ٹورنٹو پہنچا دیا۔ جہاں ہماری کار منتظر تھی۔ رات کے وقت شہر کی رونق کچھ زیادہ ہو

جاتی ہے۔ ٹریفک کا ہجوم ہے مگر انتہائی نظم و ضبط کے ساتھ کیا مجال جو کوئی ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی کر جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چوکسی کرنے والے ہر دم چوکنا رہتے ہیں۔ یقین نہ ہو تو آزما لیجئے۔ جیسے ہی خلاف ورزی کے مرتکب ہوں گے ٹریفک کا سپاہی یا ٹریفک پولیس کار آپ کو رگ جاں سے بھی نزدیک تر نظر آئے گی۔

گھر پہنچے تو نواب خالق منتظر تھے۔ وہ اسی شام یورپ سے واپس آئے تھے اور اپنے ہمراہ بے شمار کہانیاں اور لطیفے لائے تھے۔ نواب صاحب کی ایک خوبی یہ ہے کہ خالص مشرقی ہیں مگر باہر سے ٹھیٹ یورپین نظر آتے ہیں۔ وہی قدو قامت' ویسا ہی رنگ اور ڈھنگ' عادات و اطوار تو ان کی یورپ جانے سے پہلے ہی انگریزوں والی تھیں۔ اب سونے پہ سہاگا سمجھ لیجئے۔ انگریزوں کی محفل میں ان سے بڑھ کر انگریز نظر آتے ہیں اور مشرقی محفل میں یوں لگتے ہیں جیسے پرانے لکھنؤ کی کسی حویلی سے اٹھ کر آ گئے ہیں۔ انہوں نے یہ اطلاع دی کہ اگلے روز جانی لمبارڈی سے ملاقات کا وقت طے ہو گیا ہے۔ دوپہر کو لنچ پر ملاقات ہو گی۔ جانی صاحب کو اسی روز امریکا اور اٹلی روانہ ہونا تھا مگر مصروفیات میں سے بمشکل لنچ کے لئے انہوں نے کچھ وقت نکال لیا۔ آخر نواب عبدالخالق کا دل رکھنا بھی ضروری تھا۔ یہ طے پایا کہ دوسرے دن دوپہر کو نواب صاحب دفتر سے گھر آ جائیں گے اور پھر ہم دونوں اپنی اپنی کاروں میں جانی لمبارڈی کے دفتر جائیں گے۔

"مگر کاروں کی یہ فضول خرچی کس لئے؟ ایک ہی کار میں کیوں نہیں؟" ہم نے پوچھا۔

بولے "حضور بہت ممکن ہے کہ آپ کو مزید بات چیت کے لئے وہاں رکنا پڑے۔ خاکسار اپنے دفتر چلا جائے گا۔ آپ جب چاہیں واپس آ سکتے ہیں۔" اب ذرا غور فرمایئے۔ نواب صاحب کی کس کس خوبی کی تعریف کی جائے؟ دور اندیشی تو ان پر ختم ہے۔ بولے "جی ہاں' مجھ تک آتے آتے ختم ہو گئی۔" انکسار اور فروتنی کا عالم ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ بلاوجہ تو جگت نواب مشہور نہیں ہوئے ہیں۔

اگلے دن ہم نے تھری پیس سوٹ نکال کر زیب تن کیا۔ نئی ٹائی گلے میں باندھی جوتا خوب رگڑ رگڑ کر چمکایا۔ خوشبو بھی لگائی۔ یہ تیاریاں دیکھ کر ہماری بیگم پوچھنے لگیں "جانی لمبارڈی سے بزنس کی بات کرنے جا رہے ہیں یا کسی ڈیٹ پر جا رہے ہیں؟"

ہم نے کہا "تم نے غور نہیں کیا۔ اس کے نام کا آغاز ہی جانی سے ہوتا ہے۔ آخر پیش بندی بھی کوئی چیز ہے"

ٹھیک ساڑھے بارہ بجے ہم نے زمین دوز پارکنگ سے اپنی کار نکالی اور باہر سڑک کے کنارے نواب صاحب کا انتظار کرنے لگے۔ نواب صاحب بھی سوئس گھڑی کی سوئی کے مانند عین وقت پر کھٹ سے نمودار ہو گئے اور ہم نے ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ نواب صاحب کے ایک کناڈین معاون بھی ان کے ہمراہ تھے۔ یہ صاحب نہ صرف دفتری معاملات میں بلکہ گھریلو اور ذاتی معاملات میں بھی نواب صاحب کے معاون تھے۔ کون سا کام تھا جو انہیں نہیں آتا تھا۔ خاص طور پر جب نواب صاحب کسی خاص مہم پر نکلتے تھے تو یہ ان کے ہمرکاب ضرور ہوا کرتے تھے۔

ٹورنٹو کے بیچوں بیچ ایک مصروف سڑک پر جانی لمبارڈی کا دفتر تھا۔ گھڑی کی سوئی کے مانند ہم بالکل صحیح وقت پر وہاں پہنچے تھے۔ جانی لمبارڈی کی خوش ادا سیکرٹری ہم لوگوں کی منتظر تھیں۔ انہوں نے اپنے دستِ حنائی پر بندھی ہوئی سنہری گھڑی کی جانب دیکھا اور ان پر کسی مسکراتی ہوئی ہیروئین کا گمان گزرتا تھا۔ نواب صاحب سے ان کی پرانی یاد اللہ تھی۔ انہوں نے ہمارا تعارف کرایا تو انہوں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ ہمارے ہاں تو مردوں سے بھی مصافحہ کرنے کا زیادہ رواج نہیں ہے۔ زیادہ تر "السلام علیکم" سے کام چلایا جاتا ہے' مگر یورپ اور امریکہ میں قدم قدم پر ہاتھ ملانا پڑتا ہے۔ اس میں مرد عورت کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ جس معاشرے میں عورت کو غور سے دیکھنا بھی برا سمجھا جاتا ہو اس میں رہنے والا کوئی شخص دیارِ مغرب میں جا کر بات بات پر عورتوں سے ہاتھ ملانے پر مجبور ہو جائے تو اسے آپ کیا کہیں گے؟ نواب صاحب نے اس کا جواب دیا تھا "اسے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا" کہیں گے۔

جتنی دیر اس حسینہ کا ہاتھ ہمارے ہاتھ میں رہا نواب صاحب نے ہمارا مختصر مگر مفصل تعارف کروایا۔ تمام گفتگو سن کر وہ مسکرائیں اور بولیں۔ "یوں کہئے کہ ہمارے شو بزنس کے قبیلے سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ بہت بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" ان کا لب و لہجہ خالص امریکن' کینیڈین تھا' مگر آواز میں ایک بھاری پن تھا جس سے خیال ہوتا تھا کہ کسی زمانے میں ان کے آباؤ اجداد یقیناً اٹلی سے آ کر یہاں آباد ہوئے ہوں گے۔ بعد

میں پتا چلا کہ ہمارا اندازہ بالکل درست تھا۔ ان کے انداز میں جو بے تکلفی' بے پروائی اور کاہلی سی تھی وہ اس بات کی تصدیق تھی کہ ہو نہ ہو یہ خاتون اطالوی ہیں یا ان کے خون میں کچھ قطرے اطالوی خون کے ضرور موجود ہیں۔ ان کا نام مس جینی یا فینی تھا۔ ٹھیک سے یاد نہیں رہا۔ انہوں نے ہمارا ہاتھ تھامے تھامے ایک کمرے کی جانب قدم بڑھائے مگر وہاں تک پہنچنے سے پہلے آٹو میٹک بے آواز دروازہ کھلا اور سامنے ایک متوسط عمر کا شخص نمودار ہوا۔ اس نے پتلون کے ساتھ جیکٹ پہن رکھی تھی۔ قمیص کا کالر کھلا ہوا تھا۔ درمیانی قد' مناسب ڈیل ڈول' بالوں میں سفیدی کی آمیزش' سرخ و سفید چہرے پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ اور آنکھوں میں شرارت آمیز چمک۔

اس شخص نے نواب صاحب کو دیکھتے ہی دونوں ہاتھ آگے بڑھائے اور کہا "اوہ عبدل' کس قدر مسرت ہوئی ہے تمہیں دیکھ کر" آگے بڑھ کر اس نے نواب صاحب کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لئے اور ہنستے ہوئے ان کے چہرے پر نظر ڈالی۔ "ذرا سی بھی تو تبدیلی نہیں ہوئی۔ سب کچھ وہی' بالکل وہی۔"

نواب صاحب نے کہا "ہیلو جانی! تم ہر بار ملنے پر اتنی خوشی کا اظہار کرتے ہو کہ مجھے بھی اخلاقاً ایسا ہی کرنا پڑ جاتا ہے۔ ان سے ملو۔ میرے بہت عزیز دوست۔ پاکستان سے آئے ہیں۔"

جانی نے ان کے دونوں ہاتھ چھوڑ کر ہماری جانب دونوں ہاتھ بڑھا دیے۔ ظاہر ہے کہ ہمیں بھی دونوں ہاتھ آگے کرنے پڑے۔ جانی لمبارڈی نے ہمارے دونوں ہاتھ اپنے مضبوط مگر نرم ہاتھوں میں تھام کر ایک قہقہ لگایا اور کہا "بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر۔ بہت اس لئے کہ عبدل کے دوست ہو۔" پھر وہ ہمارے ہاتھ پکڑے ہوئے اس دروازے کی جانب بڑھے جس میں سے ہم اندر داخل ہوئے تھے۔ "وقت بہت کم ہے اس لئے ہم سیدھے ریستوران میں چلیں گے۔"

باہر نکل کر سڑک کے دوسری جانب ایک خوبصورت ریستوران تھا۔ ہم لوگ پیدل چلتے ہوئے ریستوران میں داخل ہو گئے۔ ویٹریس لڑکیوں نے مانوس سی شناسا مسکراہٹوں کے ساتھ جانی کا خیر مقدم کیا۔ جس سے اندازہ ہوا کہ یہاں عموماً آمدورفت رہتی ہے۔ ایک گوشے میں لمبی سی میز ہم لوگوں کے لئے ریزرو تھی۔ ہمارے میز تک پہنچنے سے پہلے ہی اچانک دس بارہ لوگ نہ جانے کہاں سے نمودار ہوئے اور میز کی جانب بڑھے۔ یہ سب کے سب جانی کے اسٹاف کے ارکان تھے۔ ان میں دو خواتین اور ایک بھارتی مرد۔ جانی نے ان سب سے ہمارا تعارف کرایا خاص طور پر بھارتی صاحب سے۔ "ان سے ملو۔ یہ لالی ہیں۔ ہماری انڈین نشریات کے انچارج۔ تمہیں انہی سے زیادہ تر واسطہ پڑے گا۔"

مسٹر لالی بھاری جسم اور درمیانہ قد کے ایک سانولے اور ہنس مکھ آدمی تھے۔ عمر میں ہم سے کچھ زیادہ ہی ہوں گے۔ لمبی سی میز پر ہم سب اس طرح بیٹھ گئے کہ جانی لمبارڈی میز کے درمیان میں تھے اور نواب صاحب اور ہم ان کے دائیں بائیں۔ باقی خواتین و حضرات بھی کرسیوں پر فروکش ہو گئے۔ جانی نے کہا "میرا خیال ہے کہ پہلے کھانے کا آرڈر دے دیں۔ اس کے بعد باتیں ہوں گی کیوں نا؟"

بہت معقول تجویز تھی۔ سبھی نے اس کی تائید کی۔ ایک دراز قد' سیاہ بالوں والی ویٹریس آرڈر لینے کے لئے ہمارے پاس آن کھڑی ہوئیں۔ خدا جانے جانی لمبارڈی کی شخصیت کا اثر تھا یا پھر سچ مچ سب کی سب خواتین بہت زیادہ قبول صورت اور اسمارٹ تھیں۔ انہوں نے دل نواز انداز میں پنسل سنبھالی اور جانی سے مخاطب ہو کر فرمایا "شوٹ؟"

جانی نے پیزا کی فرمائش کی۔ باقی سب لوگوں نے بھی اپنی اپنی پسند کے کھانے بتائے۔ ہم نے بھی پیزا منگانے میں ہی عافیت جانی۔ خاتون ویٹریس کے رخصت ہوتے ہی جانی کے کھلنڈرے چہرے پر یک لخت سنجیدگی طاری ہو گئی۔ "ہاں عبدالخالق! اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟"

نواب صاحب نے کہا "یہ میرے عزیز ترین دوست ہیں۔ پاکستان سے آئے ہیں۔ فلموں کے مصنف' ہدایت کار' اور فلم ساز ہیں مگر میں چاہتا ہوں کہ اب یہ ٹورنٹو میں رہیں۔ ہم ان کے لئے کیا کر سکتے ہیں؟"

جانی نے ایک انگلی سے اپنا سر کھجایا پھر کہا "نو پرابلم۔" پھر وہ لالی سے مخاطب ہوا۔ "لالی مسٹر آفاقی تمہارے سپرد ہیں۔ میں تو آج جا رہا ہوں۔ تم ان سے مل کر پتا کرو کہ ہم ان کے لئے کیا کر سکتے ہیں؟"

"اوکے باس۔" لالی نے مسکرا کر ہماری جانب دیکھا۔ "کھانے کے بعد ہماری ملاقات رہے گی۔"

لیجئے بزنس ٹاک ختم۔ اب "لوز ٹاک" شروع ہو گئی۔ شو بزنس کے اسکینڈل مختلف لوگوں اور فن کاروں کی مصروفیات کے تذکرے جانی لمبارڈی کے آئندہ پروگراموں کی جھلکیاں ان کے حریفوں کی سرگرمیوں پر تبصرے۔ نئی فلموں کے تذکرے۔ کینیڈا میں حال ہی میں منعقد ہونے والے عالمی فلمی میلے کے بارے میں خیال آرائیاں۔ لطیفے اور فقرے بازی۔ یک لخت چند لمحوں کے اندر ماحول بالکل تبدیل ہو گیا تھا۔ تین خاتون ویٹریس مسکراتی ہوئی کھانا پیش کرنے کے لئے نمودار ہوئیں۔ کھانے کے دوران میں بھی ہلکی پھلکی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد آئس کریم آئی اور سب سے آخر میں کافی کا دور چلا۔

"کافی بہت ضروری ہوتی ہے۔" جانی نے خیال ظاہر کیا "اس کے بغیر پتا ہی نہیں چلتا کہ کھانا ختم ہو گیا ہے۔ کافی ہر کھانے کا "دی اینڈ" ہوتی ہے۔"

چنانچہ کھانے کو "دی اینڈ" لگایا گیا اور خالی پیالی میز پر رکھتے ہی جانی لمبارڈی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ واقعی' اور آئندہ بھی اس کا موقع ملتا رہے گا۔" اس نے ہماری جانب دونوں ہاتھ بڑھا دیے۔ پھر نواب صاحب سے مخاطب ہوا۔ "عبدل واپسی پر تم سے ملاقات ہو گی اور تمہارے دوست سے بھی۔ لالی ان سے پوچھو یہ کیا چاہتے ہیں اچھا اب اجازت؟" سب سے مصافحہ کر کے جانی لمبارڈی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ریستوران سے باہر چلا گیا۔ اس کے اسٹاف کے لوگ بھی رخصت ہو گئے۔ ریستوران میں نواب صاحب' لالی اور ہم رہ گئے۔

ریستوران سے باہر نکلے تو نواب صاحب نے بھی رخصت کی اجازت چاہی۔ "لالی! آفاقی صاحب تمہارے حوالے ہیں۔ بائی۔" اور نواب صاحب بھی یہ جا وہ جا۔

لالی نے ہمیں دیکھا اور ہنستے ہوئے سلیس اردو میں کہا "آئیے مسٹر آفاقی میرے کمرے میں چلتے ہیں۔"

لالی کا کمرا خاصا وسیع و عریض تھا۔ مختلف قسم کی کتابیں ہیں' اسکرپٹ' ٹیسٹ وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔

"اب بتایئے آپ کیا پئیں گے؟" لالی نے گھومنے والی کرسی پر بیٹھ کر کہا۔

"چائے"

مجھے پتا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان میں فلم والے چائے پیے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

چنانچہ چائے کے دور چلتے رہے اور ہم دونوں باتیں کرتے رہے۔ ہم نے اپنے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ لالی نے اپنے متعلق معلومات فراہم کیں۔ پھر جانی لمبارڈی کی "سلطنت" کے بارے میں مطلع کیا۔ ریڈیو' ٹی وی' فلم تینوں شعبوں میں جانی کا کاروبار پھیلا ہوا تھا مختلف زبانوں میں مختلف اقوام کے لئے پروگرام اور فلمیں بنائی جاتی تھیں مگر انڈین پروگرام صرف ایک ہی تھا اور وہ بھی نہایت مختصر اور محدود۔ اردو' ہندی پروگراموں کے لئے گنجائش بہت کم تھی۔

"اب بولیں!آپ کیا کرنا پسند کریں گے؟" لالی نے پوچھا۔

"ظاہر ہے ہم اطالوی یا ہسپانوی زبان میں تو فلمیں نہیں بنا سکتے۔ آپ بتایئے۔ کیا کرنا چاہیے۔"

"یہ تو سوچنا پڑے گا صاحب" لالی نے سر کھجاتے ہوئے کہا نہ جانے سوچنے کے لئے سر کھجانا بعض لوگوں کے لئے کیوں اتنا ضروری ہوتا ہے؟ "کوئی بات نہیں۔ یہ تو پہلی ملاقات ہے۔ اگلی ملاقاتیں ضرور نتیجہ خیز ہوں گی۔" اس نے ہمیں تسلی دی۔

اسی وقت انٹر کام پر سیکرٹری نے کسی صاحب کے آنے کی اطلاع دی۔

"آں ہاں' اندر بھیج دو۔" لالی نے خالص ہندوستانی لہجے میں انگریزی فقرہ ادا کیا۔ پھر ہم سے مخاطب ہو کر اردو میں کہا "ایک ہندوستانی فلم پروڈیوسر ہیں۔ کینیڈا میں فلمیں بنا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کے مطلب کے ہوں۔"

اتنی دیر میں دروازے پر دستک ہوئی اور ایک سوٹ میں ملبوس ہندوستانی اندر داخل ہوا۔ لالی سے بہت گرم جوشی سے ملے۔ ہم سے اس سے بھی زیادہ گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔

"ارے ارے آفاقی صاحب! یہ تو بہت عجیب اتفاق ہو گیا۔ میں ابھی تھوڑے دن پہلے ہی لاہور اور کراچی سے ہو کر آیا ہوں۔"

"اچھا! کس سلسلے میں گئے تھے۔ سیر تفریح کے لئے؟"

"ارے صاحب۔ ہماری قسمت میں سیر کہاں۔ بزنس کے لئے گیا تھا۔ فلم میکنگ کے سلسلے میں۔"

پھر انہوں نے مطلع فرمایا کہ وہ کینیڈا میں دو فلمیں بنا رہے ہیں۔ ایک نام "دور دیس" ہے۔ اس کی شوٹنگ ٹورنٹو میں ہو رہی ہے۔ دوسری اس کے بعد شروع ہو گی۔

"آپ کے ندیم صاحب۔ دور دیس میں کام کر رہے ہیں۔ بہت غضب کے ایکٹر ہیں۔ آپ کے پاکستانی ایکٹر تو یہ لمبے لمبے ڈائیلاگ اتنی خوب صورتی سے بولتے ہیں اور ایک بار بھی ری ٹیک نہیں کراتے۔ ہمارے انڈین ایکٹر بھائی اس معاملے میں بہت کند ذہن ہیں۔ بہت ری ٹیک کراتے ہیں۔ بہت فلم کھاتے ہیں۔"

ان فلم ساز کا نام رام دیال تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے لاہور کے اسٹوڈیو میں ایک منیجر ہوا کرتے تھے جن کا نام دیوان سرداری لال تھا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی وہ لاہور میں رہے اور یہاں ایک فلم کا آغاز بھی کیا مگر پھر بمبئی چلے گئے۔ دیوان سرداری لال تو بمبئی کی فلمی دنیا میں زیادہ کامیابی حاصل نہیں کر سکے تھے مگر ان کے صاحب زادے خاصے کامیاب ثابت ہوئے۔ انہوں نے بتایا کہ فلم "دور دیس" انڈیا، پاکستان اور بنگلہ دیش کی مشترکہ پروڈکشن ہے۔ وہ بنگلہ دیش سے بھی ہو کر آئے تھے۔ پاکستان سے ندیم کا انتخاب کیا تھا۔ ہندوستان سے ششی کپور، رینا رائے اور پروین بوبی نمایاں اداکار تھے۔ بنگلہ دیش سے ببیتا کو شامل کیا گیا تھا۔

ہم نے کہا "مگر دیال صاحب پاکستان سے ایک اداکار لینے کی بنا پر یہ فلم کو پروڈکشن کیسے ہو سکتی ہے اور پاکستان میں اسے نمائش کی اجازت کیسے ملے گی؟"

"اس کی آپ فکر نہ کیجئے۔ سب کام ہو جائے گا۔ بات ہو چکی ہے۔ میں لاہور، کراچی اور اسلام آباد سے ہو کر آیا ہوں۔" پھر انہوں نے پاکستان کی فلمی صنعت کے بارے میں اپنی معلومات بیان کرنی شروع کر دیں۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ محض چند روزہ قیام کے باوجود پاکستان کی فلموں کے بارے میں ان کی معلومات بالکل درست تھیں۔ ایک عام پاکستانی فلم پر کتنی لاگت آتی ہے۔ کون سا اداکار کتنا معاوضہ لیتا ہے وغیرہ وغیرہ

جب وہ ذرا دم لینے اور چائے پینے کے لئے رکے تو لالی صاحب نے انہیں بتایا کہ یہ آفاقی صاحب پاکستان سے آئے ہیں اور یہاں فلم وغیرہ بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

دیال صاحب نے پیالی ہاتھ سے رکھ دی اور ہمارے گرد ہو گئے۔ "آفاقی صاحب یہ تو بہت عجیب اتفاق ہے۔ کینیڈا میں میرے فنانسر نے مجھے دھوکا دے دیا ہے اور مجھے مالی پریشانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ آج کل یہاں فلم کی شوٹنگ چل رہی ہے اور پیسے کم پڑ گئے ہیں۔ میں نے ٹی وی کے انڈین پروگرام میں اشتہار بھی دیا ہے کہ اس فلم کے لئے فنانسر درکار ہیں۔ بہت اچھی کاسٹ ہے۔ اگلی فلم میں امیتابھ اور ریکھا بھی ہوں گے۔ کیا خیال ہے۔ آپ اس فلم میں کیوں نہیں شریک ہو جاتے۔ کتنا پیسہ لگا سکتے ہیں؟"

ہم ابھی جواب دینے نہ پائے تھے کہ لالی نے کہا "دیال صاحب آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ یہ فنانسر نہیں ہیں۔ بذات خود رائٹر ڈائریکٹر اور پروڈیوسر ہیں۔"

"اوہ!" دیال صاحب نے دوبارہ پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لی۔ "خیر مگر ہم دونوں مل کر کوئی صورت ضرور نکال سکتے ہیں۔ کیوں لالی جی؟ کیا خیال ہے آپ کا؟"

ہم نے کہا "یہ تو سوچنا پڑے گا۔"

"سوچئے سوچئے۔ اور ہاں شوٹنگ دیکھنی ہو تو مجھے فون کر لیجئے فلاں ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ ندیم بھی وہیں ٹھہرے ہیں۔" یہ ہوٹل ہماری قیام گاہ سے بالکل نزدیک تھا۔ اتنا زیادہ کہ نواب صاحب کے کچن کی کھڑکی سے نظر آجاتا تھا۔ جب ہم نے رام دیال صاحب کو بتایا تو وہ خوش ہو کر بولے

"اچھا وہ اونچی سفید رنگ کی بلڈنگ۔ شاید وھائٹ ٹاور نام ہے اس کا؟ ارے صاحب وہ تو ہمارے ہوٹل سے بالکل نزدیک ہے۔ اگر ہم اپنے کمرے کی کھڑکی سے پتھر پھینکیں تو آپ کے بیڈ روم میں جا کر گرے گا۔"

ہم نے کہا "بیڈ روم میں نہیں" کچن میں۔"

"ایک ہی بات ہے" وہ بولے۔ "تو پھر سوچ کر بتایئے گا۔"

ہم انہیں کیا سوچ کر بتاتے۔ بات دراصل یہ تھی کہ انہیں کینیڈا میں فنانسروں کی تلاش تھی۔ انہوں نے ٹی وی پر انڈین پروگرام میں اشتہار بھی دیئے تھے کہ حصص خرید لیجئے۔ بہت سے ہندوستانیوں نے خرید بھی لئے تھے، مگر ہمارے لئے اس میں کیا گنجائش ہو

سکتی تھی؟ ویسے بھی ہم کسی ہندوستانی فلم ساز کے ساتھ اشتراک بھی کیسے کر سکتے تھے؟ لالی صاحب یہ باریکیاں جانتے اور سمجھتے تھے مگر دیال صاحب اپنی ترنگ میں تھے۔ انہیں تو فنانس کی ضرورت تھی۔ خواہ کیسے بھی درکار ہو' کہیں سے بھی ملے۔ مگر ان کے ذریعے ہمیں ندیم اور ان کے خسر احتشام صاحب کی ٹورنٹو میں موجودگی کی اطلاع مل گئی۔ احتشام صاحب نے مشرقی پاکستان میں فلم سازی شروع کی تھی۔ پہلے بنگلہ فلمیں بنائیں' اس کے بعد اردو فلموں سے خوب شہرت اور پیسہ کمایا۔ فلم سازی اور ہدایت کاری کی تربیت انہوں نے لاہور میں حاصل کی تھی۔ اس زمانے میں احتشام کے نام سے انہیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ کیپٹن رحمان کہلاتے تھے' حالانکہ وہ کبھی فوج میں نہیں رہے مگر اپنے دوستوں میں ہمیشہ کیپٹن کے نام سے ہی پکارے گئے۔ لاہور اور کراچی میں انہوں نے کافی وقت گزارا۔ باتونی اور میل ملاپ والے آدمی تھے۔ بہت جلدی ہر ایک سے گھل مل جاتے۔ بڑے بڑے فلم سازوں' ہدایت کاروں اور ہنرمندوں کی صحبت میں رہے۔ اگرچہ ضیا سرحدی صاحب کے الفاظ میں ان تمام لوگوں کی صحبت نے کیپٹن کا کچھ بھی نہیں بگاڑا تھا' پھر بھی وہ فلم بنانے کے گر ضرور جان گئے تھے چنانچہ ڈھاکا گئے تو انہوں نے بنگلہ فلموں سے بسم اللہ کی۔ پھر اردو فلمیں بنائیں تو مغربی پاکستان میں بھی معروف ہو گئے اور خوب دولت کمائی۔ ان کے بھائی مستفیض نے بھی فلم سازی اور ہدایت کاری کے میدان میں قدم رکھ دیا اور بہت کامیاب رہے۔ ۶۰ء کی دہائی میں جب کراچی سے ایک نوجوان نذیر بیگ گلوکاری کے میدان میں نام پیدا کرنے کے لئے ڈھاکا پہنچا تو احتشام صاحب اپنی اردو فلم "چکوری" شروع کر رہے تھے۔ نذیر بیگ کو گلوکاری کے بجائے اداکاری کا موقع مل گیا اور وہ ندیم کے نام سے فلموں میں جلوہ گر ہونے لگے۔ پہلی فلم "چکوری" ہی بے انتہا کامیاب ہوئی اور ندیم راتوں رات مقبول ہیرو بن گئے۔ احتشام صاحب کی صاحب زادی نے انہیں پسند کر لیا اور اس طرح ندیم کو احتشام صاحب نے اپنی "فرزندی" میں لے لیا۔ ابتدائی سالوں میں ندیم ان کے فلمی مشیر بھی تھے۔

احتشام ایک باتونی' شگفتہ ذہن' خوش اخلاق اور دلچسپ آدمی ہیں۔ طبیعت ہمیشہ سے رومانی رہی ہے۔ کھانے پینے کے بہت شوقین رہے ہیں۔ محفل آرائی میں بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ ہم نے گھر پہنچتے ہی ہوٹل فون کر کے ندیم کے کمرے سے فون ملانے کے لئے کہا۔ ادھر سے احتشام صاحب نے فون اٹھایا اور ہمارا نام سن کر اچھل پڑے۔ بولے "فوراً آ جائیے۔ کہاں ہیں؟"

ہم نے کہا "کھڑکی سے جھانک کر دیکھئے تو ہماری مونچھیں نظر آ جائیں گی۔"

بولے "میں آپ کو سالم دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس لئے آ ہی جائیے۔"

ان کے ہوٹل تک پیدل سفر پانچ منٹ کا تھا۔ کمرے کے دروازے پر دستک دی تو سامنے کیپٹن صاحب کھڑے تھے۔ سفید قمیص' رنگین لنگی' ہاتھ میں سگریٹ' ہمیشہ کی طرح مسکراتے ہوئے۔ اردو بہت اچھی بولتے ہیں۔

"آپ نے ہمارا کھوج کیسے لگا لیا؟"

ہم نے کہا "کیپٹن صاحب سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے۔ اب یہی دیکھ لیجئے کہ آپ بنگلہ دیش سے اور ہم پاکستان سے کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں موجود ہیں' مگر یہ بتائیے کہ آپ اچانک کیسے آ گئے؟"

بولے "نذیر کو شوٹنگ کے لئے آنا تھا۔ فرزانہ مصروف تھیں۔ میں ساتھ چلا آیا۔"

ہم نے کہا "ہیروئنوں کے ہمراہ نگراں بھیجنے کا تو فلمی دنیا میں رواج سنا تھا مگر ہیرو کے ساتھ کسی محافظ کو پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔"

خوب زور سے ہنسے بولے "ہیروئنوں کے ساتھ تو مائیں' باپ' نانی وغیرہ آتی ہیں۔ ہیرو کے ساتھ فادر ان لاء آیا ہے۔ کیوں ہے نا بالکل نئی بات؟"

ندیم کے متعلق انہوں نے بتایا کہ بیشتر وقت شوٹنگ میں مصروف رہتے ہیں۔ صبح' شام' رات کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ جب آئیں گے تو آپ کو ٹیلی فون کرا دوں گا۔

احتشام صاحب کے ساتھ کافی دیر گپ شپ ہوتی رہی۔ پاکستان اور بنگلہ دیش کی سیاست' فلم' صحافت' دوست احباب کی باتیں۔ دنیا بھر کے موضوعات تھے۔ اندازہ ہوا کہ وقت اور عمر نے کیپٹن صاحب کی زندہ دلی اور رنگین مزاجی پر ذرا بھی اثر نہیں ڈالا۔ ندیم کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ اسے شوٹنگ کے لئے ٹورنٹو کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی جانا ہو گا۔ اس لئے ندیم سے وہاں ملاقات نہ ہو سکی۔ فون پر بات چیت ہوئی' مگر ان کے بارے میں ہندوستانیوں کی زبانی جو خبریں مل رہی تھیں' وہ بہت حوصلہ افزا تھیں۔

انہوں نے اپنی اداکاری کا لوہا منوا لیا تھا۔ بھارتی اداکاروں کے مقابلے میں جب ان کی تعریفیں سنتے تو سیروں خون بڑھ جاتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ بھارتی فلم ساز نے فلم ختم ہونے کے بعد ڈنڈی مار دی اور اس فلم میں سے ندیم کا بہت سا کام نکال دیا گیا۔

دوسرے دن صبح سویرے ایک پاکستانی منصور صاحب کا فون آ گیا۔ وہ ہمیں ورائٹی پروگرام میں ملے تھے اور انہوں نے اس بات میں بہت دلچسپی کا اظہار کیا تھا کہ وہ کینیڈا میں ایک فلم بنانے کے خواہش مند ہیں۔ انہوں نے ایک چائنیز ریستوران میں کھانے پر مدعو کیا اور خود ہی آ کر اپنی کار میں لے گئے۔ راستے بھر وہ ہمیں کینیڈا کی سیاست کے بارے میں معلومات فراہم کرتے رہے۔ یہ بتاتے رہے کہ وہاں رہنے والے پاکستانی کتنے ناقابلِ اعتبار ہیں اور کس طرح ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

ہم نے پوچھا "آپ فلم بنانے کے لئے سرمایہ کہاں سے لائیں گے؟"

بولے "دو چار دوستوں سے لوں گا اور پھر حکومت بھی کافی مالی مدد دیتی ہے۔ ابھی آپ کو میں ایسی ہستی سے ملاؤں گا جو ہمارے لئے بہت کار آمد ہو سکتی ہے۔"

چائنیز ہوٹل کا نام ژوں خا یا خوژا قسم کا تھا۔ خاصا خوب صورت ریستوران تھا۔ ڈیکوریشن کافی اچھی تھی۔ چھت پر چینی قسم کی روشنیاں لگی ہوئی تھیں مگر عملہ سارا کا سارا گوری میموں پر مشتمل تھا۔ تین ویٹریس تھیں اور سب کی سب خوش شکل۔ انہوں نے اپنی دانست میں چینی لباس پہن رکھا تھا۔ یعنی کمونو یا چینی انداز کا گون جو صرف گھٹنوں سے اوپر تک تھا۔ اس لباس میں بٹن تو ہوتے نہیں ہیں بس کمر کے پاس ایک ڈوری یا پٹی سی باندھ لی جاتی ہے۔ اس کا لباس محض اس کمونو یا گون پر مشتمل تھا۔ غالباً اس کے سوا انہوں نے اندر بھی کوئی کپڑا نہیں پہنا تھا۔ بٹنوں کی غیر موجودگی میں کمونو 'آدھا کھلا' آدھا بند تھا بلکہ زیادہ تر کھلا ہی سمجھ لیجئے۔ منصور صاحب نے بتایا کہ یہ لباس گاہکوں کی بھوک بڑھانے کے خیال سے پہنایا گیا ہے۔

ہم نے پوچھا "کون سی بھوک؟"

انہوں نے پہلے تو حیران ہو کر ہمیں دیکھا مگر پھر مسکرائے اور بولے "ہر قسم کی بھوک۔"

اس وقت ریستوران میں کوئی اور موجود نہ تھا اس لیئے تینوں خواتین نے ہمیں گھیر لیا۔ ہمیں تو یوں لگا جیسے جوڈو کراٹے کے مقابلے میں شریک ہونے کے لئے پہنچ گئے ہیں۔ قدو قامت اور جسمانی موزونیت کے اعتبار سے بھی وہ جوڈو ایکسپرٹ ہی نظر آتی تھی۔ ایک گوشے میں جہاں مدھم روشنی تھی انہوں نے ہمیں لے جا کر بٹھا دیا۔

منصور صاحب نے کہا "آپ ان کے لباس پر نہ جایئے۔ یہاں کھانا بہت اچھا ہوتا ہے۔"

یہ اور بات ہے کہ جب کھانا آیا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی بس یوں ہی سا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جو چائینز فوڈ ہم نے پاکستان میں اور خصوصاً لاہور میں کھایا ایسا ذائقہ کسی اور ملک کے چینی کھانے میں نہیں پایا۔ ہمارا خیال تھا کہ اب کھانے کا آرڈر دیا جائے گا۔ اور جوڈو کی ایکسپرٹ خواتین ہمارے آس پاس منڈلا بھی رہی تھیں مگر منصور صاحب نے انہیں مطلع کیا کہ ابھی ہمیں کسی اور مہمان کا بھی انتظار ہے۔ انہوں نے درمیانی وقفے میں مشروبات پیش کرنے کا مشورہ دیا۔ منصور صاحب نے بیئر منگائی، ہمارے لئے کوک آ گیا چند لمحے بعد وہ بھی آ گئی جس کا ہمیں انتظار تھا یوں تو ان سے پہلے بھی تین بجلیاں چمک رہی تھیں مگر جب انہوں نے اندر قدم رکھا تو یوں لگا جیسے آتش فشاں روشن ہو گیا۔ ہم تو انہیں دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ کشیدہ قامت، خوش اندام، خوش ادا اور خوش گفتار ظاہر ہے کہ لباس بھی بہت اچھا تھا، بشرطیکہ آپ اسے لباس کہنا پسند فرمائیں۔ لباس کیا تھا بس کپڑے کی چند پٹیاں تھیں جنہیں آپ دھجیاں بھی کہہ سکتے ہیں۔ خدا جانے کس حساب اور ترکیب سے یہ دھجیاں انہوں نے اپنے جسم پر تقسیم کر دی تھیں۔ یہ اندازہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان دھجیوں کو سینے کی زحمت بھی گوارا کی گئی ہے یا بس یوں ہی لپیٹ لیا گیا ہے۔ لباس تو خیر دریدہ تھا ہی مگر اس کے اندر ان کا سراپا نگاہیں خیرہ کیئے دے رہا تھا۔ گورا، گلابی اور سنہرا رنگ ملا کر ان کے جسم کا خمیر اٹھایا گیا ہو گا۔ بال بھی ان کے سنہرے تھے، آنکھیں گہری نیلی، جیسے کانچ کی گولیاں، بات کرتے ہوئے وہ مستقل مسکراتی رہتی تھیں اور ان کے نہایت ہموار اور چمک دار دانت موتیوں کی طرح چمکتے رہتے تھے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس قدر دلکش اور جاں فزا شخصیت اب تک ہماری نگاہوں سے اوجھل کیوں تھی اور منصور صاحب نے انہیں کہاں سے اور کیسے تلاش کر لیا تھا؟ انہیں ہال میں داخل ہوتے دیکھ کر منصور کی باچھیں کھل گئی تھیں اور وہ ہاتھ پھیلا کر اپنی کرسی سے کھڑے ہو گئے تھے ہم نے بھی ازراہ اخلاق کھڑا ہونا مناسب سمجھا۔

خاتون نے آتے ہی منصور صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور پھر ہماری جانب دیکھ کر خالص امریکی لہجے میں پوچھا "یہی ہیں وہ؟"

منصور صاحب نے سر ہلایا "ہاں' یہ وہی ہیں"

انہوں نے فوراً منصور صاحب کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ہماری جانب ہاتھ بڑھایا جو بازو سے اوپر بھی عریاں ہی تھا کیونکہ ان کے عجیب و غریب لباس کی نوعیت سے ہم آپ کو پہلے ہی مطلع کر چکے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم کہاں دیکھیں۔ دوسرے لفظوں میں انہیں کہاں سے دیکھنا شروع کریں۔ ان کی آمد کے ساتھ ہی خوشبو کے جھونکوں نے سارے ریستوران میں ہلچل مچا دی تھی۔ اب جو انہوں نے نزدیک آ کر ہمارا ہاتھ اپنے دست نازک میں تھاما تو خوشبو کی کثرت نے ہمیں واقعی بوکھلا دیا مگر انتہائی دھیمی اور ہلکی ہلکی خوشبو تھی۔ یعنی کثرت کے باوجود ناگوار نہیں گزری۔ ہاتھ ان کا اس قدر نرم اور گرم تھا کہ چھوتے ہی ہمارے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ انہوں نے ہولے سے ہمارا ہاتھ دبایا اور سنہری بالوں کے گچھوں کو جھٹک کر شیریں آواز میں کہا "ہائی"

ہم نے بوکھلا کر کہا "جی؟"

وہ بے ساختہ ہنس پڑیں شاید اس قسم کے واقعات سے انہیں اکثر واسطہ پڑتا ہو گا کیوں کہ ان کی مسکراہٹ میں بے حد اعتماد اور وثوق نظر آیا، مگر اس نازک موقعے پر منصور صاحب کام آئے۔ فوراً بولے "مسٹر آفاقی! ان سے ملئے، مس کڈنی اور کڈنی! یہ مسٹر آفاقی۔ وہی۔"

"سمجھ گئی" وہ مسکرا کر بولیں اور پھر ہمارا ہاتھ چھوڑ کر سر سے پیر تک جائزہ لینے میں مصروف ہو گئیں۔ پھر گویا مطمئن یا مایوس ہو کر ایک لمبی آہ بھر کر بولیں "اوکے" یعنی انہوں نے ہمیں پاس کر دیا۔ ہمارے کرسیوں پر بیٹھتے ہی وہ تینوں خواتین پھر نمودار ہو

گئیں اور منصور صاحب نے انہیں مختلف کھانوں کے نام بتا دیے۔ ڈرنکس کے لئے منصور صاحب اور مس کڈنی شمپئن منگائی۔ ہم نے جب کوک کی فرمائش کی تو مس کڈنی خیر حیران ہو ہی گئی مگر منصور صاحب کو بھی یہ بات پسند نہیں آئی۔

بولے "پھر وہی کوک۔ ارے صاحب کچھ اور چیز منگائیے"

ہم نے فوراً کہا "سیون اپ"

مس کڈنی اپنی ہنسی نہ روک سکیں۔ پھر پوچھنے لگیں "کیا آپ ڈرنکس نہیں کرتے؟" ہم نے کہا "کرتے تو ہیں مگر سافٹ ڈرنکس لیتے ہیں"

بولیں "شمپئن سے زیادہ سافٹ اور کیا چیز ہوگی۔ یہ تو پانی سے بھی زیادہ بے ضرر ہے۔"

ہم مسکرا کر رہ گئے۔ کہنے لگیں "خیر کوئی بات نہیں۔ میں آپ کو مجبور نہیں کروں گی۔" یہ ان کی سمجھ داری تھی یا معاملہ فہمی غالباً انہوں نے بھانپ لیا تھا کہ ان کے مجبور کرنے کے باوجود ہم شمپئن کو ہاتھ نہ لگائیں گے۔ بلا کی ہوشیار بلکہ چالاک خاتون تھیں۔

اس اثنا میں ویٹریس صاحبہ شمپئن اور سیون اپ لے آئیں۔ شکر ہے کہ اس بار صرف ایک ہی خاتون نے زحمت فرمائی ورنہ ہمیں ڈر تھا کہ شاید تین قسم کے ڈرنکس تین خواتین الگ الگ لائیں گی۔ جب ویٹریس نے شمپئن کے پیالے نما جام ان دونوں کے سامنے رکھے اور پھر ہمارے آگے سیون اپ کا گلاس سجا دیا تو ان کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ شاید وہ ہماری اس بچگانہ حرکت پر ہنس رہی ہوں گی۔ ہنستی ہیں تو ہنسیں۔ ہم نے سوچا ہماری بلا سے۔ ہمیں ان کی بھلا کیا پروا ہے۔

مس کڈنی نے اپنا ساغر اٹھایا۔ منصور صاحب نے بھی اپنا ساغر فضا میں لہرایا ہم اتنا تو جان ہی گئے تھے۔ ہم نے بھی اپنا سیون اپ کا گلاس اٹھا لیا "چیئرز" انہوں نے کہا۔ ہم نے بھی "چیئرز" کہہ دیا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر کر سیون اپ پینے لگے۔ وہ دونوں بھی "سپ" کر رہے تھے۔ دو چار سپ کرنے کے بعد مس کڈنی نے اپنے ہونٹوں کو چاٹا اور پھر کہنے لگی "علی! آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ یہ بتائیں' اگر میں آپ کو علی کہوں تو اعتراض تو نہ ہوگا؟"

ہم نے کہا' بڑے شوق سے کہئے مگر ہم سے ملنے کا اشتیاق کیوں تھا آپ کو؟"

بولیں "مسٹر منصور نے آپ کی بہت تعریف کی تھی اور بتایا کہ آپ یہاں فلم وغیرہ بنانے کا پروگرام بنا رہے ہیں اور ٹی وی کے لئے بھی کچھ پروگرام کریں گے۔ سنا ہے کہ آپ بہت پرانے فلم ساز اور رائٹر ہیں۔"

ہم نے کہا "خیر اتنے زیادہ پرانے بھی نہیں ہیں۔ بہر حال آپ سے مل کر واقعی بیحد خوشی ہوئی۔"

کہنے لگیں "کوشش کروں گی کہ اس خوشی میں اضافہ ہو جائے۔ اب یہ بتائیے کہ آپ کی فلم کب شروع ہو رہی ہے؟"

ہمارے بولنے سے قبل ہی منصور صاحب بول پڑے "ہاں ہاں بس کاغذی تیاریاں ہو رہی ہیں یہ خود ہی اسکرپٹ لکھ رہے ہیں" پھر ہم سے مخاطب ہوئے "آفاقی صاحب! مس کڈنی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

ہم نے حیران ہو کر انہیں اور پھر مس کڈنی کو دیکھا جو سراپا دعوت بنی ہمیں دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ ہماری نظریں ملیں تو بولیں "کہئے کیا رائے ہے آپ کی؟"

ہم نے کہا "سچ سچ بتا دیں؟"

"بولیں "بے شک"

منصور صاحب اردو میں کہنے لگے "مگر ذرا احتیاط سے۔"

ہم نے مس کڈنی سے کہا "دیکھیے ہم نے آج تک جتنی قسم کے کڈنی اور ان کے استعمال دیکھے اور سنے ہیں آپ ان سے یکسر مختلف ہیں۔"

پوچھا "وہ کیسے؟ کیا آپ کے ملک میں بھی اس نام کی کوئی خاتون ہیں؟"

ہم نے کہا "دیکھئے' ایک کڈنی تو وہ ہوتا ہے جسے ہم کھاتے ہیں۔ دوسرا کڈنی وہ ہے جو لوگوں کی بیماری کا سبب بن جاتا ہے اور پھر ڈاکٹر اس کا آپریشن کر دیتے ہیں۔ ایک اور کڈنی وہ ہے جو دل کے ساتھ مل کر انسان کو بہادر بنا دیتا ہے۔ ہمارے ہاں اردو میں کسی بہادر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس شخص کا بڑا دل گردہ ہے' مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ اس ٹائپ کے کڈنی سے یہ ہمارا پہلا واسطہ ہے۔ کیوں کہ یہ نام ہمارے لئے بہت حیرت کا باعث ہے اور وہ بھی کسی خوب صورت عورت کا۔"

حیران ہو کر بولیں "کیوں؟ آپ کے ہاں کڈنی نام کی عورتیں نہیں ہوتیں؟"

"جی نہیں۔ ہمارے ہاں شاعر لوگ دل، جگر وغیرہ کا تخلص رکھ لیتے ہیں مگر گردہ کسی نے اپنا تخلص نہیں رکھا۔"

"تخلص کیا ہوتا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

اب ہم انہیں کس طرح سمجھاتے۔ پھر بھی سمجھانے کی کوشش کرنے لگے کہ ہمارے ملک میں شاعر اور ادیب وغیرہ اپنے نام کے ساتھ ایک شاعرانہ اور رومانی نام بڑھا لیتے ہیں اور اسی نام سے مشہور ہو جاتے ہیں۔ اسے تخلص کہتے ہیں۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ سوچ میں پڑ گئیں منصور صاحب نے اردو میں کہا "چھوڑیے۔ آپ بھی بھینس کے آگے بین بجانے بیٹھ گئے۔ ارے یہ کیا سمجھے گی اردو شاعری اور تخلص وغیرہ۔"

ہم نے کہا "خیر بھینس کہنا تو بہت زیادتی ہے۔ اس قدر گوری چٹی اور خوب صورت بھینس ہم نے کبھی دیکھی نہ سنی۔"

کہنے لگے "میں نے تو محاورتاً کہا تھا آپ مطلب کی بات کیجئے۔"

"مثلاً؟"

بولے "مثلاً یہ کہ مس کڈنی کو فلموں میں کام کرنے کا بہت شوق ہے۔ یہاں کے فلم سازوں نے تو بہت مشکل قاعدے بنا رکھے ہیں۔ اگر آپ ایک بار اسے فلم میں موقع دیں گے تو یہ "اسٹار" بن جائے گی۔"

"مگر ہم تو فی الحال کوئی فلم نہیں بنا رہے ہیں۔"

"تو پھر کیا ہوا۔ آخر بنائیں گے تو"

اس اثنا میں مس کڈنی حیرانی سے ہماری گفتگو سن رہی تھیں۔ باتیں لمبی ہو گئیں تو انہوں نے پہلو بدلنے شروع کر دیے۔ ہم نے ان سے انگریزی میں معذرت طلب کی اور پھر بتایا کہ ابھی تو ہم فلم کے بارے میں ضروری فیصلے کر رہے ہیں۔

منصور صاحب جھٹ بول پڑے "یہ چاہتی ہیں کہ آپ اپنے فیصلے میں انہیں بھی شامل کر لیں۔

انہیں پتا چلا ہے کہ آپ ایک کو پروڈکشن بنا رہے ہیں۔ انہیں ایکٹنگ کا بہت شوق ہے۔"

ہم نے لاجواب ہو کر مس کڈنی کو دیکھا تو وہ مسکرائیں اور بولیں "کیوں، کیا میں ایکٹریس بننے کے قابل نہیں ہوں؟"

ہم نے کہا "یہ بات نہیں ہے۔ آپ ہر لحاظ سے مناسب اور موزوں ہیں۔"

مسٹر منصور بات کاٹ کر بولے "لیجئے" آپ تو منتخب ہو گئیں۔ بس اب دوسری تفصیلات بعد میں۔ فی الحال کھانا کھاتے ہیں دیکھئے کتنے بروقت آیا ہے۔"

کھانا خاصا بد مزہ تھا۔ اگرچہ ویٹریس خواتین ہماری اور منصور صاحب کی فرمائش پر مرچیں اور سرکہ بھی لے آئی تھیں، بلکہ انہوں نے تو ٹماٹر کیچ اپ بھی لا کر سامنے رکھ دیا تھا۔ پھر بھی عجیب پھیکا پھیکا ذائقہ تھا۔ ہمیں لاہور کا چینی کھانا یاد آتا رہا۔ مس کڈنی کے اپنے گردے کے بارے میں تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے مگر ان کے معدے کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے اس قدر خوش خوراکی کا مظاہرہ کیا کہ ہم حیران رہ گئے تعجب کی بات یہ تھی کہ اتنا زیادہ کھانے کے باوجود وہ اس قدر متناسب جسم کی مالک کیوں کر تھیں! یہ ایک معجزہ ہی سمجھ لیجئے۔ کھانے کے دوران میں ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ ہم سے پاکستانی فلمی صنعت کے بارے میں دریافت کرتی رہیں۔ منصور صاحب نے ہمیں اردو میں تاکید فرمائی کہ خوب بڑھا چڑھا کر بتایئے۔

ہم نے بھی ذرا مبالغے کے ساتھ بیان کیا کہ ہمارے ملک میں کیسے عظیم الشان نگار خانے ہیں اور کیسے کیسے بے مثال اداکار اور فن کار موجود ہیں۔

پوچھنے لگیں "آپ کے بہت زیادہ مہنگے فنکار کو کتنا معاوضہ ملتا ہے"

منصور کھنکارنے لگے ہم نے بھی بات گول کر دی "دراصل کوئی ایک ریٹ تو مقرر نہیں ہے۔ بس موقع محل کے حساب سے طے کر لیتے ہیں۔"

منصور نے کہا "اور کیا۔ کوئی باٹا کا جوتا تو نہیں کہ ریٹ مقرر ہو۔ فنکار تو فنکار ہوتا ہے۔"

مس کڈنی سے کہا "آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔ آپ کو پیسوں کی کیا ضرورت ہے۔"

وہ مسکرا دیں۔ بولیں "آپ کی فلم میں تو میں بالکل اعزازی کام کروں گی۔ مطمئن رہیے۔"

مس کڈنی کی صورت شکل' سراپا اور انداز کی دلکشی ایسی تھی کہ ہمیں ان کے اب تک اداکارہ نہ بننے پر حیرانی تھی۔ یہ درست ہے کہ اداکارانہ صلاحیتوں کی ان میں کمی تھی مگر یہ کمی حسن و جمال اور خوش ادائی نے پوری کر دی تھی۔ حیرت ہوئی کہ کینیڈا والے اس قدر بد ذوق کیوں ہیں؟ منصور صاحب نے بعد میں بتایا کہ یہاں اداکاری کے لئے باقاعدہ تعلیم اور تربیت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ محض صورت و شکل کوئی نہیں پوچھتا۔ اور حسن کی تو ویسے بھی کمی نہیں ہے۔ مس کڈنی نے کھانے کے بعد ایک وہسکی کا جام طلب فرمایا۔ ہم نے چینی قہوے پر اکتفا کی۔ منصور صاحب نے بھی ہمارا ساتھ دیا۔ بل منصور صاحب نے بخوشی ادا کیا۔ جو خاصا معقول تھا۔

مس کڈنی نے پوچھا "اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

ہم نے کہا "کچھ نہیں۔ شام کو چار بجے جانی لمبارڈی کے دفتر جانا ہے۔"

ان کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بولیں "آپ جانی لمبارڈی کو جانتے ہیں۔"

منصور صاحب نے کہا "باہر جانے سے پہلے انہوں نے ان کو لنچ پر بلایا تھا۔"

مس کڈنی بہت زیادہ متاثر نظر آ رہی تھیں۔ شو بزنس میں جانی لمبارڈی ایک بہت بڑا نام تھا۔ اس سے بے تکلفی اور ملاقات کسی عام آدمی کے بس کی بات نہ تھی۔ ہم نے محسوس کیا کہ مس کڈنی کی نظروں میں ہماری وقعت کچھ اور بڑھ گئی ہے۔

کہنے لگیں "علی! اگر جلدی نہ ہو تو میں تمہیں ڈراپ کر دوں۔"

ہم نے کہا "کیا مطلب ہے۔ کیا آپ آہستہ کار چلاتی ہیں؟"

ہنس پڑیں۔ بولیں "نہیں میرا مطلب تھا مجھے راستے میں معمولی سی مصروفیت تھی مگر یقین کرو۔ تمہیں بور نہیں ہونے دوں گی۔"

منصور صاحب بولے "ہاں ہاں۔ ٹھیک ہے مسٹر آفاقی! یہ آپ کو وہاں ڈراپ کر دیں گی۔ اگر آپ محسوس نہ کریں تو مجھے اجازت دیں۔ رات کو فون کروں گا۔"

ویٹریس لڑکیاں ہمیں دروازے تک چھوڑنے آئیں۔

منصور صاحب نے انہیں اچھی خاصی ٹپ دے دی تھی جس کی وجہ سے وہ ہم لوگوں کے سامنے بچھی جا رہی تھیں اور ان کے کمونو کچھ اور سمٹ گئے تھے۔ ریستوران کے باہر منصور صاحب نے رخصت طلب کرلی اور بہت مسکرا کر ہمیں الوداع کہہ کر چلے گئے۔

مس کڈنی ہمیں اپنی کار کی جانب لے گئیں۔ انتہائی قیمتی اور شاندار کار تھی۔ انہوں نے اسے لاک بھی نہیں کیا تھا۔ پہلے انہوں نے ہمیں بٹھایا پھر خود تشریف فرما ہوئیں۔ کار خوشبو سے مہک رہی تھی اور اس کی سیٹیں مخملیں تھیں۔ بیٹھے تو یوں لگا جیسے سیٹ کے اندر دھنس گئے ہوں۔ یہ آٹومیٹک گاڑی تھی۔ یعنی گیئر بدلنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ خیر یہ تو کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی کیوں کہ امریکہ اور کینیڈا میں ایسی کاروں کا رواج بہت عام ہے۔ مگر اس کی ہر چیز آٹومیٹک تھی۔ مثلاً شیشہ اتارنے کے لئے بٹن دبا دیجئے' سیٹ آگے پیچھے کرنی ہو تو بٹن دبا دیجئے' ریڈیو' کیسٹ وغیرہ کے لئے بٹن دبا دیجئے' سگریٹ درکار ہے تو بٹن دبا دیجئے' دوسرا بٹن دبانے سے لائٹر برآمد ہو گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے پوچھا "آپ کو جانی لمبارڈی کے دفتر کا پتہ معلوم ہے؟"

بولیں "ان کا پتا کون نہیں جانتا' مگر پہلے تو میرے ساتھ چلو گے۔"

"کہاں؟"

"ابھی پتا چل جائے گا۔ مجھ پر بھروسا رکھو" انہوں نے ایک نگاہ ہم پر ڈالی اور

اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ گاڑی نے سڑک پر پھسلنا شروع کر دیا' اگر آس پاس کے مناظر اور عمارتیں حرکت کرتے ہوئے نظر نہ آئیں تو یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ کار چل بھی رہی ہے یا کھڑی ہوئی ہے۔ اس میں کچھ خوبی تو وہاں کی سڑکوں کی تھی اور پھر کچھ شاید کار کی۔ ہمیں ٹورنٹو کی سڑکوں کا علم تو تھا مگر بہت زیادہ بھی نہیں۔ وہ مختلف سڑکوں سے گزرتی ہوئی ایک اونچی سی عمارت کی زیر زمین پارکنگ میں داخل ہوئیں کار پارک کی اور ہمیں بھی باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک لفٹ موجود تھی۔ ہم دونوں لفٹ کے ذریعے اٹھارویں منزل پر پہنچ گئے۔ لفٹ کی تیز رفتاری ایسی تھی کہ لمحوں میں سفر طے ہو گیا۔ اس دوران وہ ہماری جانب دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہیں۔ ہم بھی اخلاقاً مسکرا دیتے مگر کہاں تک؟ آخر چپ ہو کر رہ گئے۔

اٹھارویں منزل پر قالین پر چلتے ہوئے ہم ایک اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچے۔ انہوں نے پرس میں سے چابی نکالی اور دروازہ کھول کر پہلے ہمیں اندر داخل ہونے کی دعوت دی۔ دروازے کے اندر قدم رکھتے ہی ہمیں اپارٹمنٹ کی نفاست اور خوب صورتی کا اندازہ ہو گیا۔ فرش سے لے کر فرنیچر تک ہر چیز کا رنگ آف وہائٹ تھا۔ قالین اس قدر ملائم اور دبیز تھا کہ یوں لگا جیسے قدم برف میں دھنس گئے ہیں۔ دیواروں پر مصوری کے بیش قیمت نمونے آراستہ تھے۔ ہر چیز سے امارت اور نفاست کا اظہار ہو رہا تھا۔ ایک وسیع و عریض ڈرائنگ روم تھا جس کے ایک گوشے میں باہر کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم کی وسعت دیکھ کر کسی ہوٹل کی خوبی کا گمان گزرتا تھا۔ ایک جانب چھت تک ہلکے رنگین شیشوں کی دیوار تھی جس میں سے باہر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ مس کڈنی نے کوئی بٹن دبایا اور کمرے میں ہلکی موسیقی بکھر گئی۔

انہوں نے کہا "تشریف رکھیئے۔ ذرا فریش ہولیں۔" ہم نے تشریف تو رکھ لی مگر فریش ہونے کے منتظر تھے۔ بولیں "کیا پینا پسند کریں گے؟"

ہم نے کہا "کافی مل سکتی ہے؟"

وہ قدرے مایوس ہو گئی۔ پھر کہنے لگی "کیوں نہیں' میں ابھی کافی بناؤں گی۔"

انہوں نے ایک اور بٹن دبایا اور سامنے سے ایک دیوار ہٹ گئی اور سفید برف کے رنگ کا انتہائی خوب صورت کچن نظر آنے لگا۔ انہوں نے چند لمحوں میں کافی تیار کر لی اور پھر بار کی جانب جاتے ہوئے بولیں "کیا خیال ہے۔ تھوڑی سی رم یا برانڈی نہ ملا دوں کافی میں؟"

ہم نے پریشانی سے کہا "کافی میں شراب؟"

"شراب نہیں۔ یہ تو بس خوش ذائقہ مشروب بن جائے گا۔ ایک دم فریش ہو جاؤ گے۔"

ہم نے کہا "سوری ہم صرف کافی پی کر بھی فریش ہو جائیں گے۔"

انہوں نے قدرے منہ بنا کر ہماری جانب دیکھا اور پھر کافی کی دونوں پیالیاں لئے ہوئے صوفے کی جانب آگئیں۔ ہمارے نزدیک بیٹھ کر انہوں نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی۔

"جانی لمبارڈی کے ساتھ بات چیت چل رہی ہے آپ کی؟" انہوں نے دریافت کیا۔

"ہاں' نہیں۔ میرا مطلب ہے ابھی تو بس ابتدائی بات چیت ہوئی ہے۔"

وہ مسکرائیں اور کافی کا کپ سامنے سنہرے فریم والی شیشے کی میز پر رکھ کر ہمارے قریب کھسک آئیں۔ کہنے لگیں "بہت کام کا آدمی ہے جانی۔ شو بزنس کا کنگ ہے۔ زندگی بنا سکتا ہے۔"

ہم چپ چاپ کافی پیتے رہے جس میں چینی کم تھی اور دودھ بالکل نہیں تھا۔ یعنی بلیک کافی تھی مگر اخلاقاً خاموش رہے۔

ہم نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور انتہائی قیمتی فانوس کی جانب دیکھ کر پوچھا "مس کڈنی! کیا آپ کوئی بزنس کرتی ہیں؟"

مسکرا کر بولیں "ہاں' بزنس ہی کرتی ہوں۔ دراصل میں نے ایک آئل مین سے شادی کر لی تھی۔ طلاق کے بعد اس سے کافی روپیہ مل گیا۔ یہ فلیٹ بھی میں نے اسی پیسے سے خریدا تھا۔"

"بہت خوب" ہم کافی متاثر ہوئے۔

"اس کے بعد فی الحال کوئی شادی نہیں کی۔ جلدی بھی کیا ہے؟"

ہم نے بے اختیار کہا "ٹھیک تو ہے۔"

"آپ کی شادی ہو چکی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"ابھی تک باقی ہے یا میری طرح؟"

ہم نے کہا "ابھی تو ہے"

ہنس کر بولیں "چلو یہ بھی اچھا ہے۔ زندگی کا ہر رنگ دیکھنا چاہئے۔"

ہم نے کہا "آپ کا اپارٹمنٹ تو بہت اچھا ہے۔ سجایا بھی خوب ہے۔"

بولیں "بس ٹھیک ہی ہے۔ آیئے آپ کو دکھاتی ہوں۔"

انہوں نے ہمارے ہاتھ سے کافی کی پیالی لے کر میز پر رکھ دی اور ہاتھ تھام کر اٹھا لیا "آیئے نا۔"

ہم ان کے ہمراہ چل پڑے۔

"یہ سٹنگ روم تو دیکھ ہی لیا ہے" گیلری سے گزر کر ہم ایک کھلی جگہ پر پہنچ گئے "یہ لائبریری ہے" انہوں نے دروازہ کھولا۔ نہایت خوب صورت الماریوں میں کتابیں سجی ہوئی تھیں مگر زیادہ تو الماریوں میں آڈیو اور ویڈیو کیسٹ رکھے تھے۔ ایک بیش قیمت ڈیک بھی تھا اور کمرے میں چاروں طرف دیواروں اور چھت کے اندر اسپیکرز نصب تھے۔ انہوں نے پھر کوئی بٹن دبایا اور کمرہ موسیقی سے بھر گیا۔ کوئی خاتون نہایت درد بھری آواز میں گا رہی تھیں مگر بول کم تھے۔ سسکیاں اور آہیں زیادہ تھیں۔

"کیوں' پسند آیا؟"

نہ جانے وہ میوزک کے بارے میں پوچھ رہی تھی یا کمرے کے۔ بہرحال ہم نے اثبات میں سرہلا دیا۔

لائبریری میں لکھنے کی میز کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ آرام دہ صوفے اور کوچ البتہ سجے ہوئے تھے۔ یہ کمرہ بھی آف وہائٹ تھا "آیئے" انہوں نے کمرے سے باہر جاتے ہوئے کہا۔

دوسرا کمرہ بیڈ روم تھا۔ اس میں ہر چیز ہلکی نیلے رنگ کی تھی۔ بیڈ کے سرہانے آئینے لگے ہوئے تھے۔

"یہ گیسٹ روم ہے" وہ مسکرا کر بولیں۔

"بہت اچھا ہے" ہم نے کہا "خواہ مخواہ مہمان بننے کو جی چاہتا ہے۔"

"تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ بن جاؤ مہمان۔"

ہم نے کہا "پھر کبھی سہی۔"

"اس اپارٹمنٹ میں صرف دو بیڈ روم ہیں۔ ایک مہمانوں کے لئے اور دوسرا میرے لئے۔ آؤ دوسرا کمرہ بھی دیکھو۔"

انہوں نے پھر ہمارا ہاتھ تھام لیا اور ایک اور دروازے کی جانب بڑھیں "یہ میرا کمرہ ہے" دروازہ کھلتے ہی ہماری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ سارا کمرہ ہلکے گلابی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا اور ہر چیز اس قدر شاندار اور خوشنما کہ ہالی ووڈ کی فلموں کے سیٹ کا گمان ہوتا تھا۔ درمیان میں قدرے بلندی پر بیڈ تھا۔ وہاں ایک کنگ سائز بیڈ ہوتا ہے اور ایک کوئین سائز۔ یہ سب سے بڑے سائز کا بیڈ سمجھا جاتا ہے مگر اس کمرے میں جو بیڈ تھا اسے ایمپرر سائز کہنا چاہیے۔ بیڈ کاہے کو تھا اچھا خاصا بیڈ منٹن کورٹ تھا۔ دس پندرہ آدمی بڑے آرام سے اس میں سو سکتے تھے۔ بیڈ پر مخملیں پلنگ پوش' بے شمار تکیے اور کشن رکھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر ہلکے گلابی رنگ کے ریشمی پردے لٹکے ہوئے تھے۔ مس کڈنی نے کوئی بٹن دبایا اور تین جانب کی دیواروں کے پردے آہستگی سے ہٹ گئے۔ یہ تینوں دیواریں آئینوں کی تھیں جن میں کمرے کے عکس نظر آ رہے تھے۔ آئینوں کی دیواریں ہم نے پہلی بار دیکھی تھیں۔

"کیوں کیسا ہے؟" انہوں نے لگاوٹ سے پوچھا۔

"بہت شاندار"

وہ چہکتی ہوئی بیڈ کی جانب بڑھیں اور کود کر اس پر بیٹھ گئیں۔ تمام بیڈ پانی کی لہروں کی مانند اوپر نیچے ہونے لگا۔ یوں لگا جیسے سمندر میں جوار بھاٹا آ گیا ہو۔

چند لمحے وہ یوں ہی جھولا جھولتی رہیں۔ پھر بولیں "یہ واٹر بیڈ ہے" وہ ابھی تک ہچکولے کھا رہی تھیں "بیٹھ کر دیکھو"

ہم نے کہا "معاف کیجئے۔ ہمیں تیرنا نہیں آتا اور پانی سے ہمیں ڈر لگتا ہے۔"

وہ ہنسنے لگیں "مگر یہ پانی تو نہیں ہے۔ ڈرنے کی کیا بات ہے" ان کی آواز میں کچھ عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ کہنے لگیں "کوئی فلم دیکھنا پسند کرو گے۔"

فلم اور اس وقت؟"

میرا مطلب ہے ویڈیو فلم" انہوں نے نزدیکی سائڈ ٹیبل پر کوئی بٹن دبایا اور لمبے چوڑے بیڈ کے پائینتی کی جانب سے جو حصہ تھا اس پر نصب ٹیلی ویژن آن ہو گیا۔ ویڈیو فلم میں ایک خاتون ہانپتی ہوئی عجیب و غریب قسم کی ورزش کرنے میں مصروف تھیں۔ کیمرے نے زاویہ بدلا تو محض قدرتی لباس میں ایک صاحب بھی یوگا ٹائپ کی ورزش میں مصروف نظر آ گئے۔ پھر پتا چلا کہ ورزش اور یوگا وغیرہ کچھ نہیں تھا۔ ٹیلی ویژن پر کوئی بلیو فلم چلنے لگی تھی۔

"کیوں کیسی ہے؟ انہوں نے پوچھا۔

ہم نے کہا "ہمیں جانی لمبارڈی کے دفتر بھی جانا ہے

"ابھی تو کافی وقت ہے" انہوں نے اپنی کلائی پر لگی ہوئی سنہری گھڑی پر نظر ڈالی۔

"دراصل ہم اس وقت ذہنی طور پر کافی مصروف ہیں"

"کوئی حرج نہیں" انہوں نے دلاسہ دیا" پھر کبھی سہی" انہوں نے فلم آف کر دی "کتنے بجے وہاں پہنچنا ہے"

ہم نے کہا "بس وقت ہونے لگا ہے۔"

وہ بیڈ پر سے بل کھا کر اٹھیں تو دھاری دار شیرنی نظر آ رہی تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کے جسم پر دھاریاں دراصل کپڑے کی پٹیاں تھیں۔ بیڈ نے ایک بار پھر زور و شور سے ہلنا شروع کر دیا تھا مگر انہوں نے ایک چھلانگ لگائی اور کود کر قالین پر پہنچ گئی گویا وہ اس سمندر میں ڈوبنے سے بالکل محفوظ ہو گئیں۔

ہم نے پوچھا" کیا آپ نے ان لوگوں کے لئے جو تیرنا نہیں جانتے لائف بیلٹ کا بھی انتظام کر رکھا ہے؟"

انہوں نے بڑے انداز سے ہمیں گھورا اور بولیں "تمہارا سینس آف ہیومر بہت اچھا ہے۔ چلو میں تمہیں جانی لمبارڈی کے دفتر ڈراپ کر دوں۔"

ہم نے کہا "ہمیں اپارٹمنٹ پر چھوڑ دیں۔ ہم وہاں سے اپنی کار لے لیں گے۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" وہ کچھ مایوس نظر آنے لگیں شاید وہ خود بھی ہمارے ساتھ جانی لمبارڈی کے دفتر جانے کی خواہش مند تھیں، مگر مغربی ملکوں میں بلا وجہ ضد اور اصرار کرنے کا رواج نہیں ہے۔ اس لئے وہ خاموش ہو گئیں۔ راستے میں وہ ہم سے آئندہ فلم کے بارے میں باتیں کرتی رہیں۔ جانی لمبارڈی سے ملنے کا انہیں بہت اشتیاق تھا۔ بار بار کہہ رہی تھیں کہ میں جانی کی اور تمہاری اپنے اپارٹمنٹ میں دعوت کرنا چاہتی ہوں، مگر وہ بہت مصروف شخص ہے تم ہی کوئی راستہ نکالو۔ ہم خاموشی سے ان کی باتیں سنتے رہے۔ عقلمندوں نے کہا ہے کہ ایک خاموشی ہزار باتوں پر بھاری ہوتی ہے۔

مسٹر لالی کے دفتر میں داخل ہوئے تو سوا چار بج رہے تھے۔ مس کڈنی ہمیں خالق صاحب کے اپارٹمنٹ کے باہر ڈراپ کر کے چلی گئی تھیں۔ وہاں سے جانی لمبارڈی کے دفتر کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ ہمیں تنہائی نصیب ہوئی تو کار میں ہم نے مس کڈنی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ آخر منصور صاحب نے ان سے ہماری ملاقات کیوں کرائی ہے اور وہ چاہتی کیا ہیں؟ ایک خوب صورت اور دولت مند اکیلی عورت کو ہم سے ملنے کی ضرورت کس لئے پیش آ گئی؟ مگر منصور خاصے ہوشیار اور دنیا دار آدمی نظر آئے۔ مس کڈنی سے اس ملاقات کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہو گا۔ مسٹر لالی اپنے کمرے میں تنہا نہیں تھے۔ مسٹر دیال بھی ان کے ہمراہ موجود تھے اور حسب معمول بول رہے تھے۔ رام دیال ان لوگوں میں ہیں جو مسلسل تین منٹ بھی خاموش نہیں رہ سکتے اور ان کے منہ سے نکلنے والے الفاظ مشین گن کی گولیوں کی مانند خارج ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی وہ کسی مسئلے پر تقریر فرما رہے تھے۔ ہمیں دیکھا تو رک کر "ہیلو کیا حال ہے؟" کہا اور پھر اپنی گفتگو کا سلسلہ جوڑ دیا کافی کا پیالہ ان کے ہاتھ میں تھا مگر انہوں نے اس میں سے ایک گھونٹ بھی نہیں پیا تھا اس وقت وہ فلم ایکٹریسوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔

ہم سے ہاتھ ملانے کے بعد پہلے تو وہ لالی صاحب کی جانب متوجہ رہے مگر پھر یکایک رک گئے اور اردو میں ہم سے پوچھنے لگے "آفاقی صاحب! کیا آپ کے ملک کی ہیروئنیں بھی ایسی ہوتی ہیں؟"

ہم نے پوچھا "کیسی؟"

بولے "فلم ساز کو بے وقوف بنانے والی۔ ان کا مال خرچ کرانے والی۔"

ہم نے کہا "اس کا انحصار تو خود فلم ساز پر ہے' اگر اپنا ہی مال کھوٹا ہو تو سنار کا کیا دوش؟"

ہنسنے لگے "ٹھیک کہا آپ نے مگر بھگوان بچائے ان سے۔ اجی ایسے ایسے داؤ پیچ کرتی ہیں کہ فلم ساز بے چارہ تو حیران رہ جاتا ہے اور پھر اسے اپنی فلم بھی تو مکمل کرانی ہوتی ہے۔ ان کے نخرے تو سہنے ہی پڑتے ہیں۔"

مسٹر لالی نے کہا "دیال جی! آفاقی صاحب کو وہ بات تو بتائیں۔" اور دیال جی شروع ہو گئے۔

"اجی کیا بتائیں۔ ہماری بھارتی ہیروئنیں یوں تو سبھی اول نمبر کی لٹیری ہیں مگر یہ پروین بوبی تو سب کی باپ ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے ماں" ہم نے تصحیح کی۔

"اجی نہیں' باپ' بلکہ باپ کا بھی باپ۔"

ہم نے کہا "مگر وہ تو عورت ہے۔"

"کیسی عورت؟ سینکڑوں مردوں پر اکیلی بھاری ہے وہ تو پتا بھی ہے اس نے ہمارے کینڈین پارٹنرز کی ایسی درگت بنائی ہے؟" پھر ہمارا جواب سنے بغیر ہی کہنے لگے "دھر بنا لیا ہے بے چارے کو۔ شوٹنگ چھوڑ کر شاپنگ کرتی رہتی ہے۔ ایک وقت میں پانچ دس ہزار ڈالر تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ یہ دلوا دو' وہ دلوا دو۔ ایک بار مسکرا کر دیکھتی ہے اور دو چار ہزار ڈالر خرچ کرا دیتی ہے۔ میں تو پریشان ہو گیا ہوں کہ یہ فلم کیسے پوری ہو گی۔ ارے صاحب اس کا تو دیوالیہ نکل جائے گا۔"

"آپ اسے منع کیوں نہیں کرتے؟" مسٹر لالی بولے۔

"اجی کیا منع کریں' اور وہ سنے گا کسی کی؟ کچھ کہو تو اسے جا کر بتا دیتا ہے۔ عشق کر رہا ہے اور سمجھتا ہے وہ بھی سیریس ہے۔ ارے پروین بوبی اور کسی سے سیریس ہو گی۔ وہ تو بڑے بڑوں کو چکر دے چکی ہے۔ پوری آدم خور ہے۔ آدم خور" وہ سانس لینے اور سگریٹ سلگانے کو رکے تو مسٹر لالی نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ہمارے لئے بھی کافی کا آرڈر دے دیا۔

دیال صاحب کی نتھا پھر شروع ہو گئی کہ پروین بوبی کتنی چکر باز ہے۔ کس طرح ہر ایک کو بے وقوف بناتی ہے۔ شوٹنگ چھوڑ کر غائب ہو جاتی ہے۔ بہت دل پھینک ہے۔

ایک نمبر کی بدمعاش ہے۔ کس کس سے اس نے فلرٹ اور رومانس کیا ہے اور پھر کیا سلوک کیا اس کے ساتھ۔ "اور یہ رینا رائے بھی کچھ کم تو نہیں۔ پتا ہے کیا کرتی ہے؟"

ہم نے انکار میں سر ہلا دیا۔

کہنے لگے "اجی بس چھوڑیئے۔ یہ بہت لمبے قصے ہیں"

یکایک انہوں نے اپنی گھڑی کی جانب نگاہ کی اور کافی کا پیالہ میز پر رکھ کر کھڑے ہو گئے "اوکے پھر میں چلتا ہوں۔ بہت کام ہیں" انہوں نے کرسی کی پشت سے لٹکا ہوا کوٹ پہن لیا "مگر آپ کے ندیم کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ایک منٹ میں یہ لمبے لمبے ڈائیلاگ یاد کر لیتا ہے۔ ری ٹیک کرانا تو جانتا ہی نہیں۔ مسٹر آفاقی! آپ کے آرٹسٹ فنٹاسٹک ہیں۔ اوکے' پھر ملیں گے۔ لالی! میرا کام یاد رکھنا۔ جا کر دیکھتا ہوں کام کا کیا حال ہے۔ بائی" وہ کمرے سے رخصت ہوئے تو یکایک کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ یہ سوچ کر بہت تعجب ہوا کہ صرف ایک شخص نے کمرے میں کس قدر شور مچا رکھا تھا اور یہ بھی پتا چل گیا کہ بقول رام دیال کے ہیروئن کی ذات ہر جگہ ایک جیسی ہوتی ہے۔ ہمیں تو اپنے ملک کی ہیروئن ان کے مقابلے میں بالکل سیدھی سادی اور بے ضرر نظر آنے لگیں۔

کچھ دیر ہم دونوں ہیروئنوں کی صفات کے بارے میں گفتگو کرتے رہے اور اپنے اپنے تجربات بیان کرتے رہے۔ مسٹر لالی کو ہم نے یہ بھی بتا دیا کہ ہم فی الحال کوئی پروگرام نہیں بنا سکے ہیں ان کا مشورہ یہ تھا کہ اگر ہم اپنے طور پر فلم بنائیں تو جانی لمبارڈی سینما گھروں میں اور ٹی وی پر اس کی ریلیز کے سلسلے میں ہمارے لئے بہت کارآمد ثابت ہو گا۔ لالی صاحب میں ہم نے بظاہر ویسا تعصب نہیں پایا جو چندر شیکھر کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

ہم نے پوچھا "آپ مس کڈنی کو جانتے ہیں؟"

وہ اپنی کرسی پر ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے "مس کڈنی ڈرہم؟"

ہم نے کہا "ڈرہم ورہم تو ہم نہیں جانتے مس کڈنی ان کا نام ہے" پھر ہم نے ان کے سامنے ان کا نقشہ بھی بیان کر دیا۔

"اوہ' آپ اس سے کہاں ملے؟ میرا مطلب ہے وہ آپ کو کہاں ٹکرا گئی؟"

ہم نے کہا "ایک پاکستانی ملاقاتی نے تعارف کرایا تھا۔"

"وہ تو بہت خطرناک چیز ہے۔ اس کے پاس فرلانگ تک جانا بھی زہر ہے زہر۔"

ہم حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگے وہ رازداری کے انداز میں ہماری جانب جھک کر بولے "اچھی شہرت نہیں ہے اس کی۔ ہائی کلاس طوائف ہے۔"

ہمیں ان کی باتوں میں کچھ صداقت سی نظر آنے لگی تھی۔ مس کڈنی کے انداز' ان کا اپارٹمنٹ' ان کے گھر کی آرائش بیڈ روم کا ماحول' آئینے والی دیواریں' ویڈیو فلم وغیرہ وغیرہ۔

"اس سے دور ہی رہیے ورنہ بدنام ہو جائیں گے' مشکل میں بھی پڑ سکتے ہیں۔"

ہمیں مسٹر منصور پر غصہ آنے لگا۔ لالی صاحب نے ہماری آنکھیں کھول دی تھیں۔

گھر واپس جانے کے لئے جانی لمبارڈی کے دفتر سے رخصت ہو کر واپس چلے تو اچانک پولیس کاروں کے سائرن بجنے لگے۔ آوازیں ہماری جانب بڑھ رہی تھیں۔ ہم تو سڑک کے ایک جانب تھے مگر دوسرے کار والوں نے بھی اپنی کاریں ایک جانب کر لیں اور پولیس کاروں کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ سائرن کی آواز پر ان ملکوں میں ٹریفک خبردار ہو جاتا ہے۔ سائرن کا مطلب ہے ایمبولینس' یا پولیس۔ دونوں صورتوں میں شہری راستہ صاف کر دیتے ہیں تاکہ رکاوٹ نہ رہے۔

پولیس کاروں کے سائرن ابھی ہم تک نہیں پہنچ پائے تھے کہ پیچھے سے شور غل کی آوازیں آئیں۔ یہ فٹ پاتھ پر چلنے والے راہ گیروں کی آوازیں تھیں۔ پھر ایک سیاہ رنگ کی لمبی سی کار آندھی اور طوفان کی رفتار سے نمودار ہوئی۔ بریکوں کی آوازوں سے فضا گونجنے لگی۔ سڑک اور فٹ پاتھوں پر چلنے والے پریشانی سے تتر بتر ہو گئے۔ کار بے تکے انداز میں تیزی سے نمودار ہوئی اور سامنے والے ٹریفک سے بچنے کے لئے بار بار بریک لگانے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ جس تیزی سے کار نمودار ہوئی تھی اسی برق رفتاری سے ہمارے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گئی۔ اس کے عقب میں پولیس کاروں کے سائرنوں اور تین چار کاروں کی آوازیں نمودار ہوئیں۔ پولیس کاریں بھی اندھا دھند دوڑ رہی تھیں۔ کاروں کے بریکوں کی آوازوں نے فضا میں سنسنی سی پھیلا دی تھی۔ فلموں میں تو ہم نے کار چیزنگ کے مناظر بہت دیکھے تھے مگر حقیقت میں یہ منظر پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ اگلی

کار تو بے قابو تھی ہی مگر پولیس کاریں بھی مہارت کے باوجود عجیب سے بے ہنگم انداز میں دوڑ رہی تھیں۔ یکا یک فضا فائرنگ کی آوازوں سے گونجنے لگی۔ یہ فائرنگ پولیس والوں کی کاروں سے ہو رہی تھی۔ ماحول کی کشیدگی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ ہم نے بہتر جانا کہ اپنی کار کو ایک جانب فٹ پاتھ کے ساتھ روک لیں۔ یہ بھاگ دوڑ ایک یا ڈیڑھ منٹ سے زیادہ دیر تک نہیں رہی۔ اگلی سیاہ کار اور پولیس کی کاریں مختلف قسم کی آوازیں اور شور پیدا کرتی ہوئی نمودار ہوئیں اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ مگر اتنی دیر میں سڑک پر افراتفری پھیل گئی۔ پیدل چلنے والوں نے بھاگ کر دکانوں میں پناہ لی۔ کار والے سہم کر سڑک پر ایک جانب ہو گئے۔ بعض ڈرپوک یا محتاط قسم کے لوگوں نے ہماری طرح کار ایک جانب روک دی۔ کاروں کا شور اور فائرنگ کی آوازیں جس طرح اچانک نمودار ہوئے تھے اسی طرح فضا میں تحلیل ہو گئے۔ مگر بہت سے کمزور دل حضرات اور خواتین بہت دیر تک اپنے دل کو سنبھالنے میں مصروف رہے۔ ہم بھی تازہ ہوا کھانے کی غرض سے کار سے باہر نکل آئے۔ ایک بڑی بی جو بہت رنگین لباس پہنے ہوئے تھیں اور پورے میک اپ میں تھیں اپنی سرخ رنگ کی چھتری تھامے ہوئے ہمارے نزدیک آئیں اور پوچھنے لگیں "ینگ مین! یہ سب کیا تھا۔ کیا کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے؟"

ہم نے کہا "پتا نہیں۔ ہم تو اس شہر میں اجنبی ہیں۔ کیا آپ یہیں رہتی ہیں؟"

بولیں "پانچ سال کی عمر میں یوگوسلاویہ سے آئی تھی۔ اس کے بعد ٹورنٹو چھوڑ کر نہیں گئی۔ پتا ہے! میں نے اپنے ایک شوہر کو صرف اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ وہ شکاگو میں نوکری کرنا چاہتا تھا۔"

ہم نے کہا "اوہو' یہ تو آپ نے بہت برا کیا۔"

وہ ہمارے چہرے کے نزدیک اپنا منہ لا کر رازداری کے انداز میں کہنے لگیں "سچ بتاؤں؟ دراصل مجھے بھی بہانہ ہی چاہئے تھا۔ اول نمبر کا شرابی اور جواری تھا۔"

ہم نے بھی سرگوشی میں پوچھا "تو پھر اس سے شادی کیوں کی تھی؟"

ایک سرد آہ بھر کر بولیں "جوانی میں سبھی غلطیاں کرتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی نہیں کی؟"

ہم نے بھی سرد آہ بھری اور کہا "کیا بتائیں' موقع ہی نہیں ملا۔"

"جھوٹے کہیں کے۔" انہوں نے شوخی سے مسکرا کر چھتری کا ہینڈل ہمارے بازو پر مارا۔ پھر برابر سے گزرنے والی ایک نوجوان لڑکی سے مخاطب ہو کر بولیں "سنو لڑکی تم ٹورنٹو میں ہی رہتی ہو نا؟"

لڑکی نے رک کر کہا "جی ہاں"

"تو پھر بتاؤ کہ ابھی سڑک پر کیا ہو رہا تھا۔ کیا یہ کسی فلم کی شوٹنگ تھی؟"

لڑکی نے غصے سے ناک سکیڑ کر کہا "پولیس والے خرمستیاں کر رہے تھے۔ انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ بس اسی طرح دندناتے پھرتے ہیں اور جو کوئی حادثہ ہو جاتا یا کسی بے گناہ راہ گیر کو گولی لگ جاتی تو کون ذمے دار ہوتا؟"

"ٹھیک کہا تم نے۔ ہمارے زمانے میں پولیس والے بہت شریف ہوا کرتے تھے۔ خیر۔ اپنی اپنی قسمت ہے" وہ آگے بڑھ گئیں۔

نوجوان لڑکی نے اب ہمیں دیکھا تو پوچھا "تم ٹورسٹ ہو؟"

ہم نے سر ہلا دیا۔

کہنے لگی "کیا تمہارے ملک میں بھی پولیس یہی کچھ کرتی ہے؟"

ہم نے کہا "بہت کچھ کرتی ہے۔ یہ تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔"

"واقعی؟" اس نے حیرت سے ہمیں دیکھا۔ بولی "تمہارا جو بھی ملک ہے اللہ تم پر رحم کرے" اور رخصت ہو گئی۔

اگلے دن ٹورنٹو اسٹار اور دوسرے اخبارات اس واقعے کی خبروں اور تصاویر سے بھرے ہوئے تھے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ یہ ٹرنٹو میں اپنی قسم کا پہلا واقعہ تھا۔ اخبار والوں نے پولیس کو خوب آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ پولیس کا کہنا تھا کہ ایک کار بہت تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ پولیس نے روکا تو کار والوں نے رفتار اور بڑھا دی۔ پولیس کا خیال تھا کہ کار میں یقیناً جرائم پیشہ لوگ بیٹھے ہیں۔ چنانچہ تعاقب شروع ہو گیا۔ دوسرے پولیس والوں کو بھی وائرلیس کے ذریعے اطلاع پہنچا دی گئی۔ کار والوں نے پولیس کو اپنے تعاقب میں دوڑتے ہوئے پایا تو رفتار مزید بڑھا دی اور پولیس کا شک یقین میں بدل گیا کہ ہو نہ ہو اس کار میں مجرم سوار ہیں بس پھر کیا تھا جب پولیس کی کاریں "مجرموں" کی کار کے نزدیک نہ پہنچ سکیں تو پولیس نے انہیں روکنے یا ڈرانے کے لئے فائرنگ شروع کر دی اس بھاگ

دوڑ کا انجام یہ تھا کہ آدھے شہر کی خاک چھاننے کے بعد اگلی کار ایک فوارے سے ٹکرا گئی اور اس میں سوار ایک شخص ہلاک اور دوسرا زخمی ہو گیا۔ پولیس کاریں بھی مختلف مقامات پر ٹکرائیں مگر کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ کاریں البتہ برباد ہو گئیں۔ پولیس کی اندھا دھند فائرنگ سے ایک کتا اور ایک بچہ زخمی ہو گئے۔ تحقیقات پر پتا چلا کہ سیاہ کار میں سوار مسافر مجرم نہیں تھے۔ محض شرابی تھے اور چالان سے بچنے کے لئے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ شراب پی کر کار چلانا کینیڈا میں بھی جرم ہے اور اس پر نہ صرف بھاری جرمانہ ہوتا ہے بلکہ ڈرائیونگ لائسنس بھی ضبط کر لیا جاتا ہے۔ کئی اخباروں نے یہ سرخی لگائی تھی "سپاہی اور ڈاکو ۔۔۔۔۔۔ ٹورنٹو کی سڑکوں پر بلی اور چوہے کا کھیل۔"

متعلقہ پولیس والوں کے خلاف تحقیقات کے نتیجے میں کئی سپاہی معطل ہو گئے۔ مرنے اور زخمی ہونے والوں کو ہرجانہ دیا گیا۔ اس طرح یہ قصہ ختم ہو گیا مگر دوسرے دن دیال صاحب ہمیں مسٹر لالی کے دفتر میں ملے تو انہوں نے بتایا کہ پروین بوبی اور کینیڈا والے فلم ساز کو بھگوان نے بال بال بچا لیا ورنہ ان کی کار بھی الٹ جاتی۔ پھر بولے "مجھے افسوس ہے کہ سڑک پر ہمارا یونٹ موجود نہیں تھا ورنہ مفت میں کار چیزنگ کا سین ہو جاتا"

دوسرے دن صبح سویرے ہمیں ایک ٹیلی فون موصول ہوا۔ کوئی صاحب سلیس اردو میں پوچھ رہے تھے "یہ آپ ہی بول رہے ہیں نا؟"

ہم نے کہا "ظاہر ہے۔"

بولے "تو پھر مجھے پہچانیں۔ کون بول رہا ہوں؟"

ہم نے دماغ پر بہتیرا زور ڈالا اور ان کی آواز اور لب و لہجہ پہچاننے کی کوشش کی مگر کافی دیر بعد بھی نہ جان سکے۔

وہ بولے "ہار گئے نا؟"

ہم نے کہا "بالکل ہار گئے۔"

بولے "میرے بھائی میں جاوید ہاشمی بول رہا ہوں۔"

جاوید ہاشمی پرانے شناسا ہیں۔ کراچی میں حاکم علی زرداری صاحب نے بمبینو سینما بنایا تو جاوید صاحب اس کے جنرل منیجر تھے۔ بعد میں انہوں نے فلم تقسیم کار ادارے میں بھی کام کیا اور دو تین فلمیں بھی بنائیں۔ صوفیہ بانو کو اپنی فلم میں ہیروئن بنانے کے لئے وہی بمبئی سے تلاش کر کے لائے تھے۔ صوفیہ بانو اپنی پہلی فلم میں جلوہ گر ہوئیں تو ایسٹرن اسٹوڈیو کے مالک اور فلم ساز سعید ہارون صاحب نے ان سے کہا "جاوید صاحب! ایک جان دو قالب تو سنا تھا مگر ایک جان دو آواز آپ کی مہربانی سے دیکھ لیا ہے۔"

بات یہ تھی کہ صوفیہ بانو بولتی تھی تو ان کے منہ سے دو آوازیں نکلتی تھیں لگتا تھا ڈوئیٹ میں ڈیالاگ بول رہی ہیں۔ انہوں نے پاکستان کی کئی فلموں میں کام کیا اور پھر شادی کر کے گھر بسا لیا جو ان کا انتہائی دانش مندانہ فیصلہ تھا۔

جاوید ہاشمی صاحب بے حد باتونی اور انتہائی مجلسی آدمی ہیں۔ ۱۹۷۰ کی دہائی کے آغاز میں جا کر کینیڈا میں آباد ہو گئے۔ ابھی تک وہیں رہتے ہیں۔ مشہور کیمرا مین سہیل ہاشمی ان کے چھوٹے بھائی ہیں۔

جب شناخت کا مرحلہ طے ہوا تو انہوں نے فوراً ملاقات کی دعوت دی۔ ٹورنٹو میں یونگ اسٹریٹ ہی پر آگے جا کے ایک سینما تھا جس کے وہ جنرل منیجر تھے۔ اس ادارے کے تین سینما تھے اور تینوں کا انتظام جاوید صاحب ہی کے سپرد تھا۔ ہم نے ہچر مچر کی تو بولے "میرے بھائی! جیسے بیٹھے ہیں ویسے ہی اٹھ کر آ جائیں۔"

ہم نے کہا "ہم تو صرف تولیہ لپیٹ کر بیٹھے ہیں۔"

بہت ہنسے اور بولے کہ اس کے نیچے کم از کم ایک پتلون ضرور پہن لیں۔

ہم سینما پہنچے تو ایک خوش جمال دوشیزہ گلے میں ٹرے لٹکائے آئس کریم اور چاکلیٹ وغیرہ بیچتی پھر رہی تھیں۔ ہر طرف نظر دوڑائی مگر منیجر کے نام کی تختی نظر نہیں آئی۔ آخر انہی سے پوچھ لیا۔ وہ چیونگم چباتے ہوئے بولیں "تہہ خانے میں آپ کو مل جائیں گے۔"

ہم نے کہا "اس کا راستہ کس طرف سے ہے؟"

بولیں "وہ تو خود ہی تلاش کرنا پڑے گا۔"

دراصل تہہ خانے کا راستہ لابی ہی میں تھا۔ ایک کونے میں سے سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں نیچے گئے تو ایک کمرے میں جاوید ہاشمی تشریف فرما تھے۔ بڑے خلوص سے بغل گیر ہوئے۔ ان کے سامنے میز پر سینما ٹکٹوں اور نوٹوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ دو لڑکیاں اور دو

لڑکے ان کے ارد گرد کھڑے ہوئے تھے۔ جنہیں وہ ضروری ہدایات دے رہے تھے۔

ہم نے کہا "کیا بات ہے۔ یہاں بھی ٹکٹوں کی بلیک کرانے لگے؟"

بولے "قسم خدا کی یہاں تو بلیک کی صورت کو ترس گئے ہیں۔" خاص تبدیلی ہم نے یہ پائی کہ وہ جو ہر دم فلمیں بنانے کی باتیں کیا کرتے تھے اب فلموں سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ صرف بنی بنائی فلموں کو سنیما میں دکھانے کے گناہ گار تھے۔ بنانے کے نام پر کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔

بولے "وہاں تو ہمیں ہیروئن ڈھونڈے سے نہیں ملتی تھی۔ یہاں ہر طرف ہیروئن نظر آتی ہے۔"

ہم نے کہا "پینے والی یا ایکٹنگ کرنے والی۔"

بولے "یہ دیکھئے سامنے دو لڑکیاں کھڑی ہیں۔ ہیروئن بننے کے قابل ہیں یا نہیں؟"

اب جو ہم نے غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ فلم کی ڈبل کاسٹ سامنے موجود تھی۔ دونوں لڑکیاں اور دونوں لڑکے صورت شکل کے اعتبار سے ہیرو ہیروئن بننے کے قابل تھے۔

جاوید صاحب کہنے لگے "یہاں اچھی شکلوں کی اتنی بہتات ہے کہ قدر ہی نہیں رہی" پھر پوچھنے لگے "کیا آپ یہاں فلم بنانے آئے ہیں؟"

ہم نے کہا "بن جائے گی تو شکایت بھی نہیں کریں گے۔"

جاوید صاحب نے ایک منٹ سوچا پھر سگریٹ کا کش لے کر بولے "بس تو بن گئی آپ کی فلم۔"

"وہ کیسے؟"

"ہمارے ایک پاکستانی دوست ہیں جو فلم بنانا چاہتے ہیں پیسے کی کمی نہیں ہے، شوق بھی ہے۔ مناسب اور معقول شخص کی تلاش میں تھے آپ کے آنے سے وہ تلاش بھی پوری ہو گئی۔"

انہوں نے فوراً ٹیلی فون ملایا اور کافی دیر تک کسی سے گپ شپ کرتے رہے پھر فون بند کرنے کے بعد گفتگو کا خلاصہ یہ بتایا کہ وہ کل آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ جہاں کہیں گے آ جائیں گے۔ ہم نے نواب صاحب کے پینٹ ہاؤس کا پتا بتا دیا۔

"بس میرے بھائی! اب باقی باتیں بھول جائیں۔ بس سمجھئے کہ فلم بن گئی آپ کی' لیں سگریٹ پئیں" جاوید ہاشمی میں ہمیں ذرا سا بھی فرق نظر نہیں آیا۔ سگریٹ وہ سالہا سال سے پیتے ہیں مگر اس طرح لگتا ہے ان کی زندگی کا پہلا سگریٹ ہے اور منہ سے دھواں ایسے پھونک مار کر نکالتے ہیں جیسے سامنے والے پر دم کر رہے ہوں یا پڑھ کر پھونک رہے ہوں۔

"حضور بس کل کا کھانا آپ کے ساتھ ہو گیا۔"

جاوید ہاشمی صاحب کا گھر ایک نواحی بستی میں واقع ہے اچھی پر فضا جگہ ہے۔ یہ ایک ٹاؤن ہاؤس ہے جس میں جاوید صاحب اپنی بیگم اور بچوں کے ہمراہ رہتے ہیں۔ بچوں کا تو خیر یوں ہی تذکرہ سمجھ لیجئے کیونکہ ان کے سبھی بچے ماشاء اللہ بڑے اور شادی شدہ ہیں اور اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ گویا عام طور پر اس گھر میں جاوید ہاشمی اور ان کی بیگم قیام پذیر ہیں۔ ان کی بیگم کے پکائے ہوئے کھانے ہم کراچی میں بھی کھاتے رہے ہیں اور ٹورنٹو میں بھی کھائے۔ دونوں جگہ ذائقہ یکساں پایا۔ بلکہ کینیڈا میں ملاوٹ سے پاک اشیائے خوردنی کی دستیابی کے باعث شاید لذت زیادہ ہو گئی۔ ادھر ادھر کی گپ شپ کے بعد پہلے تو جاوید ہاشمی نے اپنے بارے میں تفصیل بتائی کہ وہ کیسے کینیڈا پہنچے: وہ ۷۰ کے آغاز میں کینیڈا گئے تھے کیونکہ پاکستان میں فلمی صنعت کے حالات سے مایوس ہو چکے تھے۔ جاوید ہاشمی نے بمبئی میں بھی فلموں سے واسطہ رکھا اور کراچی میں بھی اس سے متعلقہ کاموں میں مصروف رہے۔ ہدایت کاروں کے معاون بنے پروڈکشن کنٹرولر رہے۔

پھر کراچی ں حاکم علی زرداری صاحب نے بہت خوب صورت اور نیا سینما تعمیر کرایا تو اس کے "مختار کُل" بن گئے۔ زرداری صاحب ان کی صلاحیتوں کے ایسے معترف ہوئے کہ پھر کسی نہ کسی طور جاوید صاحب کا ان سے مستقل واسطہ رہا۔ یہاں تک کہ وہ کراچی سے رخصت ہوئے تو وہاں اپنے کزن مظفر علی صاحب کو حاکم صاحب کے سپرد کر گئے۔ حاکم علی زرداری سے ہماری پہلی ملاقات، کراچی کے بمبینو سینما ہی میں ہوئی تھی۔ وہ فلموں کے شائق بھی تھے اور اچھی فلموں اور فلم سازوں کے قدردان بھی۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ سیدھا سادا بے تکلف اور باتونی شخص کسی زمانے میں پاکستان کی سیاست کا ایک اہم ستون بن جائے گا۔ بے نظیر بھٹو صاحبہ کا سسر کہلائے گا اور اس کے حق میں اور مخالفت میں لاکھوں افراد صف آرا ہوں گے۔ خیر، مستقبل تو ایک بند مٹھی کی طرح ہوتا ہے۔ حاکم علی زرداری ایک بہت کامیاب بزنس مین ضرور تھے مگر سیاست میں بھی بہت نام اور ہنگامہ پیدا کریں گے یہ شاید خود انہوں نے بھی نہ سوچا ہو گا۔

جاوید ہاشمی صاحب ان کے بہت معترف اور مداح ہیں۔ انہوں نے آصف زرداری کا بچپن بھی دیکھا ہے اور انہیں گود میں کھلایا ہے۔ افسوس کہ یہ سب کچھ کئی سال قبل ہو گیا ورنہ ہم ان سے آصف زرداری اور حاکم علی زرداری صاحب کے بارے میں کچھ ذاتی تاثرات حاصل کر لیتے۔

جاوید ہاشمی بہت باتونی اور دلچسپ آدمی ہیں۔ انہوں نے ایک دنیا دیکھ رکھی ہے۔ مختلف قسم کے کام کرتے رہے ہیں۔ فلمی صنعت میں تقسیم کاری، ہدایت کاری اور نمائش کاری کے شعبوں میں بھی کام کیا ہے فلم ان کا پہلا اور آخری شوق ہے مگر جب پاکستان میں فلموں کا حُلیہ بگڑتے ہوئے دیکھا اور اس کے مستقبل سے مایوس ہوئے تو سات سمندر پار کینیڈا میں جا بیٹھے۔ وہاں تین سینماؤں کے منیجر ہیں اور اپنا کام قریب قریب اسی ڈھب سے کرتے ہیں جس طرح پاکستان میں کرتے تھے۔ یعنی ہمیں تو انہیں دفتر میں کام کرتے ہوئے دیکھ کر کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوا۔ ہاں ایک فرق یہ ضرور دیکھا کہ کراچی میں سینما کا عملہ خالص مردانہ تھا جب کہ ٹورنٹو میں ان کے عملے میں لڑکیاں اور خواتین بھی شامل ہیں۔ مغرب میں جا کر بس جانے والے بے شمار پاکستانیوں سے ہماری ملاقات ہوئی اور ہم نے ہر ایک کو پریشان اور نادم ہی پایا۔ مالی فوائد اور آسائش کی جستجو میں یہ لوگ وطن کی سر زمین چھوڑ کر چلے تو گئے مگر مغرب میں سوائے جسمانی آسائش و آرام کے انہیں کوئی اور فائدہ نہ ملا بلکہ جسمانی آسائش بھی نہیں ہے کیونکہ مشین کی طرح کام کرتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کی خواہش یہی ہے کہ کسی طرح موقع ملے تو پاکستان واپس چلے جائیں، مگر جاوید ہاشمی ان چند لوگوں میں سے ہیں جو کینیڈا میں بہت خوش ہیں آرام سے رہتے ہیں، کام کرتے ہیں، چھٹیاں مناتے ہیں، پہاڑوں پر گھومتے ہیں، کیمپنگ کرتے ہیں اور سکھ کی نیند سوتے ہیں۔

کہنے لگے "ہمیں تو اب پتا چلا کہ زندگی کا لطف کیا ہے اور زندگی کیسے گزارنی چاہئے۔ کوئی فالتو جھنجھٹ، کوئی دفتری مسئلہ، کوئی ذہنی پریشانی نہیں ہے۔

اپنے سارے بچوں کی شادیاں کر چکے ہیں جو ان سے ملنے آتے رہتے ہیں۔ کینیڈا طرز زندگی کے اعتبار سے تو امریکی ہے مگر سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہاں سوشل سیکیورٹی کا نظام برطانوی انداز کا ہے۔ یعنی بے کاری الاؤنس بھی ملتا ہے اور بیماری کی صورت میں علاج اور دوا دارو بھی مفت۔ یہ سہولت امریکہ میں نہیں ہے بلکہ وہاں تو اگر کوئی بیمار پڑ جائے تو سمجھئے کہ ایک مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔ جاوید ہاشمی کی ایک بیٹی اپنے شوہر کے ساتھ سعودی عرب میں رہتی ہیں مگر زچگی کے لئے کینیڈا پہنچ جاتی ہیں اور اس طرح ہزاروں ڈالر بچالیتی ہیں۔

"خیر' یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ اب اپنی فلم کا سنائیے" وہ بولے۔

ہم نے انہیں تمام صورت حال بتادی۔

بولے "یہ سب لوگ فلم بنانے کے خواہش مند ہیں۔ اب آپ کے ساتھ ان کا کیا بندوبست ہوتا ہے یہ الگ بات ہے۔ میرے بھی یہاں کافی تعلقات ہیں۔ کسی مرحلے پر بھی میری ضرورت محسوس ہو بلا تکلف فون کر لیجئے۔ یہ بھی خیال رکھئے کہ میں یہاں کے لوگوں اور حالات کے بارے میں آپ کو بہت سے کار آمد مشورے دے سکتا ہوں۔"

ہم نے ان سے واجد صاحب کے بارے میں پوچھا' کہنے لگے "میرے آج کل ان سے اچھے تعلقات نہیں ہیں' مگر وہ ذاتی مسائل ہیں۔ جہاں تک فلم سازی کا تعلق ہے وہ آپ کے لئے بہت مدد گار ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہاں ایک فلم بنا بھی چکے ہیں۔ کافی تجربہ بھی ہے انہیں۔"

جب واجد صاحب کا وزیٹنگ کارڈ ہم نے دیکھا تو سمجھے کہ شاید کوئی انتہائی مغرب زدہ' انگریز قسم کے آدمی ہوں گے' منہ میں پائپ ہوگا' سر پر ہیٹ' جسم پر سوٹ اور دل میں مغرب کی محبت۔ کارڈ پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا "ایب واجد" اس کے بعد لمبا چوڑا کمپنی کا نام پتا درج تھا۔ بہت سے کام اور ٹیلی فون وغیرہ مگر جب ان سے ملاقات ہوئی تو وہ بالکل مختلف آدمی نکلے۔ بلکہ پہلی ملاقات میں تو خاصی مایوسی ہوئی۔ سانولا رنگ' بڑی بڑی آنکھیں' سیاہ بال' ہلکی مونچھیں' ڈاڑھی غائب' بات بات پر قہقہے اور نہایت رواں اور شستہ اردو لب و لہجہ جس میں تھوڑا سا کھٹا پن بھی تھا۔ وجہ یہ تھی کہ حیدر آباد دکن سے تعلق رکھتے تھے۔ سالہا سال کراچی میں رہے بعد میں کینیڈا پہنچ گئے۔ لب و لہجے میں

تھوڑی سے جو کھٹائی تھی اس کا سبب ان کا حیدر آبادی ہونا تھا۔ "حضت۔ بولے تو' مزاجاں کیسے ہیں" قسم کی باتیں تو نہیں کرتے تھے مگر کبھی کبھی بول چال میں حیدر آبادی اردو کا تڑکا لگا دیتے تھے۔ ملتے ہی انہوں نے نان اسٹاپ باتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تکلف بھی کیا جو چار منٹ سے زیادہ قائم نہ رہ سکا۔ اس کے بعد جو بے تکلف ہوئے تو الفاظ کا دریا بہا دیا۔

پہلی ہی ملاقات میں گھر چلنے کی دعوت دی۔ اپنا سارا کچا چٹھا بیان کر دیا۔ ہماری جو فلمیں دیکھ چکے تھے ان کی تفصیل اور کہانیاں بھی سنا دیں۔ اپنے بارے میں تو خیر جو بتایا سو بتایا خود ہمارے بارے میں بھی بہت کچھ بتا دیا۔ گاہے گاہے لطیفے بھی سنائے اور اشعار بھی' مگر راتوں کو راتاں اور براتوں کو براتاں نہیں کہا۔ ہم تو خاصے متاثر ہوئے کہ یہ ایب واجد صاحب چیز کیا ہیں۔

ہمارے بولنے کی باری آئی تو ہم نے پوچھا "یہ آپ نے اپنا نام "عیب واجد" کیوں رکھا ہے؟ بڑا عجیب سا نام ہے۔ آپ کے اندر کون سا عیب ہے؟"

وہ بہت ہنسے' بولے "یہ عیب نہیں' ایب ہے۔ عین والا نہیں الف والا ایب۔"

ہم نے پوچھا "یہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے کیا معنی ہیں؟"

فرمایا "دراصل یہ عبدالواجد کا مخفف ہے۔ کچھ نیا سا لگتا ہے نا؟"

ہم نے کہا "بہت نیا لگتا ہے بلکہ عجیب سا لگتا ہے۔"

بولے "ویری گڈ۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ انگریز وغیرہ تو اسے ماڈرن سمجھ کر اس سے متاثر ہوتے ہیں اور پاکستانی لوگ سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔ دیکھئے نا کتنی بڑی بات ہے کہ میرا کارڈ دیکھتے ہی لوگ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں' میں انہیں سوچنے پر مجبور کر دیتا ہوں۔"

ہم نے پوچھا "اب آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں۔ ہم آپ کو واجد کہیں یا عیب کہیں۔"

کہنے لگے "اگر عیب کہنا ہے تو پھر عیبی کہیں۔ یہ زیادہ رواں اور پیارا لگے گا اور بامعنی بھی ہو جائے گا۔ ویسے ناپسند نہ ہو تو واجد کہہ لیں۔"

ہم ان کی زندہ دلی اور حاضر جوابی کے قائل ہو گئے۔ بعد میں ان کی اور بہت سی

خوبیوں کے بھی قائل ہوئے' انہوں نے کینیڈا میں جو اردو فلم بنائی تھی وہ بھی ویڈیو پر دکھائی۔ اس کے بعد فلم میں کام کرنے والے اداکاروں سے ملایا۔ سب کے سب شوقیہ فن کار تھے اور پہلی بار کیمرے کے سامنے آئے تھے۔ بعض نے اچھی خاصی اداکاری کی تھی۔ ہدایت کاری میں جہاں بھی خامیاں تھیں واجد صاحب پہلے ہی ہمیں بتاتے رہے اور ساتھ میں کہتے "دیکھئے نا' اناڑی جو ہوا۔"

واجد صاحب نے اس فلم میں اداکاری بھی کی تھی۔ یہ ایک مزاحیہ کردار تھا۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اچھی اداکاری کی تھی۔ فلم کے خاتمے پر انہوں نے پوچھا "کیا خیال ہے؟"

ہم نے کہا "بہتر ہو گا کہ آپ ہدایت کاری سے توبہ کرلیں۔ اداکاری بہت اچھی کرتے ہیں کامیڈین بن سکتے ہیں۔"

کہنے لگے "میں بھی یہی چاہتا ہوں ہدایت کاری تو مجبوراً کی تھی۔"

ٹورنٹو میں فلم سازی کے سلسلے میں لوگوں سے ملاقاتیں شروع ہو گئیں یہ کاروباری ملاقاتیں کم تھیں' دعوتیں زیادہ تھیں۔ شوکت صاحب کے گھر دعوت' دوسرے ہونے والے حصے دار کے گھر دعوت اور واجد صاحب کے گھر تو دعوتوں کا کوئی شمار ہی نہیں تھا انہیں دعوتیں کھلانے کا شوق تھا۔ بات بات پر گھر لے جا کر دعوت کھلانے کا بہانہ ڈھونڈتے تھے۔ ہم نے یہ اندازہ لگایا کہ دراصل انہیں گپ شپ کا شوق تھا۔ کام وام کی بات بھی ہو جاتی تھی۔ ہم نے بھی نواب خالق کے پینٹ ہاؤس میں ان سب کو چند دعوتیں کھلائیں۔ ایک دعوت میں نواب صاحب بھی اتفاق سے موجود تھے۔ قصہ یہ تھا کہ ہم نواب صاحب کے دولت کدے پر مہمان ٹھہرے ہوئے تھے مگر یوں لگتا تھا جیسے گھر ہمارا ہے اور نواب صاحب مہمان ہیں۔ اول تو وہ بیرونی دوروں اور آمدورفت میں رہتے تھے ٹورنٹو میں ان کا قیام مختصر ہوتا تھا اور اس دوران میں بھی وہ بے حد مصروف رہا کرتے تھے اس لئے ملاقات کا اتفاق کم ہی ہوا کرتا تھا۔ مگر جب ملتے تو ہم لوگ برسوں کے بچھڑے ہوئے لوگوں کی طرح ملتے گپ شپ اور چائے کافی' بے حد دیسی قسم کے عجیب و غریب ناموں کے کھانے جو نواب صاحب کی فرمائش پر ہماری بیگم پکایا کرتی تھیں۔ بچیاں کھانوں کے نام سن کر اور ان کا مزہ چکھ کر حیران ہوا کرتی تھیں۔

ایک روز جب نواب صاحب نے ایک عجیب و غریب کھانے کی فرمائش کی تو نادیہ نے پوچھا "انکل' اتنے بہت سے نئے نئے کھانوں کے نام آپ کہاں سے یاد کر کے آتے ہیں؟" فلموں کی باتیں شروع ہوئیں تو ہمارا بھی دل لگ گیا۔ جانی لمباردی نے ہمارے لئے دیدہ و دل فرش کر دیا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ ہم ان کے پروگرام میں کہیں فٹ نہیں تھے اردو یا ہندی کا ایک پروگرام وہ پیش کرتے تھے جو مسٹر لالی کے ذمے تھا۔ کسی اور پروگرام کی گنجائش ہمیں نظر نہیں آئی اور نہ ہی ہمیں کوئی دلچسپی پیدا ہوئی' مگر جب فلم سازی کا قصہ چھڑ گیا تو ہم سب کچھ بھول بھال کر اس میں لگ گئے۔

اگلے دن انہوں نے ایک خوبرو نوجوان سے ہماری ملاقات کرائی۔ ہم فوراً پہچان گئے۔ یہ ان کے فلم کے ہیرو اعظم صاحب تھے۔ ان ہی کی نئی نویلی بیگم نے اس فلم میں ہیروئن کا کردار کیا تھا۔ بیگم کا تو اداکاری سے دل بھر گیا مگر اعظم صاحب کو اداکاری کا جنون تھا جو ایک فلم کی ہوا کھا کر اور تیز ہو گیا۔ وہ کسی موٹر ساز کمپنی میں کام کرتے تھے مگر اس فکر میں تھے کہ اگر ہم انہیں اداکار بنا دیں تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان آ جائیں۔ قدو قامت اور صورت شکل کے اعتبار سے وہ بنے بنائے ہیرو تھے انہوں نے کراچی میں پرورش اور تعلیم پائی تھی۔ ان کی بیگم کا تعلق بھی کراچی سے تھا اپنے چار پانچ سالہ بیٹے کی طرف سے بہت پریشان تھے۔

"کیا بات ہے' پریشانی کس بات کی ہے؟"

بولے "یہاں کا ماحول تو آپ نے دیکھا ہے اس بچے کا اخلاق خراب ہوا جا رہا ہے۔"

ہمیں ہنسی آ گئی "بھئی اتنے چھوٹے سے بچے کا اخلاق کیسے خراب ہو گا؟"

کہنے لگے "یہی تو عمر ہے سیکھنے اور اثر لینے کی۔ اس نے تو ہوش ہی کینیڈا میں سنبھالا ہے۔ بڑا ہو کر تو یہ ہمارے ہاتھ سے ہی جائے گا۔ زبان نہیں سنی آپ نے اس کی۔ پکا کینیڈین لگتا ہے حرکتیں بھی بالکل ویسی ہیں۔ دو چار سال بعد گرل فرینڈز بھی لے کر آیا کرے گا۔"

وہ اپنے بچے کی طرف سے اتنے پریشان تھے کہ کچھ عرصے بعد انہوں نے اسے نانا نانی کے پاس کراچی بھیج دیا۔

دو تین دن تک وہ بہت اداس اور پریشان رہے۔ ان سے زیادہ پریشانی ان کی بیگم شرمین کی تھی کہ خدا جانے بچے کا کیا حال ہو گا۔ کراچی کا ماحول اسے راس بھی آئے گا یا نہیں وہ تو گھبرا جائے گا۔ دوسرے ہی دن سے انہوں نے پاکستان ٹیلی فون کرنے شروع کر دیے مگر کال نہیں ملتی تھی۔ تیسرے دن خدا خدا کر کے فون کی لائن ملی تو انہوں نے اپنے خسر صاحب سے علیک سلیک کے بعد بچے کے بارے میں پوچھا' وہ بولے "بالکل ٹھیک اور خوش و خرم ہے"

انہوں نے دریافت کیا "کیا کرتا رہتا ہے۔ ہمیں مس تو نہیں کرتا؟"

جواب ملا "جب سے آیا ہے ایک بار بھی تم لوگوں کا نام نہیں لیا۔ ہر وقت کھیلتا رہتا ہے۔ اس وقت بھی برابر والے فلیٹ کے بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔"

امریکہ' کینیڈا بڑے لوگوں کے لئے جنت ہو گی مگر بچوں کے لئے جہنم سے کم نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ زندگی بے حد منظم اور پابند ہے' ساتھ کھیلنے کے لئے اول تو ہم عمر بچے نہیں ملتے اور اگر خوش قسمتی سے مل بھی جائیں تو کھیل اور گھر سے باہر نکلنے کا بھی وقت مقرر ہے۔ پابندیاں اتنی زیادہ ہیں کہ بیشتر وقت بچے تنہا اور بے زار رہتے ہیں۔ ٹی وی پر کارٹون دیکھنے کے سوا چھوٹے بچوں کی اور کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پھر موسم بھی پریشان کرتے ہیں۔ سردیوں کے موسم میں گھروں کے اندر بند رہنا پڑتا ہے۔ برف باری اور بارش سے عاجز آ جاتے ہیں۔ دھوپ نکلے تو عید ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں پاکستان میں ہر وقت دھوپ کی چمک دمک رہتی ہے۔ پھر کھیل کود پر کوئی پابندی نہیں۔ چاہے ہر وقت کھیلتے رہیں۔ کھیلنے کے لئے ہم عمر بچوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ ہر عمر اور سائز کے ڈھیروں بچے ہر وقت دستیاب ہیں بھلا ایسے مزے بچوں کو یورپ' امریکہ اور کینیڈا میں کب ملتے ہیں؟"

دوسرے دن ننھا صاحب کا فون آیا وہ اپنے کسی عزیز کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے' پوچھنے لگے "آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟ میرا مطلب ہے عارضی طور پر ٹکے ہیں یا مستقل طور پر ٹھہر گئے ہیں؟"

ہم نے کہا "بہت عارضی طور پر بلکہ آپ اسے مختصر عارضی قیام کہہ سکتے ہیں۔"

بولے "آپ اپنا پتا بتائیے' میں ابھی وہاں پہنچ جاتا ہوں۔"

ہم نے انہیں پتا بتا دیا ان ملکوں میں نہ پتا بتانا مشکل ہے اور نہ ہی بتائے ہوئے پتے پر پہنچنے میں مشکل پیش آتی ہے وجہ یہ ہے کہ سڑکوں' گلیوں' مکانوں کے ترتیب وار نمبر ہوتے ہیں یہ نہیں ہوتا کہ ایک جگہ ۴۴ نمبر ہے اور ۴۵ نمبر دو تین فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ پتا دریافت کرنا اور پتا بتانا بھی ہمارے ملک میں ایک ثقافتی مصروفیت ہے۔ اس کا ایک مخصوص رنگ ڈھنگ ہے۔ مثلاً آپ نے کسی صاحب سے زید کا پتا دریافت کیا وہ بولیں گے "آپ ایسا کریں کہ فلاں سڑک پر چلے جائیں اور فلاں محلے میں جا کر ایک پان کا کھوکھا ہے' وہاں سے بائیں مڑیں گے تو تھوڑے فاصلے پر گندگی کا ڈھیر ملے گا' ادھر سے دائیں مڑ کر جب چوتھی گلی میں جائیں گے تو وہ آگے جا کر بند ہو جائے گی' اس لیے آپ چوتھی گلی میں نہ جائیں' اس سے پہلے والی گلی میں چلے جائیں جو آگے جا کر تین چار گلیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے' آپ پہلی گلی میں جا کر چوک میں پہنچ جائیں گے۔ اب آپ وہاں کسی سے بھی پوچھ لیں کہ یتیم خانہ کدھر ہے۔ یتیم خانے کے پاس جا کر آپ دو گلیاں چھوڑ کر تیسری گلی سے اندر چلے جائیں' جس جگہ گٹر بند ہو وہاں سے دائیں جانب مڑ جائیں اور پھر پچاس قدم چل کر الٹے ہاتھ کی سڑک پر جا کر کسی سے بھی پوچھ لیں کہ اپنے معصوم صاحب کدھر رہتے ہیں' مگر نہیں' معصوم صاحب کو نہ پوچھیں' وہاں انہیں کوئی نہیں جانتا البتہ ان کا بیٹا بو شیطان کی طرح مشہور ہے بس کسی سے بھی بو کا پوچھ لیں۔ وہ آپ کو وہیں پہنچا دے گا۔" اس پتے کے مطابق آپ عموماً ٹھوکریں کھاتے پھریں گے مگر معصوم صاحب کا گھر نہیں ملے گا یا پھر ملے گا تو کسی اور محلے میں ہو گا۔ خیر اپنے اپنے طریقے ہیں۔

ننھا صاحب آدھے گھنٹے بعد تشریف لے آئے۔ آتے ہی بولے "یہ آپ کی بلڈنگ کی لفٹ بہت تیز چلتی ہے میں تو ڈر رہا تھا کہ کہیں تیزی میں ۲۱ ویں منزل سے بھی باہر نہ نکل جائے۔ ویسے بلڈنگ کافی اچھی اور اونچی ہے۔ آس پاس کی بلڈنگوں کی کھڑکیاں وغیرہ بھی نظر آتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے اب تک ایک طاقتور دوربین ضرور خرید لی ہو گی اگر نہیں خریدی تو آج ہی خرید لیجئے ایسے موقعوں کے لئے بہت کار آمد چیز ہے۔" پھر جب ہماری بیگم کو آتے ہوئے دیکھا تو فوراً بات بدل دی' کہنے لگے "دوربین کا یہ فائدہ ہے کہ بھابی کو آس پاس کے گھروں میں رکھے ہوئے فرنیچر کے ڈیزائن اور کپڑوں

کے فیشن دیکھنے میں آسانی ہو جائے گی اور بچیاں اپنی پسند کے کھلونے بھی دیکھ لیں گی۔"
کامیڈین ہمارے پاکستان میں اور بھی بہت سے گزرے ہیں اور کچھ ابھی تک گزر رہے ہیں مگر ننھے جیسے کامیڈین بار بار نہیں پیدا ہوتے۔ وہ نہایت ذہین' حاضر جواب' شگفتہ مزاج اور زندہ دل آدمی تھے۔ بات بات میں الفاظ کی پھلجھڑیاں چھوڑتے رہتے تھے۔ لطیفے انہیں بے شمار یاد تھے اور ہر بار نئے سے نیا لطیفہ سنا کر کہتے:
"سر' خلق خدا کی بھلائی کے لئے اسے آگے چلا دیجئے۔"
ان کا کہنا تھا کہ لطیفوں کو آگے نہ پہنچانا بھی ظلم ہے۔ کئی لطیفے خود بھی گھڑ لیا کرتے تھے۔ بال کی کھال نکالنا بھی ان پر ختم تھا۔ مثلاً ہمارے پاس ایک کینیڈین صاحب کو دیکھا تو پوچھنے لگے "جناب' آپ کی ینگ اسٹریٹ تو میں نے آسانی سے تلاش کر لی مگر اولڈ اسٹریٹ اور چائلڈ اسٹریٹ کس طرف ہے؟ کالج روڈ کا سائین بورڈ تو میں دیکھ چکا ہوں۔ اب گرلز اسٹریٹ کا پتا بھی بتا دیجئے۔"
ہم نے کہا "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ ینگ اسٹریٹ نہیں' یونگ اسٹریٹ ہے۔"
کہنے لگے "تب ہی تو میں بھی حیران ہوں کہ ینگ اسٹریٹ میں یہ اتنے بہت سے بوڑھے کیوں نظر آ رہے ہیں"
ہم انہیں آس پاس کی سڑکوں پر گھمانے پھرانے لے گئے۔ انہوں نے ماحول کو بہت پسند کیا۔ خواتین کی خوب صورتی اور دلربائی سے بہت متاثر ہوئے۔ بولے "سمجھ میں نہیں آتا' یہاں کی عورتیں اتنی اسمارٹ کیسے ہو جاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں بھی کچھ عرصے یہاں رہ جاؤں تو خاصا اسمارٹ ہو جاؤں گا اور کسی عورت سے ترکیب استعمال بھی پوچھ لوں تو اچھا رہے گا۔"
"کس چیز کی ترکیب؟"
"اسمارٹ اور دبلے پتلے رہنے کی۔"
ہم نے انہیں اس بلڈنگ میں رہنے والے ایک صاحب سے ملایا "یہ مسٹر جبرئیل ہیں۔"
ننھا نے ان سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا "بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"
پھر ہم سے بولے "یورپ' امریکا آنے کا یہ فائدہ ہے کہ یہاں فرشتوں سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ مثلاً جبرئیل' میکائیل' اسرافیل' بس یہ ڈر لگتا ہے کہ کہیں مسٹر عزرائیل نہ مل جائیں فوراً جان قبض کر لیں گے۔"
ہم نے انہیں بتایا کہ یہاں ایک فلم بنانے کا پروگرام ہے۔ وہ فوراً بچوں کی طرح مچل گئے "وعدہ کیجئے کہ مجھے اس فلم میں ضرور رکھیں گے۔"
"وعدہ کرتے ہیں"
"ایسے نہیں' قسم کھائیے۔"
ہم نے کہا "بھئی آپ کی طرح قسمیں کھانا ہمیں اچھا نہیں لگتا۔"
بولے "آپ یقین کیجئے کہ میں نے قسمیں کھانا بھی چھوڑ دیا ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے پر مکمل ڈائٹنگ کر رہا ہوں۔ کچھ بھی نہیں کھاتا۔"
ننھے کو اسی رات نیویارک روانہ ہو جانا تھا۔
کہنے لگے "ہمارے ساتھ تو دھوکا ہو گیا۔"
"کیسا دھوکا؟"
"ہم تو امریکا یہ سوچ کر آئے تھے کہ گوروں سے ملاقات ہو گی مگر یہاں تو ہر قدم پر کالوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ کوئی خاص مہمان نواز بھی نہیں ہیں۔ ٹورنٹو پھر بھی غنیمت ہے۔ اب دوبارہ امریکہ جا رہا ہوں۔ میرے لئے دعا کیجئے گا۔"
اس طوفانی دورے کے بعد ننھا صاحب اپنے عزیز کے ہمراہ رخصت ہو گئے۔ جاتے جاتے ایک بار پھر تاکید کر گئے کہ کینیڈا میں بنائی جانے والی فلم میں انہیں ضرور کاسٹ کیا جائے ورنہ.....
"ورنہ کیا؟"
بولے "ورنہ کیا۔ اتنی دور آکر آپ کا کیا بگاڑ لیں گے۔"

ایک طرف تو ننھا صاحب فلم میں کام کرنے کے لئے مرے جا رہے تھے اور دوسری طرف ایک پاکستانی جمیل مراد صاحب تھے جن کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ ہماری فلم کی تمام ضرورتیں بنفس نفیس پوری کر دیں اور فلم مکمل کرا دیں۔ وہ ہمیں کبھی تو نئے چہروں کے بارے میں معلومات فراہم کرتے کبھی شوٹنگ کے لئے مناسب مقامات کا پتا بتاتے۔ کبھی کہانی کے بارے میں مفید مشورے دیتے۔ ایک دو بار انہوں نے کچھ خواتین کے بارے میں بھی سفارشی کلمات کہے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ فلموں میں کام کرنے کے لئے بہت موزوں اور مناسب ہیں۔ وہ جب بھی آتے دو چار گھنٹے سے پہلے ہماری جان نہیں چھوڑتے تھے۔ ہم یہ سوچ کر صبر کر لیا کرتے تھے کہ جب فلم کے منصوبے کا آغاز ہو گا تو وہ ہمارے لئے کافی کار آمد ثابت ہوں گے۔

ایک دن وہ بہت جوشیلے انداز میں آئے اور بتایا کہ انہوں نے ہماری فلم کی شوٹنگ کے لئے ایک بہت شاندار مکان دیکھ لیا ہے۔ مکان کیا ہے اچھا خاصا محل ہے۔ عمارت کے آس پاس بہت بڑا باغ ہے۔ مکان میں سجاوٹ کا ہر سامان موجود ہے۔ ہم نے انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ بھائی' ابھی تو فلم کے لئے موضوع اور کہانی کا بھی انتخاب نہیں ہوا ہے۔ شوٹنگ کے لئے مکان دیکھنے سے فائدہ؟ خدا جانے ہماری فلم کے کردار امیر ہوں گے یا غریب ہوں گے۔ ان کے لئے محل نما مکان دیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟

وہ بولے "دیکھئے سر! کہانی لکھنا تو آپ کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ کردار امیر ہوں یا غریب یہ بھی آپ کے لئے کچھ مشکل نہیں ہے۔ یہ تو آپ کے ہاتھ کی بات ہے۔ چاہے امیر بنا دیں' چاہے غریب بنا دیں اور پھر اگر غریب بھی ہوں گے تو کیا وہ کسی محل میں نہیں جا سکتے؟ وہ چندہ مانگنے کے لئے یا نوکری تلاش کرنے کے لئے بھی تو کسی کے محل میں جا سکتے ہیں۔ بس آپ ایک بار وہ جگہ دیکھ لیجئے۔ دل خوش ہو جائے گا آپ کا۔"

ہم جان گئے کہ یہ شخص وہ جگہ دکھائے بغیر دم نہیں لے گا۔ چنانچہ دو دن کے بعد ان کے ساتھ جانے کا پروگرام بنا لیا۔ واپسی پر ہمیں واجد صاحب نے لفٹ دینے کا وعدہ کیا تھا مگر ان کا ٹیلی فون آ گیا کہ وہ ایک اچانک اور بے حد ضروری کام کی وجہ سے نہیں آ سکیں گے۔ جمیل مراد صاحب کو ہم پہلے ہی رخصت کر چکے تھے لہٰذا ٹیکسی کے سوا کوئی اور ذریعہ سفر نہ تھا۔ ریستوران سے باہر نکلے تو سامنے سے آتی ہوئی ایک نہایت شاندار اور قیمتی کار پر نظر ڈالی۔ ہم ٹیلی فون بوتھ سے ٹیک لگا کر ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے ہو گئے۔ کار فٹ پاتھ پر ہمارے نزدیک آ کر کھڑی ہوئی تو ہم نے اس کی چھت پر چمکتے ہوئے الفاظ کو دیکھا۔ یقین نہیں آیا کہ ایک رولز رائس کار بھی ٹیکسی ہو سکتی ہے مگر وہ ہماری آنکھوں کے سامنے تھی۔ رولز رائس انتہائی قیمتی کار ہے۔ اس زمانے میں اس کی قیمت ایک لاکھ تیس ہزار ڈالر تھی۔ رئیسوں اور بادشاہوں کی اس سواری کو ٹیکسی کے طور پر چلتے ہوئے دیکھا تو حیران رہ گئے۔ اس کے اندر جو خاتون تشریف فرما تھیں وہ بھی آن بان میں کار سے کم نہ تھیں۔ ایک شاندار اور بھڑک دار لباس پہنے ہوئے وہ ہماری جانب دیکھ رہی تھیں۔ ہم ڈرتے ڈرتے ان کے نزدیک گئے۔ سیاہ رنگ کی بے حد لمبی کار شیشے کی مانند چمک رہی تھی۔ کار کی لمبائی چوبیس پچیس فٹ سے کم نہ ہو گی۔ ڈرائیور کی سیٹ پر جو خاتون بیٹھی تھیں انہوں نے کہنیوں تک سفید براق دستانے پہن رکھے تھے۔ گلابی رنگ کے نفاست سے ترشے اور سلیقے سے ترتیب دیے ہوئے بالوں پر ایک منا سا ہیٹ رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک بہت لمبے سے سگریٹ ہولڈر میں لگی ہوئی سگریٹ ایک سونے کے سگریٹ لائٹر کی مدد سے جلانے میں مصروف تھیں۔ ہم اتنے مرعوب ہوئے کہ کچھ دیر کے لئے تو ارادہ ہی بدل دیا مگر ان کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں آگے بڑھے اور دریافت کیا "معاف کیجئے۔ یہ کار' میرا مطلب ہے یہ ٹیکسی کار خالی ہے؟"

انہوں نے بڑی نزاکت سے ایک کش لیا اور بولیں "آپ کا کیا خیال ہے؟ ٹیکسی میں میرے علاوہ کوئی فرد بشر موجود نہیں ہے۔ میری موجودگی کا سبب یہ ہے کہ یہ خود بخود چلنے والی ٹیکسی نہیں ہے۔ اسے چلانے کے لئے ایک ڈرائیور کی ضرورت ہے اور میں شوفر ہوں۔"

پہلے تو دل میں آئی کہ ان سے کہیں چھوڑیے کیوں مذاق کرتی ہیں۔ ایسا لباس فاخرہ پہننے والی بارعب شخصیت شوفر تو نہیں ہو سکتی۔ مگر پھر انہیں جھٹلاتے ہوئے بھی شرم آئی۔ اس لئے جھجکتے ہوئے کہا" دراصل ہم اس شہر میں پردیسی ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہاں ایسی شاندار کاریں بھی ٹیکسی کے طور چلتی ہیں۔"

تنک کر بولیں "یہ اپنی نوعیت اور ماڈل کی پہلی اور منفرد ٹیکسی ہے۔ سارے ٹورنٹو میں ایسی دوسری ٹیکسی نظر نہیں آئے گی اور نہ ہی ایسی شوفر ملے گی مگر یہ ذرا مہنگی ہے۔"

دریافت کیا "مثلاً؟"

بولیں "میں ایک گھنٹے کا کرایہ ایک سو ڈالر چارج کرتی ہوں۔"

ہم نے دوبارہ انہیں غور سے دیکھا۔ ان کی شاندار کار کو دیکھا' دل ہی دل میں حساب لگایا کہ ہمیں جس جگہ پر چلنا ہے وہاں کا فاصلہ پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہیں ہے۔ گویا تیس چالیس ڈالر کا خرچہ ہو گا۔ مگر اس کے مقابلے میں ٹھاٹ باٹ بھی تو دیکھئے۔ رولز رائس کار' ٹورنٹو کی سڑکیں' ایک انتہائی خوبرو اور بنی سنوری خاتون شوفر۔ ایسے موقعے زندگی میں بار بار تو نہیں آتے۔ سوچا کہ اپنی آنے والی نسلوں کو بتایا کریں گے کہ ہم بھی رولز رائس کاروں میں گھوما کرتے تھے اور شوفر کے طور پر گوری میمیں ہوا کرتی تھیں۔

ہم ان ہی سوچوں میں گم تھے کہ ان خاتون کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ وہ پوچھ رہی تھی "آپ کو کہیں جانا ہے یا پھر میں جاؤں؟"

ہم نے کہا "ہمیں یونگ اسٹریٹ تک جانا ہے۔"

"تو پھر تشریف رکھئے۔"

ہم خود ہی کار کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئے۔ دراصل یہ کار اتنی لمبی ہوتی ہے اور اس میں اتنے بہت سے دروازے ہوتے ہیں کہ رئیس لوگ تو جب اس پر سواری کرتے ہیں تو دروازے کھولنے اور بند کرنے کے لئے کئی کئی ملازم رکھتے ہیں۔ بہرحال 'گندم اگر بہم نہ رسد' بھس غنیمت است۔ نہ سہی ملازم' رولز رائس کار اور خاتون ڈرائیور تو ہے۔ اپنے دل کو یوں ہی تسلیاں دیتے ہوئے ہم کار کے اندر بیٹھ گئے۔ اب ہم کار کے اندر کا حال کیا بیان کریں۔ جس قدر رعب داب باہر ہے اس قدر اندر بھی ہے۔ سیٹیں اس قدر

کشادہ کہ چاہے بیٹھیں' چاہے لیٹیں اور اس قدر آرام دہ کہ یوں لگا جیسے ہم اس میں غرق ہو جائیں گے۔ کار کا اندرونی حصہ خوشبو سے مہک رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ شوفر خاتون کی مہربانی تھی ورنہ رولز رائس کاروں کے ساتھ خوشبو سپلائی کرنے کا کوئی واقعہ ہمارے علم میں نہیں ہے۔"

انہوں نے کار اسٹارٹ کی اور وہ چلنے بھی لگی مگر قسم لے لیجئے جو ہمیں کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی ہو یا چلنے کا احساس ہوا ہو۔ جس طرح سطح آب پر مرغابیاں اور بطخیں بے آواز اور نہایت روانی اور سکون کے ساتھ تیرتی ہیں اسی طرح ہماری ٹیکسی بھی سڑک پر چل رہی تھی۔ ویسے ٹیکسی کا لفظ اس کار کے ساتھ استعمال کرنا رولز رائس کار کی توہین تھی مگر حقائق کو جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔

چند لمحے بعد شوفر خاتون کی آواز ہمیں بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ دراصل یہ کار اتنی لمبی چوڑی تھی کہ ایک دو آدمی تو اس میں بیٹھ کر گم ہو جاتے ہیں۔ ہمیں بھی صاحب آواز کو تلاش کرنا پڑا۔ ہم انہیں دائیں جانب ڈھونڈتے رہے جب کہ وہ بائیں جانب تشریف فرما تھیں کیونکہ امریکہ اور کینیڈا میں ٹریفک دائیں ہاتھ چلتا ہے اس لئے ڈرائیور بائیں ہاتھ پر بیٹھتا ہے۔ کچھ دیر بعد ہم نے انہیں تلاش کر لیا۔ وہ ہم سے دریافت کر رہی تھیں کہ ان کی سگریٹ نوشی پر ہمیں اعتراض تو نہیں ہے؟ ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا بلکہ اس وقت تو ماحول اس قدر پرسکون اور لطیف تھا کہ اگر ہمارے پاس سگریٹ یا سگار ہوتا تو خود بھی شوق فرماتے۔ جی میں آئی کہ ان سے ایک سگریٹ مانگ لیں۔ پھر سوچا' یہ معیوب بات ہو گی۔ انہوں نے دوسرا سوال کیا "کیا آپ ٹورسٹ ہیں؟"

ہم نے کہا "تقریباً"

"کسی ایشیائی ملک سے آئے ہیں؟"

ہمنے کہا "جی ہاں' پاکستان سے "

انہوں نے سگریٹ کا ایک کش لینے میں معاملہ گول کر دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ پاکستان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھیں۔ اس کے بعد ہماری گفتگو کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ ہم نے بھی کوشش نہیں کی۔ سچ پوچھئے تو ان کی قدر منزلت ہماری نگاہوں میں کافی

کم ہو گئی تھی۔ جو شخص ہمارے ملک ہی سے واقف نہ ہو اسے بھلا ہم کیا خاک پسند کرتے؟

ہمیں تو پتا نہیں چلا کہ کار کس وقت رک گئی کیونکہ نہ جھٹکا لگا نہ آواز سنائی دی۔ البتہ باہر کے مناظر جو حرکت کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے یکایک ٹھہر گئے۔ سامنے جو حرکت کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے یکایک ٹھہر گئے۔ سامنے یونگ اسٹریٹ کا سائن بورڈ نظر آ رہا تھا۔ ہم انہیں کچھ آگے چل کر ٹاور بلڈنگ تک جانے کا مشورہ دینے والے تھے مگر پھر سوچا کہ خواہ مخواہ بل میں اضافہ ہو جائے گا۔ اس لئے ان کا شکریہ ادا کیا اور بل کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے سامنے سے اسٹاپ واچ اٹھائی اور اس میں وقت ملاحظہ کیا۔ دراصل ہمارے سفر کے آغاز ہی میں انہوں نے سامنے سے اسٹاپ واچ آن کر دی تھی۔ اس طرح اندازے سے وقت معلوم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ منٹ اور سیکنڈ کی تفصیل بھی سامنے آ جاتی ہے۔ پھر انہوں نے ایک چھوٹا سا کیل کولیٹر اٹھایا۔ چند بٹن دبائے اور پھر بولیں "تیس ڈالرز اور پندرہ سینٹ۔"

ہم نے ان کی خدمت میں ۳۵ ڈالرز پیش کر دئے۔

انہوں نے بقایا دینے کے لئے اپنا پرس اٹھایا مگر ہم نے کہا "باقی آپ تحفے کے طور پر قبول کر لیجئے" دراصل یہ کہنا کہ ٹپ رکھ لیجئے ہمیں اچھا نہیں لگا۔"

رولز رائس سے اتر کر ہم نے چاروں طرف بڑے فخر سے دیکھا کہ لوگوں پر کچھ رعب بھی پڑ رہا ہے یا نہیں؟ مگر کسی نے ہماری طرف توجہ نہ دی تو ہم نے مجبوراً اپنے گھر کی جانب پیدل مارچ شروع کر دیا۔

اس واقعے کے تین روز بعد جمیل مراد صاحب ہمارے پاس آئے اور بولے کہ وہ شوٹنگ کے لئے ہمیں ایک نہایت خوب صورت عمارت دکھانا چاہتے ہیں۔ ہم نے انہیں بہت سمجھایا کہ بھائی ابھی تو فلم کی کہانی کا بھی کوئی پتا نشان نہیں ہے۔ بلا وجہ لوکیشن دیکھنے کا کیا فائدہ؟ مگر وہ کہنے لگے "آپ کو پتا نہیں کہ وہ کس کا گھر ہے؟"

"کس کا گھر ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"ایک بے حد مالدار اور باوقار خاندان کا محل ہے اور میں نے ان سے وقت لے لیا ہے اب اگر ہم وہاں نہ گئے تو بہت برا ہو گا۔"

مجبوراً ہمیں جانا پڑا۔ شہر کے ایک شاندار علاقے میں یہ عمارت واقع ہے۔ آس پاس بھی خاندانی رئیس اور دولت مند لوگ ہی رہتے ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر پر شوکت عمارات' وسیع اور خوب صورت باغات اور نہ جانے کیا کیا۔ یوں تو یہ تمام شہر ہی خوب صورت ہے مگر یہ علاقہ کچھ زیادہ ہی خوش نما لگا۔ ویسے بھی دوسرے ملکوں میں ہماری طرح یہ نہیں ہوتا کہ امیر لوگ اپنے لئے شاندار گھر بنا لیتے ہیں اور ان کی سجاوٹ پر بھی توجہ دیتے ہیں مگر گھر کی چار دیواری کے باہر گندگی کے ڈھیر نظر آتے ہیں ٹوٹی پھوٹی سڑکیں' گرد و غبار' نہ سبزہ' نہ درخت' حالانکہ چار دیواری کے اندر جنت کا سماں ہوتا ہے۔ سبزہ زاروں سے گزرتے ہوئے ہم ایک نہایت شاندار آہنی دروازے پر پہنچے تھے۔ کسی شاہی محل کا دروازہ نظر آتا تھا مگر چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ نہ کوئی چوکیدار نہ محافظ' نہ پہرے دار مراد صاحب نے اپنی کار اس دروازے میں داخل کر دی اور ہماری نظروں کے سامنے حد نظر تک خوب صورت درختوں اور سبزہ زاروں کا سلسلہ پھیل گیا۔ ان کے درمیان ایک سیمنٹ کی ڈرائیو وے تھے۔ عمارت کا دور دور تک کوئی پتا نہ تھا=

ہم نے پوچھا "اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

جواب ملا "مکان دیکھنے اور کہاں۔ اس سڑک کی لمبائی سے نہ گھبرایئے یہ عمارت آٹھ ہزار مربع فٹ رقبے پر پھیلی ہوئی ہے اور اس کے ارد گرد سوا ایکڑ کا باغ ہے۔"

ہم نے کہا "مراد صاحب' یہ آپ ہمیں کہاں لے آئے بھائی صاحب! خدا جانے ہماری کہانی کی ضرورت کیا ہو گی۔ خواہ مخواہ اتنا شاندار مکان دیکھنے کی ضرورت کیا ہے؟"

کہنے لگے "آپ گھبراتے کیوں ہیں۔ اگر ضرورت نہیں ہو گی تو نہ سہی۔ ہم کون سا ایگریمنٹ یا اسٹامپ پیپر لکھ کر دے رہے ہیں۔"

کافی لمبا سفر طے کرنے کے بعد ہمیں سفید اور سرخ رنگ کی عمارت نظر آنے لگی کسی والئی ریاست کا محل بھی کیا ہو گا۔ ایک پورچ نما چیز کے سامنے مراد صاحب نے کار روک دی اس عمارت کے سامنے کچھ فاصلے پر چار رولز رائس کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ نزدیک ہی ایک گہرے سرخ رنگ کی اسپورٹس کار بھی تھی۔ کیوں نہ ہو' آخر ایک دولت مند کا گھر تھا۔ مراد صاحب نے بتایا کہ دو رولز کاریں گیراج میں بھی کھڑی ہیں۔

ہم نے پوچھا "یار کیوں خواہ مخواہ ہمیں مرعوب کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

بولے "مرعوب نہیں کر رہا' صحیح صورت حال بتا رہا ہوں۔"

اونچے اونچے ستونوں کے لمبے سے برآمدے میں داخل ہو کر مراد صاحب نے ایک شاندار چمکتے ہوئے اونچے سے دروازے پر گھنٹی دبائی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور ایک ٹیکنی کلر ہستی ہمارے سامنے مسکراتی ہوئی نمودار ہوئی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ انہیں کہاں سے دیکھنا شروع کریں۔ یہ ایک نوخیز دوشیزہ تھی جو فریم میں نصب تصویر کے مانند دروازے میں کھڑی تھی۔ اب ذرا رنگوں کی تفصیل سنئے۔ ان کے سر کے بال سرخی مائل سنہری تھے اور ایک سرخ اور نیلے ربن سے بندھے ہوئے تھے۔ چہرہ سرخ و سفید تھا' آنکھیں ہری تھیں۔ لباس سفید' سرخ اور سیاہ تھا۔ یعنی بلاؤز سفید' اسکرٹ سیاہ اور کمر پر سرخ رنگ کی پٹی' کلائی پر انہوں نے زرد رنگ کی گھڑی باندھ رکھی تھی۔ اسکرٹ سے جو ٹانگیں باقی بچی تھیں (اور کافی زیادہ بچ گئی تھیں کیونکہ اسکرٹ گھٹنوں سے بھی اونچا تھا) اس پر انہوں نے گلابی رنگ کی لیگنگ پہن رکھی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی ہر چیز قابل دید اور دیدہ زیب تھی۔ ہم تو خیر دیکھتے ہی رہ گئے مگر جمیل مراد صاحب نے اپنی بہترین انگریزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ ہمارا ملاقات کا وقت مقرر ہے۔ اندر اطلاع دے دیجئے۔

لڑکی نے ہماری جانب دیکھا۔ مطلب یہ تھا کہ آپ کی تعریف؟

مراد صاحب بولے "یہ پاکستانی فلم پروڈیوسر ہیں کینیڈا میں فلم بنا رہے ہیں اور اس شاندار گھر میں بھی شوٹنگ کریں گے۔"

لڑکی کا چہرہ ایک دم مزید شفق گوں ہو گیا' خوشی سے پوچھا "سچ! آپ فلم پروڈیوسر ہیں اور ہمارے گھر میں شوٹنگ کریں گے؟"

ہم نے بوکھلا کر کہا "ہیں تو۔ مگر"

مراد صاحب نے ہماری بات کاٹ دی اور بولے "پلیز وقت ضائع نہ کیجئے۔"

بے چاری لڑکی گھبرا گئی "اوہ سوری۔ آپ ادھر صوفے پر تشریف رکھئے۔"

ہم نے کہا "یار خواہ مخواہ کیوں غلط بیانی کر رہے ہو۔"

کہنے لگے "آپ تو بلاوجہ پریشان ہو رہے ہیں۔ یہ سب تو چلتا ہی رہتا ہے۔"

لڑکی دوبارہ نمودار ہوئی اور بڑی دلفریب مسکراہٹ سے ہمیں اندر آنے کی دعوت دی۔ ایک گیلری اور پھر اس میں سے ایک دروازے میں داخل ہونے کے بعد ہم ایک وسیع و عریض ڈرائینگ روم میں پہنچ گئے۔ کشادگی کے اعتبار سے یہ کھیل کے میدان کے سائز کا تھا۔ فرق یہ تھا کہ یہاں قالین' فرنیچر' پردے اور نوادرات سجے ہوئے تھے۔ دیواروں پر مصوری کے شاہکار تھے۔ پورا شاہانہ بندوبست تھا۔ چھت پر کئی فانوس لٹک رہے تھے۔ گھر کیا تھا پورا عجائب گھر تھا۔ لڑکی ہمیں کمرے میں چھوڑ کر غائب ہو چکی تھی۔ مراد صاحب وہاں پہلے بھی کئی بار آ چکے تھے اس لئے بڑے اطمینان سے بیٹھ گئے۔ بلکہ ایک صوفے میں دھنس گئے۔ ہم بھی ان کی دیکھا دیکھی غرق صوفہ ہو گئے۔ نہایت ملائم اور آرام دہ چیز تھی۔ اس قسم کے صوفے پر بیٹھنے کا ہمارے لئے یہ پہلا اتفاق تھا۔ صوفوں اور دوسرے فرنیچر کا اسٹائل بھی قدیم وکٹورین طرز کا تھا۔ ڈرائنگ روم کی کھڑکیاں بھی اسی قسم کی تھیں۔ یوں لگا جیسے انگلستان کے کسی پرانے محل میں آ گئے ہیں۔ جمیل مراد صاحب نے ہماری توجہ دیواروں پر لٹکی ہوئی تصاویر اور دوسرے نوادرات کی جانب مبذول کرائی اور بتایا کہ یہ بے حد قیمتی چیزیں ہیں۔ اگر آج انہیں فروخت کیا جائے تو لاکھوں ڈالرز میں بکیں گی۔ چند لمحے بعد لباس کی سرسراہٹ سنائی دی اور مکان کی مالکہ نرم قالینوں پر قدم رکھتی ہوئی نمودار ہوئیں۔ ہم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اخلاقی طور پر بھی ہمیں اٹھنا چاہئے تھا مگر اس میں حیرت اور پریشانی بھی شامل تھی۔ ہماری نگاہوں کے سامنے وہ خاتون کھڑی ہوئی تھیں جنہیں ہم نے ٹیکسی کے کرائے کے طور پر ۳۵ ڈالرز دیئے تھے۔ اس وقت بھی وہ لباس فاخرہ میں ملبوس تھیں' سر سے پیر تک ہلکے گلابی رنگ کا لباس' سر کے گلابی بال' پیروں میں اسی رنگ کی جوتی' گلے میں اسی رنگ کے موتیوں کی مالا جو خدا جانے اصلی تھے یا نقلی۔ ہم تو انہیں دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ جمیل مراد صاحب نے فوراً تعارف کرایا۔ مسز ہف ویز۔ مسٹر ہف کی بیوہ ہیں جو بہت بڑے لینڈ لارڈ اور خاندانی دولت مند شخص تھے۔ شوہر کی وفات کو آٹھ سال گزر چکے ہیں۔ اولاد سے محروم ہیں اور ان دنوں مالی پریشانیوں سے دوچار ہیں۔

مسز ہف بھی شاید ہمیں پہچان گئی تھیں۔ بولیں "دیکھئے نا۔ اگر کسی شریف عورت کا شوہر اچانک مرجائے اور اسے معلوم ہو کہ شوہر نہ صرف قرض دار تھا بلکہ وہ بہت سی زمین اور جائیداد فروخت بھی کر بیٹھا تھا اس کی آمدنی کا کوئی مستقل اور معقول ذریعہ نہ ہو

تو پھر وہ شریف بیوہ کیا کرے؟ مجبور ہو کر ٹیکسی چلاتی ہوں۔"

جمیل مراد صاحب نے چونک کر ہمیں دیکھا "تو کیا آپ دونوں پہلے مل چکے ہیں؟"

ہم نے کہا "اتفاقیہ۔ ہم نے میڈم کی رولز رائس میں سفر کیا تھا مگر ان کی اصل حیثیت سے واقف نہیں تھے۔

دل میں تو آئی کہ ان سے کہہ دیں، ہمیں کبھی بیوہ ہونے کا اتفاق نہیں ہوا اس لئے ہم اس سلسلے میں کیا عرض کر سکتے ہیں مگر پھر اخلاق کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہم نے سوگوار صورت بنالی اور نہایت ہمدردی سے ان کی جانب دیکھنے لگے۔

جمیل مراد صاحب نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا "ظاہر ہے کہ وہ غریب اپنا سامان اور زیور فروخت کر کے ہی گزارہ کر سکتی ہے یا پھر" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔

غالباً وہ کہنا چاہ رہے تھے کہ یا پھر وہ اپنی رولز رائس کاروں کو ٹیکسی کے طور پر چلائے گی۔

خیر، کار کو ٹیکسی کے طور پر چلانا تو پھر بھی قابل فہم ہے مگر جس عورت کے پاس اتنی قیمتی جائیداد اور نوادرات ہوں اور پانچ چھ رولز رائس کاریں جس کے گھر کے آنگن میں پالتو کتوں کی طرح ادھر ادھر پڑی رہتی ہوں اسے بھلا خود ٹیکسی چلانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ کم از کم ایک ڈرائیور ہی رکھ لے۔ اس بات کا جواب کچھ دیر بعد میڈم ہف نے خود ہی فراہم کر دیا۔

کہنے لگیں "اگر میں اپنی رولز رائس کار کسی ڈرائیور کے حوالے کر دوں تو اسے بھلا کیا درد ہو گا۔ وہ کم بخت تو اس کا ستیاناس مار دے گا" پھر ذرا مسکرا کر بولیں "اور یہ بھی تو غور کریں کہ کوئی مسافر ایک معمولی ڈرائیور کو اتنا زیادہ کرایہ کیوں ادا کرے گا؟ مجھے دیکھ کر ہی تو مسافر مرعوب ہو کر منہ مانگا کرایہ ادا کرتے ہیں۔"

بات ان کی بالکل درست تھی اس لئے کہ خود ہمارے ساتھ یہی معاملہ گزر چکا تھا۔

ان کا کہنا تھا کہ وہ جس روز پانچ چھ گھنٹے ٹیکسی چلاتی ہیں اس روز سات آٹھ سو ڈالرز کما لیتی ہیں۔

"آپ نے میرا گھر دیکھا ہے؟ کتنا بڑا ہے" وہ بولیں "اس کی صفائی اور دیکھ بھال کوئی آسان کام تو نہیں ہے۔ کام کاج کے لئے ملازم رکھنے پڑتے ہیں۔ یہ سب خرچ میں کہاں سے پورے کروں؟"

ہم نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا "میڈم! آپ اگر یہ مکان بیچ کر کوئی اچھا سا خوب صورت گھر خرید لیں اور باقی پیسہ بینک میں رکھوا دیں تو زندگی بھر آرام سے رہ سکتی ہیں۔"

آہ بھر کر کہنے لگیں "آپ یہ بات نہیں سمجھیں گے۔ یہ مکان نہیں، میری پہچان ہے۔ میں مرتے دم تک یہ گھر فروخت نہیں کروں گی۔ چاہے مجھے اپنا کچھ اور قیمتی سامان فروخت کیوں نہ کرنا پڑے۔"

ہم نے پوچھا "آپ کے بچے آپ کی مدد نہیں کرتے؟"

کہنے لگیں "خدا کا شکر ہے کہ بچوں کے جھنجھٹ سے آزاد ہوں اور پھر بچے ہوتے تو اب تک اس جائیداد اور قیمتی سامان کو بیچ کر کھا چکے ہوتے۔"

"مگر آپ ان سب چیزوں کا کیا کریں گی؟"

وہ مسکرائیں اور کہنے لگیں "میں مرتے وقت ایک ٹرسٹ بنا دوں گی۔ اس گھر کو میوزیم بنا دیا جائے گا۔ اس طرح میرا اور میرے شوہر کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔"

جمیل مراد صاحب نے شوٹنگ کی بات چھیڑ دی تو وہ بولیں "دیکھئے۔ اگر آپ فلم کے ٹائٹل پر یہ لکھ دیں کہ فلم کی شوٹنگ کس مقام پر ہوئی ہے؟ تو پھر میں کرائے کے معاملے میں رعایت کر دوں گی۔"

ہم نے دریافت کیا "پوچھ سکتا ہوں کہ آپ رعایتی کرایہ کتنا طلب کریں گی؟"

بولیں "ایک گھنٹے کی شوٹنگ کے لئے چار سو ڈالرز۔"

کچھ دیر بعد ہم نے ان سے اجازت طلب کی اور باہر نکل آئے۔ جب ہم واپس لوٹ رہے تھے تو جمیل مراد صاحب نے بہت فکر مند ہو کر کہا "مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے اس عورت نے جان بوجھ کر اپنے شوہر کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔"

ہم نے ان کی سراغ رسانی کی داد دی اور کہا "آپ نے بھلا کیسے جان لیا؟"

آپ نے غور سے نہیں دیکھا "وہ بولے" یہ عورت صورت ہی سے کرمنل نظر آتی ہے۔ ویسے کرائے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"بھئی فی الحال تو ہمارے پاس نہ کہانی ہے اور نہ فلم، جب ضرورت پڑے گی تو دیکھا جائے گا" ہم نے جواب دیا۔

"میں کچھ اور بھی رعایت کرا لوں گا" وہ بولے "ان کی رولز رائس کاروں اور خوب صورت ملازمہ کو ہم مفت میں اپنی فلم میں دکھا دیں گے۔"

ہمارے خیال میں تو یہ سارا دن بے کار ہی ضائع ہوا تھا۔ البتہ ہمیں ایک دلچسپ کردار سے ملاقات کرنے کا موقع نصیب ہو گیا۔ اس قسم کی حرکتیں یورپ اور امریکہ کے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ ہمیں تو ان بڑی بی کی ذہنی کیفیت پر شک ہونے لگا تھا۔ کروڑوں روپے کی جائداد اور قیمتی [illegible] کی مالکہ اگر اپنی رولز رائس کار بطور ٹیکسی خود چلاتی ہوئی نظر آئے تو اسے اور کیا کہیں گے؟

ہم نے یہ تمام داستان واجد صاحب کو سنائی تو وہ بہت ہنسے' کہنے لگے' آپ کس چکر میں پڑ گئے۔ یہ جمیل مراد تو خود ہی کرمنل آدمی ہے۔ بڑی صفائی سے لوگوں کو بے وقوف بناتا ہے اور اس کا تو روزگار ہی یہ ہے۔ اب یہ ان بڑی بی سے کچھ رقم ضرور وصول کر لے گا۔"

ہم نے کہا "واجد صاحب! اگر کینیڈا میں فلم بنائی جائے اور فلم میں ہم ان محترمہ کا کردار پیش کریں تو ہمارے ملک کے دیکھنے والے تو اس پر یقین ہی نہیں کریں گے۔"

کہنے لگے "اس کی آپ فکر نہ کیجئے۔ ہمارے ملک کے فلم دیکھنے والے ہر چیز پر یقین کر لیتے ہیں ہماری فلموں میں سبھی کچھ تو مصنوعی ہوا ہے۔ اس کے باوجود وہ ان فلموں کو خوشی خوشی دیکھتے ہیں دراصل ہمارے لوگ خیالی دنیا میں رہنا چاہتے ہیں۔ کم از کم فلمیں وہ ایسی ہی پسند کرتے ہیں۔ اسی لئے تو ہمارے ہاں حقیقت پسندانہ فلمیں کامیاب نہیں ہوتیں۔"

رات کو پھر جاوید صاحب کے ہاں میٹنگ تھی۔ میٹنگ کا تو نام ہی تھا۔ دراصل کھانے پینے اور گپ بازی کرنے کا ایک بہانہ تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ خواتین ایک کمرے میں اکٹھی ہو کر اپنے مطلب کی باتیں کرنے لگتی تھیں۔ مرد حضرات دوسرے کمرے میں اپنے مطلب کی گپ شپ کرتے تھے اور درمیان میں کبھی کبھی فلم کے بارے میں بھی بات کر لیتے تھے۔ اس قسم کی ملاقاتیں درجن بھر سے زیادہ ہو چکی تھیں اور ابھی تک کوئی ٹھوس تجویز سامنے نہیں آئی تھی۔ تین چار حضرات ہر بار یہ ضرور یقین دلا دیتے تھے کہ وہ فلم کے لئے کمپنی بنانے کے لئے تیار ہیں اور ہر شخص بیس ہزار ڈالر کا حصہ دار بھی ہو گا۔ چنانچہ ہم نے ایک فلم ساز ادارہ قائم کرنے کے سلسلے میں ضروری کاغذات بھی تیار کرا لئے تھے۔ شوکت صاحب ہمیں اپنے وکیل کے پاس لے کر گئے تو پہلے تو وہ یہ سمجھے کہ ہم امیگریشن کے سلسلے میں آئے ہیں اور کسی بہانے کینیڈا کی شہریت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے فوراً اپنی سیکریٹری کو طلب کیا اور ضروری کاغذات منگا لئے۔ پھر پوچھا "آپ کس بہانے یہاں کی شہریت حاصل کرنا چاہتے ہیں؟"

پوچھا "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ سیاسی بنیادوں پر یہاں پناہ لینا چاہتے ہیں یا کوئی صاحب آپ کو اسپانسر کر رہے ہیں۔"

ہم نے انہیں بتایا کہ دونوں میں سے کوئی ایک بات بھی نہیں ہے۔ دراصل ہم ایک فلم ساز کمپنی بنانا چاہتے ہیں' جس میں چار حصے دار ہوں گے۔ ہم کہانی نویس اور ہدایت کار ہوں گے اور ہر سال گرمی کے موسم میں کینیڈا آ کر ایک فلم بنایا کریں گے۔

وہ زور سے ہنسے' کہنے لگے "اچھا بہانہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر آپ لوگ اپنی زبان

میں فلم بنائیں گے تو کینیڈا میں اس زبان میں کہانی لکھنے والا نہیں ملے گا۔ دوسرے، ہدایت کار بھی اس کہانی کے لئے کوئی پاکستانی ہی درکار ہو گا۔ آپ اطمینان رکھیے۔ تین چار مہینے کے اندر آپ کو شہریت کا ویزا دلا دوں گا۔"

اب شوکت صاحب نے دخل در معقولات ضروری سمجھا، کہنے لگے "مسٹر جوائس! آپ غلط سمجھے ہیں۔ یہ صاحب سچ مچ کہانی نویس اور ہدایت کار ہیں اور ہم لوگ واقعی ایک فلم ساز کمپنی بنا رہے ہیں۔ آپ ضروری کاغذات تیار کر دیں تاکہ فلم سازی شروع کی جا سکے۔"

مسٹر جوائس اپنی گھومنے والی کرسی پر آگے کی جانب جھک کر بغور سے ہمیں دیکھنے لگے۔ پھر بولے "دیکھنے مین تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ نہ آپ کہانی نویس نظر آتے ہیں نہ ہدایت کار۔"

شوکت صاحب بولے "یہ آپ کی نظر کا قصور ہے کیونکہ یہ پاکستان میں درجنوں کہانیاں لکھ چکے ہیں اور فلمیں بنا چکے ہیں۔ بہت تجربہ کار آدمی ہیں۔"

اس بار مسٹر جوائس نے قدرے حیرانی سے ہمیں دیکھا۔ بولے "دیکھنے میں تو نہیں لگتے۔"

گویا ابھی تک انہیں پوری طرح یقین نہیں آیا تھا۔ پھر انہوں نے انٹر کام پر اپنی خوب صورت سیکرٹری میگ کو بلایا اور ہم سے تعارف کراتے ہوئے کہا "یہ مسٹر آفاقی ہیں۔ پاکستان میں فلموں کے اسکرپٹ لکھتے ہیں اور ہدایت کاری بھی کرتے ہیں۔"

میگ نے ذرا غور سے ہمیں دیکھا پھر اپنا نازک ہاتھ مصافحہ کے لئے ہماری جانب بڑھایا اور بولی آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ وجہ یہ ہے کہ زندگی میں آج تک گوشت پوست کے اسکرپٹ رائٹر اور فلم ڈائریکٹر سے نہیں ملی ہوں "وہ قدرے متاثر نظر آ رہی تھی۔

مسٹر جوائس نے کہا "اب ہمارے ملک میں فلمیں بنایا کریں گے۔"

میگ خوش ہو کر بولی "اوہ! واقعی۔ یقین کیجئے مجھے فلموں میں اداکاری کرنے کا بہت شوق ہے۔ کیا آپ کوئی چھوٹا موٹا کردار مجھے بھی دے سکیں گے؟"

اس بار جائزہ لینے کی ہماری باری تھی۔ وہ خاصی اسمارٹ اور خوش شکل عورت تھی۔ دراز قد، متناسب جسم، سنہری بال، بول چال میں بھی بے جھجک تھی۔ ہم نے کچھ سوچا پھر کہا" دیکھئے مس میگ! اس طرح تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ آپ کا اسکرین ٹیسٹ لینا پڑے گا۔ اس کے بعد ہی کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔"

میگ کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا، کہنے لگی "مگر آپ بھول تو نہیں جائیں گے اپنا وعدہ؟"

ہم نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ ہماری اس ادا نے مسٹر جوائس کو بھی اپنی پہلی والی رائے پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔ ہم نے تو امریکہ اور کینیڈا میں یہ دیکھا کہ جب تک کسی بات کو لمبا نہ کیا جائے ان لوگوں کی تسلی نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک شیشی میں سے شیو کرنے کے لئے کریم یا فوم نکالنا کون سا مشکل کام ہے۔ ہمارے ہاں تو لوگ اس کی ترکیب استعمال تک نہیں بتاتے۔ بھئی ظاہر ہے کہ شیشی کھول کر فوم یا کریم نکالئے اور منہ پر لگا لیجئے۔ مگر امریکہ میں اس کی ترکیب استعمال شیشی پر درج ہوتی ہے جو کچھ اس طرح ہوتی ہے۔

۱۔ اپنا چہرہ نیم گرم پانی سے اچھی طرح دھو لیجئے۔
۲۔ چہرہ تولئے یا کسی اور چیز سے خشک نہ کیجئے، بلکہ گیلا ہی رہنے دیجئے۔
۳۔ اب بائیں ہاتھ میں شیشی تھام کر دائیں ہاتھ سے اس کا ڈھکنا دائیں جانب گھمائیے
۴۔ شیشی کھولنے کے بعد تھوڑی سی فوم اپنے دائیں ہاتھ میں لگائیے اور پھر اسے اپنے چہرے پر نرمی اور آہستگی سے ملئے۔ یہاں تک کہ اس میں جھاگ پیدا ہو جائے۔
۵۔ اب سیفٹی ریزر اٹھائیے اور شیو بنانی شروع کر دیجئے۔

دوسری چیزوں پر بھی اس طرح تفصیلی ترکیب استعمال درج ہوتی ہے۔ پتا نشان بتاتے وقت بھی یہ لوگ مختصر بات نہیں کرتے۔ اتنی تفصیل سے سڑکوں کے نام اور نمبر بیان کرتے ہیں کہ الجھن ہونے لگتی ہے۔ بہر حال، اپنا اپنا طریقہ ہے، مگر ہم یہ راز جان گئے تھے کہ امریکہ اور کینیڈا کے لوگوں کو مرعوب کرنے کے لئے، بات کو پھیلانا بہت ضروری ہے۔ ہماری یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ مسٹر جوائس جو ابھی تک ہمیں محض پناہ گزین ہی سمجھ رہے تھے اب ہمیں فلم والا سمجھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ان کی حسین

سیکریٹری کی نگاہوں میں بھی ہمیں ایک والہانہ کیفیت نظر آ رہی تھی۔ سچ پوچھئے تو اس میں مسٹر جوائس اور میگ کا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔ فلم والوں کے بارے میں ان کا تصور یہ تھا کہ بہت شاندار شخصیت ہو گی جو نہایت قیمتی اور فوق البھڑک لباس پہن کر منہ میں سگار یا پائپ دبا کر بات کرے گی۔ اس کے دائیں بائیں عملے کے لوگوں کا جمگھٹا ہو گا۔ چمک دمک ہو گی۔ شراب و شباب کا ماحول ہو گا۔ وغیرہ وغیرہ اب جو انہوں نے ایک عام سے دبلے پتلے عینک والے مسکین صورت آدمی کو دیکھا تو یقین نہ آیا کہ یہ بھی فلم والا ہو سکتا ہے۔ مغربی ملکوں میں فلم اور گلیمر کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ ایک نارمل' معقول اور سیدھا سادا شخص ان کے نزدیک فلم والا نہیں ہو سکتا۔ بہرحال' اب انہیں تھوڑا تھوڑا یقین سا ہو چلا تھا۔ شوکت صاحب نے جب ہماری فلموں کے بارے میں بتایا تو وہ اور بھی مرعوب ہو گئے۔ میگ نے جھٹ پٹ کاغذات لا کر میز پر رکھ دیئے اور مسٹر جوائس نے بتایا کہ ایک ہفتے کے اندر وہ ڈرافٹ تیار کر لیں گے۔ اس کے بعد انہوں نے فلم کے بارے میں سوالات شروع کر دیئے کہاں بنے گی؟ کہانی کیا ہو گی؟ اداکار کون ہوں گے؟

ہم نے مزید رعب ڈالنے کے لئے کہا ؟ابھی ہم پیپر ورک مکمل کر رہے ہیں۔ اداکار کچھ تو پاکستان سے آئیں گے اور باقی یہاں سے لیں گے۔ عنقریب ان سے انٹرویو لیں گے اور پھر اسکرین ٹیسٹ ہوں گے۔ اس اثنا میں فلم کا بجٹ تیار ہو رہا ہے۔ لوکیشن بھی دیکھی جا رہی ہیں۔ چند روز میں ہم لوکیشنز دیکھنے کے لئے مونٹریال جانے والے ہیں۔"

میگ کی آنکھوں میں ستارے جھلملانے لگے۔ بولیں "اوہ مسٹر آفاقی! آپ نے کتنا مناسب فیصلہ کیا ہے۔ مونٹریال سے زیادہ خوب صورت جگہ تو آپ کو سارے کینیڈا میں نہیں ملے گی۔ آپ اجازت دیں تو میں اس سلسلے میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں۔"

"وہ کس طرح؟"

مسٹر جوائس بولے" دراصل میگ مونٹریال کی رہنے والی ہے جاب کے سلسلے میں ٹورنٹو میں مقیم ہے مگر اس کے دوسرے تمام رشتے دار وہیں ہیں۔"

ہم نے پوچھا "تو آپ بھی فرنچ ہیں؟"

بولی "جی نہیں۔ تب ہی تو مونٹریال چھوڑ کر یہاں آئی ہوں۔"

یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔

وہ کہنے لگی "آپ کب مونٹریال جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ میں بھی چند روز کے لئے مونٹریال جانے والی ہوں۔ آپ کو وہاں گھما پھرا کر لوکیشنز بھی دکھا دوں گی۔"

ہمارے جواب دینے سے پہلے شوکت صاحب بول پڑے "بس یہ ٹھیک ہے۔ مسٹر آفاقی تو دو روز کے بعد جانے والے ہیں۔ بس تین چار روز وہاں قیام کریں گے۔"

"ہاؤ نائس۔ تو پھر میں بھی دو روز کے بعد چھٹی لے لیتی ہوں۔ آپ کو میرے ہمراہ چلنے پر کوئی اعتراض تو نہ ہو گا؟"

"جی؟" ہم واقعات کی تیز رفتاری پر کچھ گھبرا سے گئے۔ کہنے لگی "یہاں سے مونٹریال صرف تین سو میل ہی تو ہے۔ میں تو جب بھی جاتی ہوں کار سے جاتی ہوں۔ اتنے تھوڑے فاصلے کے لئے جہاز استعمال کرنا عجیب سا لگتا ہے۔"

مسٹر جائس نے فوراً مداخت کی" میگ! مسٹر آفاقی کو اپنا پروگرام خود بنانے کا موقع دو۔"

"اوہ۔ آئی ایم سوری۔" وہ بے چاری کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

ہم نے کہا "ایسی بات نہیں ہے۔ ہم تو خود بذریعہ کار جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ راستے میں بھی لوکیشنز دیکھتے چلیں گے۔"

"بس تو پھر طے ہو گیا' دو دن بعد آپ میرے ہمراہ مونٹریال جا رہے ہیں۔"

واپسی پر لفٹ میں سوار ہوئے تو ایک اور خاتون بھی تیزی سے چلتی ہوئی لفٹ کی جانب بڑھیں۔ لفٹ کا دروازہ بند ہونے لگا تھا مگر ہم نے فوراً دوبارہ کھول دیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بے اختیار کھول دیا۔ کوئی انتہائی کور ذوق اور دنیا سے بے زار شخص ہی ہو گا جو ان کے لئے دروازہ نہ کھولتا۔ ایک تو یہ کہ مغربی اخلاق اور مشرقی تہذیب دونوں کا یہی تقاضا ہے کہ اگر کوئی مشکل میں گرفتار خاتون نظر آئے۔ اس کے علاوہ انسانی فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ کوئی اکیلی دوکیلی خاتون اگر نظر آئے تو فوراً آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لینا چاہیئے۔ ہم نے خیر لفٹ کا دروازہ ہی کھولا تھا۔ مگر شوکت صاحب ہم سے زیادہ عکاس فطرت نکلے۔ کیونکہ انہوں نے فطری تقاضوں کا مظاہر کرتے ہوئے اپنا ہاتھ بھی

آگے بڑھا دیا تھا جو ان خاتون نے تھام کر ایک مسکراہٹ کے ساتھ ان کا حساب بے باق کر دیا۔

ہم نے ان سے پوچھا "کون سی منزل؟"

مسکرا کر فرمایا "گراؤنڈ فلور۔"

اب مشکل یہ تھی کہ نیچے جانے کے لئے زیادہ منزلیں نہ تھیں اس لئے دیر تک ان کی ہم سفری کا شرف نصیب نہیں ہو سکتا۔ شوکت صاحب نے زیر لب کہا "ان کے ساتھ تو زیر زمین بھی جا سکتے ہیں۔" وہ سمجھیں تو نہیں مگر بڑی لگاوٹ کے ساتھ مسکرا کر لفٹ میں نصب آئینے میں اپنا لباس درست کرتے ہوئے سراپا دیکھنے لگیں۔ لباس کی تو خیر تہمت ہی تھی کیونکہ وہ بس برائے نام ہی تھا مگر ان کا سراپا واقعی مجسم قیامت تھا۔ خوب صورتی تو ان پر ختم تھی۔ رنگ، روغن، نقشہ، قامت، ہونٹ، آنکھیں، بال، ہاتھ، کمر، پیٹ، ٹانگیں، شانے، کہنیاں، پنڈلیاں، کلائیاں، انگلیاں، ناخن، گردن، کان، ناک ہر چیز ایک مکمل شاہکار قدرت کا نمونہ تھی۔ آپ سوچیں گے کہ اتنی بہت سی چیزوں کا تذکرہ کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ قصہ دراصل یہ تھا کہ ان کے جسم کی یہ تمام چیزیں ہمیں روز روشن کی طرح نظر آ رہی تھیں بلکہ روز روشن کو تو آپ کھلے میدان اور کشادہ فضا میں دیکھتے ہیں۔ یہ صاحبہ ایک مختصر سی لفٹ میں ہماری نگاہوں کے سامنے جلوہ افروز تھیں اور اس لفٹ میں بھی تین طرف کی دیواروں میں آئینے لگے ہوئے تھے۔ گویا

جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے' والا معاملہ تھا۔ چوتھی جانب لفٹ کا دروازہ تھا ورنہ شاید اس طرف بھی ان ہی کا جلوہ نظر آتا جو صحیح معنوں میں ضرورت سے زیادہ ہو جاتا۔ وہ جتنی بھی نظر آ رہی تھی وہی بہت زیادہ تھیں۔ اس سے زیادہ کی تاب و مجال ہم جیسا دیسی اور پردیسی بندہ کہاں سے لاتا۔ اوپر ہم نے بیان کیا کہ وہ آئینے میں اپنا لباس درست کرتے ہوئے اپنے جسم کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اسے اگر آپ غلط بیانی اور مبالغہ کی انتہا بھی کہہ دیں تو غلط نہ ہو گا۔ بات یہ تھی کہ جسم تو ان کا خاصا لمبا چوڑا تھا مگر لباس جسم کے مقابلے میں انتہائی مختصر بلکہ نادیدہ قسم کا تھا یہی وجہ ہے کہ ہر دیکھنے والا انہیں ندیدہ پن سے دیکھنے پر مجبور تھا۔ اس زمانے میں کینیڈا اور امریکہ میں گرمیوں کا ایک نیا فیشن نکلا تھا۔ اون کے دھاگے کی طرح پتلی پتلی ڈوریوں سے بنا ہوا یہ لباس سارے جسم پر لپٹا ہوا نظر آتا تھا۔ خیر سارے جسم پر کہنا تو درست نہ ہو گا، کیونکہ ہاتھ، بازو، گردن، رانوں سے نیچے ٹانگیں تو بالکل ہی کھلی ہوئی تھیں۔ اب رہ گیا جسم کا وہ بالائی حصہ جو پسلیوں سے لے کر ناف تک پایا جاتا ہے اور جسے ڈھانپ کر رکھنے کے لئے عورتوں میں سخت کمپٹی شن شروع ہو جاتا ہے، اس حصے پر انہوں نے یہ ننھے منے نازک سے دھاگے لپیٹ رکھے تھے۔ اور یہ احتیاط برتی تھی کہ کسی دھاگے میں دو انچ سے کم فاصلہ نہ ہوا۔ اچھا، یہ تو تھا بالائی لباس۔ کمر کے نیچے انہوں نے ایک جانگیا ٹائپ کی چیز پہن رکھی تھی۔ غنیمت ہے کہ یہ دھاگوں سے بنی ہوئی نہیں تھی مگر اس میں ایسا نائلون یا کپڑا وغیرہ استعمال کیا گیا تھا جس کے بارے میں شاعر کہہ گیا ہے

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

اس وقت خان صاحب ہمارے ساتھ ہوتے تو اس مختصر سے عرصے میں لاکھوں بار لاحول پڑھ چکے ہوتے۔ ویسے ان صاحب نے حرکت بھی لاحول پڑھنے والی ہی کی تھی۔ مگر یہ تو پڑھنے والوں پر موقوف ہے کہ وہ کیا پڑھتے۔ اگر تنویر نقوی صاحب اس وقت لفٹ میں موجود ہوتے تو "سبحان اللہ، سبحان اللہ" کہتے ہوئے ان کا حلق خشک ہو چکا ہوتا۔ ہم اس اثنا میں یہ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ لاحول پڑھنا زیادہ مناسب ہو گا یا سبحان اللہ کہنا گویا درمیانی کیفیت میں تھے۔

شوکت صاحب پر نظر پڑی تو پتا چلا کہ وہ سکتے کے عالم میں ہیں اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دائیں بائیں، سامنے ہر طرف بکھرے ہوئے جلوؤں کا نظارہ کر رہے ہیں۔ ایک بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ چلئے ہم تو ایسے ملک سے آئے ہیں جہاں شلوار، قمیص پہنی جاتی ہے اور وہ بھی گردن سے ٹخنوں تک اور کلائیوں کے آخری حصے تک ڈھانپ دی جاتی ہے اور مزید جسم کے حصوں کو پوشیدہ رکھنے کے لئے برقع، دوپٹہ، چادر وغیرہ کی مزید کمک پہنچائی جاتی ہے۔ اب اگر ایسی جگہ سے آیا ہوا شخص حسن قدرت کے نظاروں کو یوں حقیقی حالت میں دیکھے اور بوکھلا جائے تو ایک بات بھی ہے مگر شوکت صاحب جیسے لوگ جو ان ہی نظاروں میں رہتے سہتے ہیں اور ہر دم یہی ان کی نگاہوں کے سامنے جلوہ نما رہتے ہیں انہیں بھلا ساکت اور منجمد ہونے کی ضرورت ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ شاید یہ بھی اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا (یا سنا ہو گا) کہ ہر

روز شراب پینے والے بہت سے مے نوش پہلا پیگ پینے کے بعد ہی مدہوش ہو جاتے ہیں جب کہ بہت سے اناڑی پینے والے ایک ایک بوتل صاف کرنے کے بعد بھی ہوش و حواس قائم رکھتے ہیں۔ ایسا ہی معاملہ شاید حسن انسانی کی شراب کے نشے کے سلسلے میں بھی ہوتا ہو گا۔

آپ سوچتے ہوں گے ہماری لفٹ خدا جانے عرش بریں سے تحت الثریٰ تک جا رہی تھی جو اتنی دیر تک ہم یہ سب دیکھتے اور سوچتے رہے۔ جی بالکل نہیں۔ لفٹ کا سفر تو مختصر تھا مگر انسانی خیال کی رفتار دنیا کی تیز ترین چیز سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور نگاہوں سے دیکھنے میں کون سا وقت لگتا ہے۔ ایک لمحے میں ایک ہی نگاہ ڈالی اور بس۔ اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ مقصد یہ کہ یہ تمام سفر ہم نے منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر خاموشی سے ہی طے نہیں کر لیا تھا۔ باتیں چیتیں بھی ہوئی تھیں۔ مثلاً جب شوکت صاحب نے ان کا ہمہ برہنہ جسم تھام کر انہیں لفٹ کے اندر کھینچا (برہنہ جسم سے مراد یہ ہے کہ جس بازو کو تھاما وہ یہاں سے وہاں تک برہنہ ہی نظر آ رہا تھا) تو انہوں نے بڑی لگاوٹ سے "ہائی' تھینک یو" کہا اور مسکرائیں۔ اگر انہیں اپنے بالوں کو جھٹکنے کے لئے ہاتھ کی ضرورت پیش نہ آ گئی ہوتی تو شاید شوکت صاحب مرتے دم تک ان کا ہاتھ نہ چھوڑتے۔ خیر' مجبوری انسان سے سب کچھ کرا لیتی ہے۔ خاتون نے معذرت انگیز مسکراہٹ سے اپنا ہاتھ کھینچا تو مغربی دستور کے مطابق شوکت صاحب نے بھی دل پر پتھر رکھ کر ہاتھ چھوڑ دیا۔ خاتون نے پہلے بائیں شانے پر بڑی نزاکت سے بالوں کو تھپتھپایا تو ہمیں اندازہ ہوا کہ جس قدر جسم انہوں نے لباس کی مدد سے ڈھانپا تھا اس سے زیادہ تو ان کے بالوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ بات اور ہے کہ بالوں والے حصے تک نگاہ پہنچنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ اگر وہ ہاتھ چھڑا کر اپنے بال نہ سنوارتیں تو شاید ہمیں بھی معلوم نہ ہوتا کہ ان کے شانوں پر سر بھی ہے اور سر پر براؤن رنگ کے بال بھی ہیں۔ ظاہر ہے' بعض انسان قناعت پسند اور بے نیاز قسم کے ہوتے ہیں۔ ٹھوڑی پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں۔ شاید ہم بھی اسی قسم کی مخلوق سے تعلق رکھتے ہیں۔

خاتون نے دوسری حرکت یہ کی کہ دونوں بازو اونچے اٹھا کہ اپنے بالوں کو جھٹکا' ایک آہ بھری اور شکایت بھری آواز میں بولیں "اف۔ کتنی گرمی ہے آج کل۔" ایک اتنی حسین عورت سے اتنی بڑی غلط بیانی کی ہم توقع نہیں کر رہے تھے۔ ان دنوں ٹورنٹو میں اتفاق سے بہت اچھا موسم تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں اور چند روز پہلے کی تمازت اور تپش ناپید تھی اور پھر لفٹ کے اندر تو خاصی خنکی تھی کیونکہ پوری عمارت کی طرح یہ لفٹ بھی ائیرکنڈیشنڈ تھی۔ ان کا لباس اس قدر مختصر بلکہ نا قابل ذکر تھا کہ ہمیں تو ڈر تھا کہ کہیں انہیں نمونیا نہ ہو جائے اور وہ تھیں کہ گرمی کی شکایت کر رہی تھیں۔ مگر حسینوں اور حکمرانوں کی ہاں میں ہاں ملانے والے بھی مل جاتے ہیں۔

شوکت صاحب نے فوراً اپنے کوٹ کے بٹن کھول دیئے اور بولے "واقعی۔ کتنی گرمی ہو گئی ہے ان دنوں" حالانکہ وہ تھری پیس سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ خاتون ان کی جانب دیکھ کر بڑے پیار بھرے انداز میں مسکرائیں تو شوکت صاحب کا ٹمپریچر کچھ اور بڑھ گیا۔ یکایک انہیں یاد آیا کہ وہ وکیل کے دفتر میں کوئی ضروری چیز بھول آئے ہیں۔ کہنے لگے "معاف کرنا۔ اگر اعتراض نہ ہو تو میں ایک بار لفٹ اوپر لے چلوں ایک ضروری کاغذ رہ گیا ہے۔"

حسینہ کی جگہ ہم ہوتے تو کہتے کہ بھائی۔ ایک دو منزلوں کے بعد ہماری منزل آ جائے گی۔ اس کے بعد آپ شوق سے دوبارہ چاہے سب سے اونچی منزل تک ہو آنا۔ مگر یہ حسینہ بہت اچھے اخلاق کی مالک تھیں حالانکہ اردو شاعروں کو حسینوں سے عموماً بد مزاجی' بد اخلاقی اور گالی گلوچ کی ہی شکایت رہتی ہے۔ شاید ان کا رابطہ مغرب کی حسیناؤں سے نہیں پڑا اور ہم تو کہتے ہیں کہ خیر ہی گزری۔ ورنہ ہماری شاعری کا ورثہ تو خاک میں مل گیا ہوتا۔ نہ حکایتیں ہوتیں' نہ شکایتیں۔ نہ بے وفائیوں کا تذکرہ ہوتا نہ جفا کاریوں کا۔ اور رقیب صاحب تو گدھے کے سینگوں کی طرح ہماری شاعری سے ہی غائب ہو گئے ہوتے کہ مغرب میں رقیب کا تصور ہے نہ روسیاہ کا (نیگروز کے سوا) اور پھر ہجر و وصال بھی کہاں ہوتا۔

یہاں تو راستہ چلتے وصال ہو جاتا ہے۔ ہجر کا ہم معنی لفظ غالباً پوری انگریزی زبان میں موجود نہیں ہے۔ بہر حال ہم تو جب بھی کسی مغربی ملک جاتے ہیں تو اپنے مشرقی ماحول کو یاد کر کے سجدہ شکر ادا کرتے ہیں کہ ہماری اردو شاعری اور افسانہ نگاری کی خیر ہو گئی۔ خیر' یہ جملہ معترضہ تھا۔ ہوا یہ کہ وہ خاتون نہ صرف مسکرائیں بلکہ انہوں نے اپنی

برہنہ انگلی دوباہ اسی بٹن پر رکھ دی۔ جس منزل سے ہم آ رہے تھے اور لفٹ دوبارہ عازم منزل بالا ہو گئی۔ یہ برہنہ انگلی کی ترکیب سے آپ پریشان نہ ہوں۔ دراصل ان خاتون کی مجسم برہنگی کے پیش نظر یہ الفاظ ہمارے قلم سے نکل گئے۔ ایک بات ہم اور آج آپ کو سچ سچ بتائے دیتے ہیں وہ یہ کہ مغرب والوں نے خواتین کے لئے یہ نیم برہنہ یا قریب قریب برہنہ جو لباس ایجاد کیا ہے اس میں بھی ان کی چالاکی ہے۔ دیکھئے، سر تا پا برہنگی اول تو مزاج اور اخلاق پر بار گزرتی ہے۔ دوسرے عریاں جسم دیکھ کر ذہن میں کوئی رومانی اور پُر کشش خیالات نہیں پیدا ہوتے، بلکہ اکثر حالات میں تو عجیب کراہیت سی محسوس ہوتی ہے، لیکن کچھ کچھ چھپا اور کچھ کچھ ڈھکا جسم خواہ مخواہ توجہ کھینچ لیتا ہے۔ افسانوں اور فلموں میں یہ سسپنس بھی غالباً اس فلسفے کے تحت رکھا جاتا ہے کسی بھی منظر کو چھپا کر اور قدرے کھول کر دکھایا جائے تو دلچسپی اور کشش بڑھ جاتی ہے۔ یہی معاملہ عریانی اور نیم عریانی کا بھی ہے۔ لیجئے پھر اردو شاعر یاد آ گئے۔ ہمارے شاعر نے کیا خوب کہا تھا کہ

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں

دراصل یہ عشق و محبت اور لگن اس وقت تک ہی رہتی ہے جب تک صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں والا معاملہ رہتا ہے۔ سامنے آئے نہیں اور ہوش ٹھکانے آئے نہیں۔ مثال کے طور پر لو میرج کا انجام دیکھ لیجئے۔ کہاں نیم ملاقاتوں کی وہ گرما گرمی اور کہاں شادی کے بعد کی بے نمکی۔ صاحب، ماننا پڑے گا کہ یہ مردذات ہوتی ہے بہت خود غرض اور چالاک کم از کم ہمارا تو یہی تجربہ ہے۔

اب یہ ہوا کہ لفٹ اسی تیز رفتاری سے اوپر کی جانب رواں ہو گئی اور بہت قلیل وقت میں منزل پر پہنچ گئی۔ شوکت صاحب نے بڑی مشکل سے اپنی نگاہوں کو ان کے لباس کی ڈوریوں کے پھندوں سے آزاد کیا اور "ایکسکیوزمی" کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئے۔

چند لمحے بعد وہ مسکراتے ہوئے واپس آئے۔ شکریہ ادا کیا اور پھر نیچے جانے کے لئے بٹن دبا دیا۔ ہم نے پوچھا "کیا رہ گیا تھا وہاں؟"

بولے "ضروری کاغذات کا ایک لفافہ تھا شکر ہے مجھے یاد آ گیا۔" پھر انہوں نے خاتون سے مسکرا کر کہا "شکریہ آپ کو میری وجہ سے زحمت ہوئی!"

وہ مسکرائیں، کہنے لگیں "زحمت کا ہے کی۔ ساری کی ساری مسرت میری ہے۔"

(یہ انگریزی فقرے THE ENTIRE PLEASURE IS MINE کا بھونڈا سا لفظی ترجمہ ہے)

شوکت صاحب اب برداشت نہ کر سکے، بولے "آپ کے پاس ٹرانسپورٹ نہ ہو تو مجھے خدمت کا موقع دیجئے۔"

وہ بولیں "بدقسمتی سے میرے پاس کار ہے۔"

شوکت نے دبی آواز میں اردو میں کہا "بدقسمتی تو میری ہے۔"

اتنی دیر میں لفٹ گراؤنڈ فلور تک پہنچ گئی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ خاتون کھٹ کھٹ کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ ہم دونوں بھی باہر آئے ہماری نظریں بدستور اس جانب لگی ہوئی تھیں اچانک ایک زنانہ آواز نے ہمیں چونکا دیا "سنئے۔"

پلٹ کر دیکھا تو برابر والی لفٹ کے سامنے میگ کھڑی تھی۔ ہمیں دیکھا تو وہ تیزی سے ہماری طرف بڑھی اور شوکت صاحب کی جانب ایک بڑا سا لفافہ بڑھا کر کہنے لگی "معاف کیجئے۔ آپ یہ اوپر میز پر چھوڑ آئے تھے۔"

شوکت صاحب نے کھسیا کر ہماری جانب دیکھا اور پھر شکریہ کہہ کر لفافہ لے لیا۔

ظاہر ہے کہ ان کا لفٹ لے کر اوپر جانے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ان خاتون کی ہمراہی میں تھوڑا سا وقت اور گزار لیں۔ ہمیں رہ رہ کر بٹ صاحب یاد آنے لگے۔ وہ ہوتے اس وقت تو اس لفٹ میں، ابھی تک اس عورت کا نام ضرور دریافت کر چکے ہوتے۔

ہم نے شوکت صاحب کو مزید کھسیانا ہونے سے بچانے کے لئے کہا "میرا خیال ہے کہ آپ کا اوپر جانا بے کار ہی گیا۔ آپ کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی میگ یہ لفافہ آپ کو دینے کے لئے چل پڑی ہو گی۔"

وہ زور زور سے ہنسنے لگے، پھر کہنے لگے، میں آپ کو سچ بتاؤں؟ بعض عورتیں واقعی ہوش و حواس اڑا دیتی ہیں حالانکہ دنیا میں ہم نے کم عورتیں تو نہیں دیکھی ہیں۔"

صاف ظاہر ہے کہ وہ اس "دریدہ جسم" حسینہ کے ساتھ لفٹ میں کچھ اور وقت

گزارنے کے خواہش مند تھے۔

میگ ہم سے رخصت ہو کر واپس دفتر چلی گئی، مگر جانے سے پہلے ایک بار پھر مونٹریال جانے کا پروگرام پکا کر دیا۔ جب میگ لفٹ پر سوار ہونے کے لئے جا رہی تھی تو شوکت صاحب نے بغور اس کی جانب دیکھا اور کہنے لگے "ویسے ایک بات بتاؤں آپ کو میں نے پہلے دھیان ہی نہیں دیا یہ میگ بھی کافی پیاری شکل کی لڑکی ہے۔"

"تو پھر کیا خیال ہے۔ رکھ لیں اسے بھی اپنی فلم میں؟"

بولے "جب فلمیں بنائیں گے تو ظاہر ہے کہ اداکار بھی تلاش کرنے پڑیں گے۔ اور اسی لئے میں اس لفٹ والی خاتون کو بھی غور سے دیکھ رہا تھا۔"

ہم نے کہا "خدارا یہ خیال دل سے نکال دیں شوکت صاحب۔"

وہ گھبرا کر بولے "کیوں، کیا ہوا؟"

ہم نے کہا "اس عورت کی فلم کون سے سنسر بورڈ سے پاس کرائیں گے؟ اسے تو کینیڈا والے بھی نمائش کی اجازت نہیں دیں گے۔"

وہ خوب زور سے ہنسے اور کہنے لگے "بھائی۔ کینیڈا والوں کو اب آپ اتنا پسماندہ اور تنگ نظر بھی نہ سمجھئے کہ وہ ایسی خوبصورت عورت کی فلم کو سنسر سے پاس نہیں کریں گے۔"

ہم نے کہا "چلئے، مان لیا مگر ہمیں تو یہ فلم پاکستان میں بھی چلانی ہے۔"

بولے "یار بلاوجہ فکر مند کیوں ہوتے ہو۔ پاکستان کے لئے کچھ سین الگ سے فلما لینا۔"

جب ہم واپس لوٹے تو راستے بھر یہی سوچتے آئے کہ شوکت صاحب کے ارادے تو بہت خطرناک قسم کے ہیں۔ یہ شخص جس قسم کی فلم بنانے کے خواب دیکھ رہا ہے وہ ہم کیسے بنائیں گے پھر خیال آیا کہ بھئی جب وہ مرحلہ آئے گا تو دیکھا جائے گا۔

اس کے بعد مونٹریال جانے کی تیاریاں اور اہتمام شروع ہو گیا۔ نواب صاحب تو ان دنوں حسب معمول باہر گئے ہوئے تھے اور فون پر ان کی چینی نسل کی کینیڈین سیکریٹری نے بتایا کہ وہ فی الحال پیرس سے کہیں اور چلے گئے ہیں۔ چند روز تک واپسی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ ان سے کچھ مشورے حاصل کریں۔ خیر، آخر انسان کو اپنے پیروں پر بھی کھڑا ہونا چاہئے۔ یہ سوچ کر دل کو قدرے تسلی ہوئی، مگر دراصل بات یہ تھی کہ ہمارا ابھی مونٹریال جانے کا کوئی ارادہ مطلق نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ فلم کے سلسلے میں عملی طور پر ابھی کوئی کام شروع نہیں ہوا تھا۔ ہم نے تو یوں ہی رعب ڈالنے کے لئے مونٹریال کا تذکرہ کر دیا تھا مگر شوکت صاحب نے درمیان میں دخل در معقولات کر کے یہ بلا ہمارے گلے میں ڈال دی۔ ویسے ایک طرح سے دیکھا جائے تو میگ جیسی خوب صورت اور خوش ادا لڑکی کو بلا کہنا ایک طرح سے کفران نعمت ہی کے زمرے میں آتا ہے، لیکن ہمارا ضمیر ہمیں مسلسل کچوکے دے رہا تھا کہ ہم شوکت صاحب کے منصوبے کا کیوں شکار ہو گئے۔ ایک لحاظ سے ہمارا مونٹریال جانا درست تھا کہ آخر کچھ عرصے بعد فلم تو بنانی ہی تھی اور لوکیشن کی بھی ضرورت پڑنی تھی۔ مگر اس میں ایک غلطی یہ تھی کہ فلم کی کہانی اور مکمل منصوبے کی عدم موجودگی میں مونٹریال جا کر لوکیشنز دیکھنا کہاں تک جائز تھا؟ یعنی وہی بات تھی کہ سوت نہ کپاس، جولا ہے سے لٹھم لٹھا۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہم عموماً غلط بیانی کے عادی نہیں ہیں نہ ہی بلاوجہ کام کا رعب ڈالنے کے قائل ہیں۔ جب کہ ابھی اس کا وجود بھی نہ ہو۔ مگر اب صورت حال یہ تھی کہ اگر مونٹریال جانے سے انکار کر دیتے تو بقول شوکت صاحب کے ہمارے وکیل پر ہمارا کچھ اچھا تاثر نہ قائم ہوتا۔ انہوں نے راستے بھر ہمیں تسلی دلاسہ دیا اور سمجھایا کہ آج کل پبلسٹی کا زمانہ ہے۔ ظاہرداری کے بغیر کام نہیں چلتا۔ ان لوگوں پر یہ تاثر قائم ہو جائے گا کہ ہم لوگ واقعی بہت سیریس اور بڑے پیمانے پر فلم سازی کا پروگرام بنا رہے ہیں۔

گھر پہنچے تو ہم نے تمام صورت حال لبنیٰ کو بتائی۔ اگر میگ نے مہمان داری کا ذمہ نہ لیا ہوتا تو ہم اپنی فیملی کے ہمراہ جاتے مگر اب یہ ایک خالص "بزنس ٹور" تھا اس صورت حال کا ان لوگوں نے کوئی خاص نوٹس بھی نہیں لیا۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ہم میگ کے ہمراہ جا رہے تھے اور ہماری کار ٹورنٹو میں ان لوگوں کی تحویل میں تھی۔ گھومنے پھرنے کے لئے اچھا موقع تھا اور پھر وہاں چند ایسے گھرانوں سے بھی ملاقات ہو گئی تھی جن کی سنگت میں اجنبیت اور پردیس کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔

اگلے روز جب میگ کی سرخ رنگ کی کار ہمارے اپارٹ منٹ کے سامنے پہنچی تو ہم اپنا مختصر سا بیگ سنبھالے اس کے منتظر تھے۔ موسم خاصا خوش گوار تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور دھوپ میں تمازت بھی نہیں تھی۔ ٹورنٹ میں ہم نے عجیب بات یہ دیکھی کہ وہاں کے موسموں کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ ابھی دھوپ چمک رہی ہے' گرمی ہے' پسینہ آ رہا ہے اور ابھی بادل گھر آئے تو بہت ٹھنڈی ہوا چلنے لگی' اتنی کہ گرم کپڑوں کی ضرورت پیش آ گئی۔ میگ نے اپنی سرخ کار کا ہڈ کھول رکھا تھا "ہڈ" سے آپ کوئی اور مطلب نہ لیجئے گا کیونکہ امریکی اصطلاح میں غنڈوں اور بدمعاشوں کو بھی "ہڈ" کہتے ہیں۔ مگر یہ کار کا ہڈ تھا اس لئے بے ضرر تھا۔ ہم نے اپنا بیگ پچھلی سیٹ پر رکھ دیا اور خود میگ کے برابر جگہ سنبھالی۔ ٹورنٹو سے باہر نکلنے میں ہمیں زیادہ وقت نہیں لگا۔ ان ملکوں میں سڑکوں کا نظام کچھ ایسا ہے کہ شہروں کے لئے سڑکیں علیحدہ ہیں اور ہائی وے' موٹر وے' ایکسپریس وے اور انٹر سٹی راستے الگ ہیں جن پر پہنچ کر آپ بڑی روانی اور تیز رفتاری سے منزل کی جانب گامزن ہو جاتے ہیں۔

یونگ اسٹریٹ سے نکل کر ایکسپریس وے پر پہنچنے میں دس پندرہ منٹ صرف ہوئے اس دوران میں زیادہ گفتگو نہیں ہوئی مگر جوں ہی کار ایکسپریس وے پر رواں ہوئی میگ کی زبان بھی رواں دواں ہو گئی۔ ہمارا خیال تھا شاید امریکا اور کینیڈا کی عورتیں ہماری عورتوں کی طرح باتونی نہیں ہوتیں۔

مگر توبہ کیجئے ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ عورتیں چاہے کسی بھی ملک کی ہوں۔ عورتیں ہوتی ہیں۔ صورت شکل' زبان' لباس اور رسم رواج کے علاوہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ البتہ وہاں کی عورتیں کچھ دیر کے لئے سنجیدگی' متانت اور رسمی تکلف کی پاسداری ضرور کرتی ہیں مگر زیادہ دیر تک نہیں۔

میگ نے اپنی گفتگو کا سلسلہ وہیں سے جوڑ دیا جہاں گزشتہ روز ختم کیا تھا۔ فلم اور شوبزنس سے ہر ملک کے لوگوں کو دلچسپی ہوتی ہے۔ ایک زمانے میں ہمارے ملک میں بھی فلم کا حوالہ آتے ہی سب نگاہیں اور کان چوکنا ہو جاتے تھے۔ بعد میں ہمارے ہاں فلم کے بارے میں گلیمر رفتہ رفتہ کم ہونے لگا۔ مگر دنیا کے دوسرے ملکوں میں فلم اور شو بزنس آج بھی سحر انگیز چیزیں ہیں۔ میگ نے پاکستان کی فلموں کے بارے میں سوالات کئے۔ کینیڈا کی فلموں کے بارے میں معلومات فراہم کیں' کینیڈا کے فلمی اداکاروں کے کچھ اسکینڈلز سنائے (جو ہم اخباروں میں بھی پڑھ چکے تھے) امریکا والوں کی شکایت کی اور پھر ہماری آئندہ فلم کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ ہم نے بڑی چابک دستی سے گول مول جواب دیے۔ ایک خیال کہانی کا خاکہ بھی سنا دیا۔

"آپ اداکار کہاں سے لیں گے؟" آخر حرف مدعا اس کی زبان پر آ گیا۔

ہم نے کہا "چند اداکار تو ہم پاکستان سے لائیں گے۔ باقی یہیں تلاش کریں گے۔"

"کیا سب پاکستانی اور ایشیائی ہوں گے؟"

"ظاہر ہے' مگر گورے کرداروں کے لئے مقامی کینیڈین تلاش کئے جائیں گے۔"

کہنے لگی "آپ بالکل فکر نہ کیجئے۔ میں اس بارے میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں۔ ٹی وی کے کچھ ایکٹر بھی میرے واقف ہیں اور بہت سی لڑکیاں اور لڑکے ایسے بھی ہیں جنہیں آج تک ٹی وی پر بھی موقع نہیں ملا۔ مگر وہ بہت اچھے ہیں۔ میرا مطلب ہے بظاہر دیکھنے میں۔ باقی ان کی اداکارانہ صلاحیتوں کے بارے میں تو آپ ہی بہتر جان سکتے ہیں۔"

"ظاہر ہے" ہم نے بہت معترانہ انداز میں کہا۔

"کیا خیال ہے۔ تھوڑی سی کافی نہ پی لی جائے؟" اس نے جانسز کے ایک سائن بورڈ کو دیکھ کر پوچھا۔

"اچھا خیال ہے"

سر راہ ریستوران کے سامنے ہم پہنچے تو پارکنگ میں خوب رونق تھی۔ بچے کھیل رہے تھے۔ ماں باپ ٹہل رہے تھے۔ رومانی جوڑے بانہوں میں بانہیں ڈالے رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ ہم عمارت کی طرف بڑھے تو اچانک کوئی ہم سے ٹکرایا اور ہم لڑکھڑا گئے۔

اگر میگ نے تھام نہ لیا ہوتا تو فرش پر نظر آتے۔ غصے سے پلٹ کر دیکھا تو ایک چھ سات سال کی خوب صورت گڑیا سی بچی پریشانی سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔

"میخ سی موسیو" اس نے اپنی معصوم آواز میں مخاطب کیا اور اس کے بعد ایک لمبی سی تقریر کر ڈالی جو ہماری سمجھ میں نہ آئی مگر میگ نے جواب میں مسکرا کر کچھ کہا تو وہ شرما کر مسکرانے لگی۔ میگ نے فوراً مترجم کے فرائض سرانجام دینے شروع کر دئیے اور ہمیں بتایا کہ اس نے ابھی تازہ تازہ اسکیٹنگ سیکھی ہے' اس لئے آپ سے ٹکرا گئی۔ بہت معذرت خواہ ہے۔

ہم نے بچی کو دیکھا تو وہ اپنی ہری ہری معصوم آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہی تھی اور اس قدر اچھی لگ رہی تھی کہ ہمیں اس پر بے اختیار پیار آ گیا۔ ہم نے مسکرا کر اسے دیکھا اور انگریزی میں کہا "کوئی بات نہیں۔ شکر ہے کوئی نقصان نہیں ہوا۔"

الفاظ تو وہ نہیں سمجھی مگر مفہوم سمجھ گئی فوراً سکرٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چاکلیٹ کا پیکٹ نکالا اور ہمیں پیش کر دیا۔

ہم نے میخ سی کہہ کر پیکٹ لے لیا تو اس نے فوراً اپنا ہاتھ ہماری جانب بڑھایا۔ ہم نے ہاتھ بھی تھاما اور اسے پیار بھی کیا۔ یورپ اور امریکہ میں ماں باپ اظہار محبت کے طور پر بھی بچوں کو زیادہ نہیں لپٹاتے اور پیار کرنے کا دستور تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ جب کہ ہم مشرقی لوگوں کو جب بچوں پر پیار آتا ہے تو بلا تامل انہیں پیار کر لیتے ہیں۔ بچی کو ہماری یہ حرکت غیر متوقع تو لگی مگر وہ اتنی خوش ہوئی کے بے اختیار ہم سے لپٹ گئی۔۔ موسیو موسیو۔ کے بعد پتا نہیں کیا کیا کہتی رہی۔ پھر ہمارا ہاتھ پکڑ کر اندر کی طرف چل پڑی۔ ہم نے میگ کی جانب دیکھا تو اس نے بتایا کہ وہ ہمیں اپنی ماں سے ملانا چاہتی ہے اور کہہ رہی ہے کہ آپ بہت سوئیٹ ہیں۔

ریستوران کے ہال میں ایک گوشے میں ایک چھوٹا سا مجمع لگا ہوا تھا۔ کچھ لڑکے اور لڑکیاں تصویریں بھی اتار رہے تھے۔ بچی ہمارا ہاتھ تھامے ہوئے ہمیں ان کے درمیان میں سے لے کر گزرتی ہوئی آگے پہنچی جہاں ایک کرسی پر ایک گلابی بالوں' گلابی چہرے اور سبز آنکھوں والی انتہائی خوش شکل خاتون تشریف فرما تھیں۔ یہ ہجوم ان ہی کے گرد اکٹھا تھا۔ کچھ لوگ ان کی تصویریں اتار رہے تھے۔ کچھ نوجوان لڑکے لڑکیاں ان سے آٹو گراف حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ وہ مسلسل مسکرا رہی تھیں۔ جس کی وجہ سے ان کا گلابی چہرہ اور شفق گوں ہو گیا تھا۔

ہم یہ دیکھ کہ ذرا ٹھٹکے مگر بچی ہمیں کھینچتی ہوئی ان کے سامنے لے گئی اور جاتے ہی "ماما" کہہ کر ایک مختصر سی تقریر جھاڑ دی' تو یہ اس گڑیا کی ماما تھیں۔ اتنی پیار بچی کی ماں بھی اصولاً ایسی ہی خوب صورت ہونی چاہئے تھی۔

ماما نے آس پاس کے ہجوم سے نگاہیں اور توجہ ہٹا کر ہمیں دیکھا اور پھر مسکرا کر "میخ سی موسیو وغیرہ وغیرہ" کہا اور ہماری جانب مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ ہمارا ایک ہاتھ بچی نے تھام رکھا تھا۔ دوسرا ہم نے مامے کے حوالے کر دیا۔

بچپن میں ایک کھیل کھیلا کرتے تھے۔ جس میں بچے خیالی آم چکھتے تھے اور آخر میں اس کا اختتام اس فقرے پر ہوا کرتا تھا کہ ۔۔۔ "میرے دونوں میٹھے۔" نہ جانے کیوں ہمیں اس وقت یہ کھیل اور یہ فقرہ بے اختیار یاد آ گیا۔ ماما نے اپنے انتہائی ملائم اور گرم ہاتھ میں ہمارا ہاتھ تھام کر بچی سے ایک دو سوالات کئے اور پھر ہم پر بھی چند الفاظ ضائع کئے۔ ضائع اس لئے کہ ہمارے پلے کچھ نہ پڑ سکا۔ اس نازک موقع پر میگ ہمارے کام آئی۔ اس نے آگے بڑھ کر مترجم کے فرائض انجام دیے۔ پہلے ہمیں بتایا کہ یہ اس بچی کی ماں ہیں۔ خیر' اتنا تو ہم بھی جان گئے تھے' مگر مزید یہ کہ وہ کینیڈا کی ایک گلوکارہ بھی ہیں۔ اور فرنچ نغمے گاتی ہیں۔ جین لوئی یا اسی قسم کا خالص فرنچ ان کا نام تھا۔ انہوں نے ہمارا ہاتھ چھوڑ کر میگ کا ہاتھ تھام لیا اور خوب گھل مل کر باتیں شروع کر دیں۔

اس اثنا میں تصویریں بنانے والوں نے اپنا کام جاری رکھا۔ ہر ایک کی نگاہوں میں عقیدت اور پرستاری کے جذبات تھے مگر کیا مجال جو ذرا سی بھی بد نظمی' بد تمیزی یا ہنگامہ آرائی نظر آئے۔ جو لوگ آٹوگراف لینے آئے تھے وہ بڑے صبر سے ایک جانب قطار میں کھڑے ہو گئے اور اپنی محبوب فن کارہ کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ میگ کی خوشی بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ایک مشہور فن کارہ اور گلوکارہ کے ساتھ یوں بے تکلفی سے ملاقات ہو جائے گی یہ اس نے سوچا بھی نہ ہو گا۔

جین لوئی نے بعد میں بھی ہمیں مخاطب کیا مگر ہم کچھ سمجھ نہ سکے۔ مگر مسکراہٹ کی دل آویزی سے اندازہ لگایا کہ شاید تشکر کے رسمی جذبات کا اظہار فرما رہی ہیں۔ ہمیں

احساس تھا کہ خواہ مخواہ ان کے رنگ میں بھنگ ڈال رہے ہیں اس لئے ان سے اجازت طلب کی۔ انہوں نے ایک بار پھر اپنا نازک خوشبو دار ہاتھ ہماری جانب بڑھا دیا اور فرنچ الفاظ کے ساتھ ہمیں رخصت کر دیا۔ اس تمام عرصے میں بچی ہمارا ہاتھ تھامے رہی تھی۔ چند لمحے کے لئے اس نے ہمارا ہاتھ چھوڑا تھا جب وہ اپنی ماں کو غالباً سکیٹنگ کرتے ہوئے ہم سے ٹکرانے کا واقعہ سنا رہی تھی۔ ماما کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تو تھی مگر وہ اسے اپنی زبان میں تنبیہہ بھی کر رہی تھی۔ مثلاً کہہ رہی ہو گی کہ خدایا' تمہیں شرم نہ آئی۔ کتنی بری بات ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب جو ہم ماما سے رخصت ہو کر چلے تو ان کی بچی مثل ہمارے ساتھ ہی چلی آئی۔ مثل' مثال' وغیرہ خاصا مقبول فرنچ نام ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں کے لئے مشترک ہے۔ اپنے اپنے طریقے ہیں۔ ہم سیلف سروس کاؤنٹر کی جانب گئے تو ہم نے مثل کے لئے ایک آئس کریم بھی اٹھا لی۔ چاکلیٹ کے دو پیکٹ اور ایک چیونگم کا پیکٹ بھی ٹرے میں رکھ لیا۔ میز پر بیٹھنے کے بعد جب ہم نے یہ چیزیں مثل کو دیں تو وہ خوشی کے مارے ہم سے لپٹ گئی۔ اور ہم نے بھی اسے پیار کیا۔ بس پھر کیا تھا۔ وہ تو ہمارے گلے میں بازو ڈال کر گود میں چڑھ کر بیٹھ گئی اور لگی مینا کی طرح باتیں کرنے۔ دنیا جہان کی داستانیں اس نے ہمیں سنا دیں۔

مغربی ملکوں میں بچوں کو ماں باپ اور بڑے لوگوں میں بیٹھنے اور ان سے باتیں کرنے کا موقع بہت کم ملتا ہے۔ گود میں بیٹھ کر باتیں کرنا تو شاید کرسمس وغیرہ کے موقع پر ہی ممکن ہوتا ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے بچے پیار کے بھوکے ہوتے ہیں۔ مثل کو بھی خدا جانے کتنے عرصے بعد یہ موقع ملا تھا۔ اس لئے اس نے دل بھر کے بھڑاس نکالی۔ وہ بار بار پیار سے ہمارا چہرہ چھو رہی تھی اور اتنی بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی جیسے برسوں سے آشنا ہو۔ مغربی تہذیب کا یہ رخ واقعی بہت تکلیف دہ ہے۔ ماں باپ سے دوری اور بے تعلقی آگے چل کر بالکل علیحدگی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور انسانی رشتوں کی بندش ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ میگ نے اس دوران میں ہمیں "ماما مثل" کے بارے میں کافی معلومات فراہم کر دی تھیں۔ ان خاتون کی عمر ۳۲ سال کے لگ بھگ ہے اور وہ کینیڈا کی اچھی خاصی معروف پاپ سنگر ہیں۔ فرنچ نسل سے تعلق رکھتی ہیں اور فرنچ نغمے گاتی ہیں۔ یہ ٹی وی پر کافی مقبول ہیں مگر زیادہ تر کلبوں میں نغمہ سرائی کرتی ہیں۔ خیر سے اس

چھوٹی سی عمر میں دو شادیاں کر چکی ہیں۔ مثل جس شخص کی بیٹی ہے اس سے ان کی شادی وادی نہیں ہوئی تھی۔ محض افیئر تھا جو ایک ڈیڑھ سال تک چلتا رہا۔ یہ دونوں شادیوں سے پہلے کا واقعہ ہے مثل کے باپ نے بعد میں کسی اور سے شادی کر لی اور جین نے یکے بعد دیگرے دو شوہر تلاش کئے اور پھر انہیں مسترد کر دیا۔ مثل ہمیشہ ماما کے پاس ہی رہی ہے۔ جب نئے "پاپا" آتے ہیں تو بلا تکلف انہیں "پاپا" سمجھنے لگتی ہے مگر ماما کا رشتہ تسلسل کے ساتھ قائم ہے۔ ظاہر ہے کوئی شخص اپنی ماں تو نہیں بدل سکتا۔ شاید اسی لئے قرآن شریف کہتا ہے کہ قیامت کے روز بچے اپنی ماؤں کی نسبت سے پکارے جائیں گے۔ اس میں جو حکمت اور مصلحت ہے وہ محتاج تشریح نہیں ہے۔

ہم نے کہا "یہ تو سب ٹھیک ہے' مگر اس خاتون نے بچی کو اپنے ساتھ کیوں رکھ چھوڑا ہے؟ باپ کے حوالے کیوں نہیں کر دیا؟"

میگ نے کہا "ہو سکتا ہے اسے بچی سے بہت زیادہ پیار ہو۔ پھر یہ بھی ہے کہ باپ جب تک عدالت میں ثابت نہ کر دے کہ وہ بچی کی اچھے ماحول میں تربیت کر سکتا ہے بچی اس کے حوالے نہیں کی جا سکتی۔ اگر ماں اور باپ دونوں بچوں کو نہ رکھیں تو ایسی صورت میں وہ یتیم خانے میں بھیج دیئے جاتے ہیں۔"

ہم نے بڑی ہمدردی سے اس معصوم بچی کو دیکھا جو ایک اصلی اور دو قانونی باپوں کے ہوتے ہوئے بھی بن باپ کی بچی تھی اور باپ کے سائے سے محروم تھی ظاہر ہے کہ دولت اور آسائش کی اسے عمر بھر کوئی کمی نہ رہے گی مگر باپ کی محبت وہ کبھی نہ پا سکے گی۔ شاید ان ہی جذبات کے تحت ہمیں مثل پر کچھ زیادہ ہی پیار آنے لگا۔ جب ہم رخصت کے لئے کار کے پاس گئے تو وہ اسکیٹنگ کرتی ہوئی ہمیں الوداع کہنے وہاں تک آئی۔ ایک بار پھر ہم دونوں گلے ملے۔ ایک دوسرے کو پیار کیا۔ اس نے اپنی ننھی منی بانہیں ہماری گردن میں ڈال کر ہمارے گالوں پر پیار کیا تو دل بھر آیا' مگر وہ خوش و خرم تھی' معصوم اور ناسمجھ جو تھی۔

کار میں بھی کچھ دیر ہم خاموش رہے۔ میگ نے بھانپ لیا تھا کہ ہم کچھ جذباتی ہو گئے ہیں۔ اس لئے وہ بھی خاموشی سے کار چلاتی رہی۔ پھر کہنے لگی "آپ کیوں خاموش اور افسردہ ہو گئے؟"

ہم نے اسے بتایا کہ مشل کے بارے میں سوچ کر غمگین ہو گئے ہیں۔

کہنے لگی "آپ مشرقی لوگ بہت زیادہ جذباتی اور گرم جوش ہوتے ہیں۔ یہاں تو یہ معمول ہے۔ شادی' محبت' بچے' یہ سب چیزیں آنی جانی ہیں۔ زندگی اس طرح رواں رہتی ہے۔"

میگ کے ان خیالات پر ہمیں غصہ تو بہت آیا مگر چپ رہے۔ پھر ہم نے پوچھا "جین نے ہم سے انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ آخر کیوں؟ کیا اسے انگریزی نہیں آتی؟"

بولی "پتا نہیں۔ مگر اسے کسی نے انگریزی بولتے ہوئے نہیں سنا۔ علی' میں تمہیں کیا بتاؤں کہ یہ فرانس کے لوگ کس قدر ضدی اور جھگڑا لو ہوتے ہیں۔ تعصب تو ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اس لئے تو میں مونٹریال چھوڑ کر ٹورنٹو آ گئی ہوں۔"

یہ مونٹریال اور صوبہ کیوبیک کے بارے میں ہمارا پہلا پہلا تجربہ تھا۔ جب مونٹریال پہنچے تو باقی حالات بھی معلوم ہو گئے۔ کہنے کو ٹورنٹو اور مونٹریال کے مابین پانچ سو میل کا فاصلہ ہے مگر دیکھا جائے تو یہ تین ہزار بلکہ تین لاکھ میل سے بھی زیادہ ہے یوں کہئے کہ کبھی نہ ختم ہونے والا فاصلہ ہے۔ زبان' کلچر' انداز فکر سبھی کچھ جدا ہے۔ انگریزی اور فرانسیسی اپنی نفرتیں' دشمنیاں اور بدگمانیاں سات سمندر پار بھی اپنے ہمراہ لے آئے ہیں اور یہاں بھی ایک دوسرے کے ساتھ بر سرِپیکار رہتے ہیں۔

"یہ فرنچ دوسری قوموں کو کمتر سمجھتے ہیں۔ اپنی زبان' تہذیب' تاریخ اور روایات پر بہت فخر کرتے ہیں۔ جیسے باقی سب تو گھسیارے ہیں" میگ اپنے دل کا غبار ہلکا کرنے میں مصروف رہی۔

ہم نے کہا "بھئی تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کو بالکل برداشت نہیں کر سکتے پھر گزارہ کیسے ہوتا ہے؟"

کہنے لگی "گزارہ کہاں ہوتا ہے۔ بس روپیٹ کر وقت گزارتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ بعض میاں بیوی ایک دوسرے کو کس قدر ناپسند کرتے ہیں کوئی چیز بھی مشترک نہیں ہوتی ان میں۔ اس کے باوجود ایک ہی چھت کے نیچے زندگی بسر کر دیتے ہیں۔ بس یہی معاملہ ان فرانس والوں کا بھی ہے۔"

ہم نے سوچا کہ یہ شکوے شکایات تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔ بلاوجہ سفر خراب کرنے سے کیا فائدہ۔ اس لئے میگ سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔

"یہ میگ کس قسم کا نام ہے؟ میگی تو ہم نے عورتوں کا نام سنا ہے۔"

کہنے لگی "آپ چاہیں تو میگی کہہ سکتے ہیں"

ہم نے کہا "یہ انگریزی نام بھی خوب ہوتے ہیں۔ جو چاہا رکھ لیا۔ مثلاً پیگ' پیگی' مسٹر رو۔ بھلا یہ بھی کوئی نام ہوا۔"

وہ ہنسنے لگی' ہم نے پوچھا "اعتراض نہ ہو تو ایک ذاتی سوال کریں؟"

"ہاں' ہاں۔"

ہم نے کہا "کیا تمہاری شادی ہو گئی ہے؟"

بولی "شادی تو نہیں ہوئی اب تک۔ مگر میں دوشیزہ بھی نہیں ہوں۔" ہم حیران ہو کر اسے دیکھنے لگے وہ بولی "شادی کیا چیز ہے۔ پادری کے سامنے گئے' اس نے دو بول کہے اور شادی ہو گئی۔ اصل چیز تو مرد اور عورت کا ملاپ ہے۔ وہ چرچ یا عدالت میں جائے بنا بھی ہو سکتا ہے۔ اور اب شادی تو ویسے بھی پریکٹیکل چیز نہیں رہی ہے۔ شادی کے بغیر ساتھ رہنے میں زیادہ فائدہ ہے۔"

ہم نے کہا "ہمارے ہاں تو یہ بہت معیوب بات سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے مذہب میں بھی گناہ ہے۔"

"مذہب کی کیا پوچھتے ہیں۔ ویسے تو یہ ہمارے مذہب میں بھی گناہ ہے مگر سوسائٹی کا رواج ہی بدل گیا ہے۔"

"میگی! ایک بات ہمیں بہت حیران کرتی ہے۔ ایک طرف تو تمہارے معاشرے میں گناہ' ثواب اور عورت کی عصمت و آبرو کا کوئی تصور نہیں ہے۔ دوسری جانب اگر کوئی مرد کسی لڑکی کو پریشان کرے یا اس کو بے آبرو کر دے تو اس کی پاداش میں کئی سال کی قید کاٹنی پڑتی ہے۔"

بولی "بھئی اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ اپنی مرضی سے اگر مرد اور عورت کچھ کرتے ہیں تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ زور زبردستی کی بات الگ ہے اور وہ قانون کی نگاہ میں جرم ہے۔"

"گویا عزت اور آبرو کا تو کوئی تصور ہی نہیں ہے؟"

"عزت آبرو کیا چیز ہے۔ پرانے زمانے کی فضول سی باتیں ہیں۔ ویسے یورپ میں تو پرانے زمانے میں بھی اس کی اہمیت نہیں تھی۔ شادی شدہ عورتیں کھلے بندوں دوسرے لوگوں سے افیئر کرتی تھیں۔ بادشاہوں کی بیگمات کی کہانیاں بھی سب کو معلوم ہوا کرتی تھیں۔ بلا وجہ کی منافقت ہے۔ اب دیکھو نا' اگر میں نے شادی کی ہوتی تو بچے بھی ہوتے۔ پھر ان کی پرورش کی پرابلم پیش آتی۔ جب میاں بیوی کا رشتہ قائم ہوتا ہے تو دونوں خواہ کتنے بھی آزاد خیال ہوں بدگمانی اور تنگ نظری کا مظاہرہ ضرور کرتے ہیں۔ پھر ایک دوسرے کی طرف سے پابندیاں بھی ہوتی ہیں۔ بات بڑھ جائے تو قانون اور عدالت بھی درمیان میں آ جاتی ہے۔ پھر انکم ٹیکس اور دوسرے جائیداد کے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس جھنجھٹ میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کیوں' کیا خیال ہے؟"

"بات تو ٹھیک ہے" ہم نے مری ہوئی آواز میں فوراً ہاں میں ہاں ملا دی۔

کہنے لگی "اور پھر شادی شدہ لوگ بھی تو وہی کچھ کرتے ہیں جو لوگ شادی کے بغیر کرتے ہیں۔ شوہر اپنی جگہ جھک مارتا رہتا ہے اور بیوی اپنی من مانی کرتی رہتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ دونوں میں اس بات پر لڑائی جھگڑا بھی ہوتا رہتا ہے۔ علی' میں تمہیں بتاؤں کہ میرا اپنے پارٹنر کے ساتھ کبھی معمولی سا جھگڑا بھی نہیں ہوا۔ اس کی نوبت آنے سے پہلے ہی ہم دونوں علیحدہ علیحدہ ہو جاتے تھے۔ اس کے بعد وہ اپنے گھر خوش اور میں اپنے گھر۔"

یہ سب باتیں ہمیں بھی معلوم تھیں' مگر وہ جس سادگی اور بے تکلفی سے بیان کر رہی تھی وہ ذرا عجیب سا لگا۔ برا اس لئے نہیں لگا کہ یہ تو ان کے معاشرے کا چلن تھا۔ البتہ یہ احساس ضرور ہوا کہ لاکھ خرابی سہی مگر مغرب میں ایک خوبی ضرور ہے کہ وہ لوگ منافقت نہیں کرتے' جو کرتے ہیں اس پر شرم سار بھی نہیں ہوتے اور نہ اسے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انگریزی محاورے کے مطابق ہر بری چیز کا ایک نہ ایک روشن پہلو ضرور ہوتا ہے۔

راستے میں ہم نے ایک بار پھر ریستوران میں کافی پی۔ تھوڑی سی چہل قدمی کی اور تقریباً دو سوا دو گھنٹے بعد مونٹریال پہنچ گئے۔

مونٹریال صوبہ کیوبیک کا دارالحکومت ہے جہاں فرانس سے تعلق رکھنے والوں کی اکثریت ہے۔ یوں تو ٹورنٹو بھی انتہائی خوب صورت شہر ہے مگر جب مونٹریال کو دیکھا تو اس کی خوب صورتی میں ایک الگ اور منفرد بات نظر آئی۔ سب سے پہلے تو کیوبیک کے علاقے میں داخل ہوتے ہیں ماحول' مزاج اور رسم و رواج کی تبدیلی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ شہر مونٹریال کو دیکھا تو یہ فرق اور زیادہ نمایاں نظر آیا۔ مونٹریال میں وہی نزاکت' نفاست اور دلکشی ہے جو فرانس کے شہروں کے ساتھ مخصوص ہے۔ فلک بوس عمارتیں بھی ہیں مگر زیادہ تعداد پرانی وضع کی چار پانچ منزلہ عمارتوں کی ہے سڑکوں کی بناوٹ' کنارے لگے ہوئے خوب صورت درخت عمارتوں کی وضع قطع' دکانوں کے سامنے رنگین سائبان' فٹ پاتھوں پر ریستورانوں کی رونق اور سب سے بڑھ کر عورتوں کی خوش لباسی اور مردوں کی خوش اخلاقی اور نرمی۔ ان چیزوں کی بدولت یوں لگتا ہے جیسے آپ فرانس کے کسی شہر میں آ نکلے ہیں۔ لیکن اگر ان چیزوں کو نظرانداز کر بھی دیں تو جگہ جگہ فرنچ میں لکھے ہوئے سائن بورڈ ہدایات اور اشارے اس شہر کے فرنچ ہونے کا احساس دلا دیتے ہیں۔ چلیں' اگر سائن بورڈ فرنچ اور انگریزی میں لکھ دیا جائے تب بھی کوئی بات ہے مگر انگریزی تو سرے سے ہی غائب نظر آتی ہے یعنی وہی صورت ہے جو پیرس میں ہوتی ہے اور ہم جیسوں کے لئے مسائل بھی ویسے ہی ہیں۔ یعنی سائن بورڈ دیکھ کر پتا ہی نہیں چلتا کہ یہ کیا چیز ہے؟ دفتر ہے' میوزیم ہے' اسپتال ہے یا کوئی اور ادارہ ہے؟"

ہم سے خاموش نہیں رہا گیا تو ہم نے کہا "ایسا لگتا ہے جیسے پیرس کے کسی علاقے میں آ گئے ہیں۔"

وہ جلے بھنے انداز میں بولی "پہلے یہ بتا کر [illegible] دم لیں گے۔ بہت متعصب

لوگ ہیں۔"

ہم نے کہا "مگر تم تو فرنچ بھی جانتی ہو۔"

"مونٹریال میں رہنے والوں کے لئے یہ لازمی ہے" اس نے بتایا "اسکولوں میں بھی پڑھائی جاتی ہے۔ کہنے کو انگلش اور فرنچ دونوں یہاں کی سرکاری زبانیں ہیں مگر انگلش کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے ہر جگہ فرنچ گھسا دیتے ہیں" اس کے لہجے کی تلخی بڑھتی جا رہی تھی۔

"خیر' یہ جھگڑے تو اب سبھی جگہ دیکھنے میں آتے ہیں۔

تم یہ کہو کہ اب ہمارا سفر کب ختم ہو گا۔"

"سفر تو ختم ہو گیا۔ ہم مونٹریال پہنچ گئے ہیں۔"

"مجھے کسی چھوٹے سے ہوٹل میں ٹھہرا دو۔ مگر یہ خیال رکھنا کہ وہاں کوئی انگریزی بولنے والا ضرور ہو۔"

وہ ہنسنے لگی "خیر اب ایسی بات بھی نہیں ہے کہ ہوٹلوں میں انگریزی بولنے والا بھی نہ ملے۔ مقام شکر ہے کہ کیوبیک ابھی تک کینیڈا ہی کا ایک حصہ ہے۔ خود مختار فرنچ ملک نہیں بنا ہے' مگر میرا تو خیال تھا کہ آپ میرے مہمان رہیں گے۔"

ہم نے کہا "تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی تمہارے گھر والوں کو تکلیف دینا مناسب نہیں ہو گا۔"

"گھر والے؟ کیسے گھر والے؟"

"میرا مطلب ہے تمہارے والدین۔"

"مسٹر آفاقی! میں کوئی بچی تو نہیں ہوں۔ جوان اور بالغ لڑکی ہوں' میرا اپنا اپارٹمنٹ ہے۔"

"اوہ' یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ تم بڑی ہو گئی ہو اور کینیڈا میں رہتی ہو۔ دراصل ہمارے ملک میں کسی نوجوان لڑکی کے تنہا ماں باپ سے علیحدہ رہنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

"میرا اپارٹمنٹ زیادہ بڑا تو نہیں ہے مگر تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ اپارٹمنٹ کیا ہے بس ایفی شنسی ہے۔"

امریکہ میں رہتے ہوئے ہمیں ایفی شنسی کا بھی پتا چل گیا تھا۔ یہ ایک کمرے پر مشتمل ہوتا ہے۔ وہی لاؤنج' وہی بیڈ روم' وہیں کچن۔ اکیلے رہنے والوں کے لئے بہت کار آمد چیز ہے۔

"تم بیڈ پر سو جانا میں صوفے پر سو جاؤں گی۔"

"مگر"

"صوفہ بھی بیڈ میں تبدیل ہو جاتا ہے میرے لئے بہت کافی ہے۔ ناشتہ میں خود بنا لیتی ہوں' کھانا باہر کھا لیا کریں گے۔"

وہ اتنی بے پروائی سے یہ پروگرام بتا رہی تھی جیسے ہم دونوں کی صنف اور جنس میں کوئی فرق ہی نہ ہو اور ایک سہیلی دوسری سہیلی کو اپنے ساتھ رہنے کی دعوت دے رہی ہو۔ ہمارے لئے یہ تجویز بہت ایمان شکن تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمیں زندگی میں کبھی کسی نوجوان اور خوب صورت لڑکی کے ساتھ اس طرح اکیلے رہنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ فلموں میں البتہ دیکھا کرتے تھے اور افسانوں میں بھی پڑھتے رہے' مگر مونٹریال میں ایک حسین و جمیل لڑکی کے ساتھ چند روز قیام کرنا بذاتِ خود ایک سنسنی خیز تصور تھا۔ دل تو بہت مچل رہا تھا مگر فطری جھجک نے راستہ روک دیا۔ ہمارے بہت سے بے تکلف دوست اسے بزدلی اور کم ہمتی سے بھی تعبیر کرتے ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ صنف مخالف کے ساتھ تنہا رہنے کے خیال نے ہمیں ہمیشہ اضطراب میں تو مبتلا کیا مگر کبھی اس کو عملی جامہ پہنانے کی توفیق نہ ہو سکی۔ ہماری ہچکچاہٹ سے اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ تجویز ہمیں پسند نہیں آئی ہے۔

بولی "ٹھیک ہے میں کسی ہوٹل میں بندوبست کر دیتی ہوں۔ ایسا ہوٹل جو میرے اپارٹمنٹ سے زیادہ دور نہ ہو۔ آخر تمہاری نگرانی بھی تو کرنی ہو گی۔"

جس ہوٹل میں ہم گئے اس کا نام "تمارا" تھا خدا جانے فرنچ زبان کا لفظ تھا یا کسی اور زبان سے مستعار لیا گیا تھا۔ یہ ہوٹل چالیس پچاس کمروں پر مشتمل تھا۔ ہر لحاظ سے اچھا اور آرام دہ۔ استقبالیہ پر سفید بالوں والی ایک ادھیڑ عمر خاتون براجمان تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی خالص امریکن انداز میں انہوں نے "ہائی" کہہ کر ہمیں خوش آمدید کہا وہاں کے دستور کے مطابق ہم نے بھی انہیں "ہائی" کہہ کر بدلہ اتار دیا۔ لیجئے' علیک سلیک تو ختم

ہوئی اور ہمیں یہ بھی اطمینان ہو گیا کہ اس ہوٹل میں کم از کم ایک ہستی ایسی ضرور ہے جو انگریزی بولتی اور سمجھتی ہے۔ کمرے کا کرایہ بھی معقول تھا۔ انہوں نے کمرے کی چابی ہمارے حوالے کی تو میگ نے مسکرا کر ہم سے رخصت طلب کی۔

بولی "میں ایک گھنٹے بعد آؤں گی۔ تم اتنی دیر میں فریش ہو جاؤ۔ پھر ہمیں کافی تگ و دو کرنی ہے۔"

میگ تو چلی گئی مگر بڑی بی نے معنی خیز انداز میں ہمیں دیکھا اور بطور یاد دہانی کہنے لگیں "مسٹر' آپ کو پتا ہے کہ آپ کا کمرا سنگل روم ہے جس میں صرف ایک شخص ہی رہ سکتا ہے۔"

ہم نے کہا "شکریہ میڈم! ہم سنگل کا مطلب سمجھتے ہیں"

نگران کا اندیشہ بھی ہم سمجھ گئے تھے۔

کمرا زیادہ بڑا نہیں تھا مگر بہت صاف ستھرا اور خوب صورت تھا۔ میز پر ایک حسین تازہ گلدستہ بھی سجا ہوا تھا۔ دیواروں پر پینٹنگز لگی ہوئی تھیں۔ ہم ہوٹل والوں کی نفیس مزاجی کے قائل ہو گئے۔ فریش اپ ہونے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اتنے مختصر سفر کے بعد تھکنے کا کیا سوال ہے۔ اور پھر ایسی صورت میں کہ ہم نے سفر بھی کینیڈا میں کیا تھا۔ سچ پوچھئے تو ان ملکوں میں کار کے ذریعے سفر کرنا بہت اچھی تفریح ہے جس کے بعد تھکنے کی بجائے تازہ دم ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ وقت گزاری کے لئے ہم نے ٹیلی ویژن آن کر دیا۔ کینیڈا میں یوں تو مقامی چینل بھی ہیں مگر زیادہ مقبولیت امریکی پروگراموں کو حاصل ہے۔ ہم نے تو ہر ایک کو امریکی پروگرام ہی دیکھتے اور ان کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے پایا۔

امیگریشن والی لڑکی نے شاید سچ ہی کہا تھا کہ امریکا والے کینیڈا پر ثقافتی اور مالی یلغار کر رہے ہیں اور کسی مقامی چیز کو پنپنے نہیں دیتے۔ مگر اس میں امریکا والوں کا اتنا زیادہ قصور نہیں ہے۔ ان کے پروگرام واقعی بہت دلچسپ اور جاندار ہوتے ہیں اس لئے کینیڈا والے بھی مقامی پروگراموں کے مقابلے میں امریکی پروگرام دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں جو لوگ کہتے ہیں کہ امریکا نے ساری دنیا کو اپنی دولت اور ایٹمی طاقت کے ذریعے فتح کر لیا ہے' سچ نہیں ہے۔ امریکا نے ساری دنیا کو محض میڈیا کے بل پر تسخیر کیا ہے۔ اخبارات میگزین اور ٹی وی پروگراموں کے ذریعے ساری دنیا کے رگ و پے میں اپنی پبلسٹی کا زہر داخل کر دیا ہے۔ ان کے ذہنوں کو مسخر کر لیا ہے۔ ذہنوں پر قبضہ جمانے کے بعد بھلا کسی اور چیز کو فتح کرنے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ یورپ کے ملکوں کی تو خیر بات اور ہے مگر ہماری سمجھ میں یہ نہیں آئی کہ آخر کینیڈا کے پاس کسی چیز کی کمی ہے جو وہ امریکا کا مد مقابل نہیں بن سکا۔ بے تحاشا دولت' بے محابا وسائل اور ٹیکنالوجی کے ہوتے ہوئے بھی کینیڈا امریکہ سے مرعوب ہے۔ دراصل امریکا کے مقابلے میں کینیڈا احساس کمتری کا شکار ہے۔ اس کا مقابلہ کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ٹی وی پر نیگرو اداکاروں کا ایک مقبول پروگرام پیش کیا جا رہا تھا: کامیڈی' فقرہ بازی سبھی کچھ تو تھا اس پروگرام میں۔ ہم بھی اسے دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ گرد و پیش کا ہوش اس وقت آیا جب استقبالیہ سے مس میگ کا فون آیا۔ وہ نیچے ہماری منتظر تھیں۔ یہ دیکھ کی حیرت ہوئی کہ اتنے مختصر وقت میں بھی انہوں نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ اب وہ جینز اور شرٹ میں ملبوس تھیں۔ کھلے ہوئے بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ شانے سے ایک نازک کیمرا لٹک رہا تھا۔ اور وہ کالج کی ٹین ایج طالبہ نظر آ رہی تھیں۔ چہرہ بھی چمک رہا تھا۔ جو اس بات کا غماز تھا کہ انہوں نے اپنا میک اپ ری ٹچ کیا ہے۔ ہم نے ایک ہی نگاہ میں سر سے پیر تک ان کا جائزہ لے لیا۔

وہ مسکرائیں اور پوچھنے لگیں "کیسی لگ رہی ہوں؟"

ہم نے کہا "کالج یا ہائی اسکول کی طالبہ۔

کہنے لگیں "جھوٹی تعریف تو بس مردوں پر ختم ہے۔ چاہے وہ کسی بھی جگہ کا ہو۔"

"اور تعریف سن کر پھولے نہ سمانا عورتوں پر ختم ہے چاہے وہ دنیا کے کسی بھی ملک کی ہو۔"

مسکرا کر کہا "شاید ہم دونوں ہی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اچھا اب چلیں؟"

ہم تو تھے ہی تیار۔ استقبالیہ کی جانب دیکھا تو وہاں میڈم تشریف فرما تھیں۔ بظاہر وہ کاغذات کو الٹ پلٹ کرنے میں مصروف تھیں مگر ان کے کان ہماری جانب ہی لگے ہوئے تھے اور گاہے گاہے ترچھی نظروں سے ہمارا جائزہ بھی لے لیتی تھیں۔ ہم نے کمرے کی چابی ان کے سامنے میز پر رکھ دی تو وہ مسکرائیں مگر بولیں کچھ نہیں۔ ہم ہوٹل سے باہر

نکلے تو ہم نے میگ سے کہا "یہ استقبالیہ پر جو خاتون ہیں یہ کچھ پُر اسرار سی نہیں لگتیں؟"

وہ کہنے لگیں "ہر عورت پر اسرار ہوتی ہے۔ اس کے دل کا بھید کوئی نہیں جان سکتا۔"

ہم یہ فلسفیانہ فقرہ سن کر مزید سوچ میں پڑ گئے۔

وہ کہنے لگی "مسٹر آفاقی! اصل بات یہ ہے کہ مونٹریال ایک عجیب سا شہر بن کر رہ گیا ہے۔ شک و شبہے کی فضا ہے۔ ہر شخص دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کے ارادوں کے بارے میں متفکر رہتا ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"آپ نے محسوس نہیں کیا؟ یہاں فرانس اور انگلستان کے مابین جنگ جاری ہے۔ یہ میدان جنگ ہے۔"

ہم نے چاروں طرف دیکھا۔ نہایت پُر سکون اور پُر امن ماحول تھا۔ خوب صورت سڑکوں پر ٹریفک بڑی باقاعدگی سے چل رہا تھا۔ خوب صورت عمارتیں' صاف ستھرے فٹ پاتھ اور سڑکوں کے کنارے سلیقے سے ترشے ہوئے درخت۔ فٹ پاتھوں پر اسمارٹ اور خوب صورت مرد اور عورتیں مصروف خرام تھے۔ جگہ جگہ سیمنٹ اور پتھروں کے گملوں میں رنگ برنگے پھول مسکراتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اس قدر پُر سکون اور پر فضا شہر بھلا میدان جنگ کیسے بن سکتا ہے؟ مگر بعد میں اندازہ ہو گیا کہ میگ کا بیان بالکل درست تھا۔ جنگ شہر میں نہیں تھی نہ ہتھیاروں کی مدد سے لڑی جا رہی تھی۔ یہ جنگ دراصل انسانی دل و دماغ کے اندر تھی اور نفرت کے ہتھیاروں سے لڑی جا رہی تھی۔ فرانس اور انگلستان کے درمیان دیرینہ نفرت اور عناد۔ انگریزی اور فرنچ نسل کے لوگوں کی باہمی آویزش۔ خدا جانے انسان دشمنیوں اور نفرتوں کو اتنے پیار اور احتیاط سے کیوں پالتے رہتے ہیں؟

میگ کی سرخ اسپورٹس نما کار میں ہم مونٹریال کی سڑکوں میں نکلے تو اس شہر کی رعنائی اور دلکشی ہمارے دل میں سما گئی۔ ٹورنٹو بھی خوب صورت شہر ہے مگر مونٹریال کی بات ہی کچھ اور ہے۔ یہ شہر ایک مدہوش کن مشروب کے مانند آہستہ آہستہ رگ و پے

میں سما جاتا ہے۔ ماڈرن شہر کی ہر خصوصیت مونٹریال میں پائی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ فرانس کی روایتی خوب صورت اور نزاکت بھی چپے چپے سے عیاں ہے۔ سڑکیں' چوراہے' بازار' شاپنگ سنٹر' پلازہ' عمارتیں' باغات' سبزہ زار اور پھولوں کے رنگین تختے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مونٹریال میں فرنچ آبادی کی اکثریت ہے۔ یوں تو سارے کینیڈا میں دو سرکاری زبانیں ہیں۔ انگریزی اور فرنچ' مگر یہاں عملی طور پر صرف ایک ہی زبان بول چال اور کام کاج کے سلسلے میں استعمال کی جاتی ہے۔ ہر جگہ سائن بورڈ اور ہدایات و اشارے فرنچ زبان میں لکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اب کوئی سمجھے یا نہ سمجھے۔ ان کی بلا سے' فرنچ آبادی اپنی روایات کے مطابق زبان اور کلچر کے معاملے میں سخت متعصب ہے۔ کیا مجال جو انگریزی زبان بولنے پر آمادہ ہو جائیں بلکہ اب تو یہاں کی حکومت نے سرکاری طور پر تمام ہدایات اور اشارے فرنچ میں تحریر کرنے کا حکم دیا ہے۔ اگر فرنچ ضد کے پکے ہیں تو انگریز بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ جس طرح وہ انگلش سے دور بھاگتے ہیں اسی طرح یہ بھی فرنچ سے پرہیز کرتے ہیں۔ اپنے بچوں کو فرنچ نہیں پڑھانا چاہتے حالانکہ اسکولوں میں اس کی تعلیم لازمی ہے۔ اگر یہ زبان سیکھ بھی جائیں تو بولتے نہیں ہیں۔ مختصر یہ کہ عجیب کشاکش اور کشیدگی کا ماحول ہے۔

مونٹریال میں فرانس والوں نے اپنی تاریخ اور تہذیب کو زندہ کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ پیرس کی تاریخی عمارتوں کے نمونے پر عمارتیں تعمیر کی ہیں۔ پیرس کے نمونے پر سڑکیں اور چوراہے بنائے ہیں۔ کئی سڑکیں بھی پتھروں کی بنی ہوئی ہیں۔ مشہور زمانہ نوٹرے ڈیم گرجا کے نمونے پر ایک گرجا یہاں موجود ہے۔ اسی طرح دوسری عمارتوں کی سیمپل بھی دیکھ لیجئے۔ یوں سمجھئے کہ انہوں نے ذہنی فضا کے ساتھ ساتھ عملی طور پر بھی فرنچ ماحول تخلیق کر لیا ہے۔

میگ نے کہا "یہ سامنے جو دکانیں ہیں یہ سب سامان آرائش کی اشیا سے بھری ہوئی ہیں' مگر اب ان سب کے سائن بورڈ فرنچ میں لکھوائے گئے ہیں۔ بھلا بتائیے یہ بھی کوئی زبردستی ہے؟"

ہم میگ کو کیا جواب دیتے۔ بھارت میں ہندوؤں نے اردو کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اور اردو کو جس طرح دیس نکالا دیا ہے ، اس کا قصہ اسے کیا بتاتے۔ زبان'

مذہب، نسل اور تہذیب سے نفرت کے تماشے ہم برصغیر میں بہت دیکھ چکے ہیں۔ اس لئے یہ نقشہ ہمارے لئے حیران کن نہیں تھا بلکہ ایک فرق یہ نظر آیا کہ تعلیم و تمدن کے باعث یہ اختلاف اور تعصب بھی تہذیب اور قانون کے دائرے میں رہ کر ہی روا رکھا جاتا ہے۔ ایک دوسرے کو مارنے پیٹنے یا توڑ پھوڑ کی نوبت نہیں آتی۔ بظاہر سڑکوں اور دیگر مقامات پر بھی کشیدگی اور باہمی نفرت کی کوئی اور علامت (زبان کے سوا) نظر نہیں آتی۔ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ عوام کے درمیان یہی فرق ہوتا ہے۔

آپ کو ہم مونٹریال کے فرنچ لوگوں کے تعصب کا قصہ سنانے تو بیٹھ گئے مگر اس کا پس منظر نہیں بیان کیا۔ اس بارے میں ہمیں کافی معلومات پہلے ہی تھیں مگر میگ نے ان میں مزید اضافہ کر کے انہیں اپ ٹو ڈیٹ کر دیا۔ بہتر ہو اگر اس موضوع پر مزید خامہ فرسائی سے پہلے ہم آپ کو بھی اس داستان کا پس منظر بتا دیں:

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ کینیڈا ایک کنفیڈریشن ہے۔ یہ ملک دس صوبوں پر مشتمل ہے، صوبوں کو کافی حد تک خود مختاری حاصل ہے۔ داخلی معاملات میں تو یہ بالکل خود مختار ہیں مگر خارجی امور میں بھی بہت حد تک من مانی کر لیتے ہیں۔ ان صوبوں کے نام یہ ہیں۔ اونٹاریو، نیو فاؤنڈ لینڈ، نور اسکوشیا، پرنس ایڈورڈ آئی لینڈ، نیو برنزوک، مانٹینا بو، سیکشیون، لابرنا، برٹس کولمبیا اور کیوبیک۔ اونٹاریو ملک کا سب سے بڑا، سب سے خوشحال اور سب سے زیادہ آبادی والا صوبہ ہے۔ کیوبیک میں فرانس کی نسل سے تعلق رکھنے والوں کی اکثریت ہے۔ دوسروں کے مقابلے میں یہاں فرنچ آبادی ۷۰۔۷۵ فیصد کے لگ بھگ ہے اور یہی فساد کی جڑ ہے۔ دوسرے صوبوں کا یہ معاملہ ہے کہ وہاں آباد ہونے والے بھی سارے کے سارے تو انگلستان سے نہیں آئے تھے مگر انگریزوں کا اثر و رسوخ بہت زیادہ تھا اور انہی کی حکمرانی تھی اس لئے سب نے انگریزی کو خاموشی سے کان دبا کر قبول کر لیا، مگر فرانس والے نہ مانے۔ وہ ہر جگہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کے قائل ہیں اور انگریزوں سے تو ان کی دشمنی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ انگریز اور فرنچ یورپ میں تو آپس میں لڑتے جھگڑتے ہی رہتے تھے مگر جب انہوں نے بیرونی مہم جوئی کا سلسلہ شروع کیا اور نئے نئے ملک تلاش کر کے فتح کرنے شروع کئے تو یہ لڑائی اور دشمنی یورپ سے باہر بھی پہنچ گئی۔ یورپ کی اقوام نے صدیوں قبل اپنی سرحدوں سے باہر پیر پھیلانے شروع کر دیے تھے ایک زمانہ تھا جب مسلمانوں نے بحری فتوحات میں نام پیدا کیا تھا۔ بہت اچھے جہاز راں تھے اور بحر و بر پر ان کا سکہ چلتا تھا۔ مسلمان حکومتوں کا زوال شروع ہوا تو یورپ والوں نے پر پرزے نکالے اور نئی دنیائیں میں تلاش کرنے نکل کھڑے ہوئے، اقبال تو کہہ گئے ہیں کہ

ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں یورپ والوں کو بھی اللہ میاں نے نئی نئی دنیائیں عطا فرمائیں۔ کولمبس صاحب اسپین سے چلے تو ہندوستان کی جستجو میں ایک نئی سرزمین پر پہنچ گئے جو آج امریکا کے نام سے مشہور ہے۔ شمالی اٹلانٹک کے ممالک نے بھی دور دور تک مار کرنی شروع کر دی۔ پرتگال، اسپین، ہالینڈ، انگلستان، فرانس ان سرگرمیوں میں پیش پیش تھے۔ ہوا یہ کہ جب کسی جگہ مختلف یورپی اقوام کے لوگ پہنچ جاتے تھے تو ان میں باہمی کشمکش پیدا ہو جاتی تھی۔ جنگیں ہوتی تھیں۔ اور جو زیادہ طاقتور اور ہوشیار ہوتا تھا وہ فتح یاب ہو جاتا تھا۔ ہندوستان کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں، ولندیزی، پرتگالی، انگریز اور فرنچ سبھی قدم جمانے کی کوششوں میں مصروف رہے مگر آخر کار فتح انگریزوں کو حاصل ہوئی۔ اس طرح ہندوستان انگریزوں کی نو آبادی بن گیا۔ فرانس نے افریقہ کی جانب رخ کیا۔ دوسرے علاقوں میں بھی پاؤں پھیلائے۔ ان میں کینیڈا بھی شامل ہے۔

کینیڈا ایک انتہائی وسیع و عریض ملک کا نام ہے یہ ایک سمندر سے دوسرے سمندر تک پھیلا ہوا ہے۔ رقبہ اتنا زیادہ کہ حساب کرنا مشکل ہے۔ وسائل اس قدر وافر کہ عام خیال یہ ہے کہ جب ساری دنیا کے ملکوں کے قدرتی وسائل ختم ہو جائیں گے تو کینیڈا کے پاس ان کا بہت بڑا ذخیرہ ہو گا کیونکہ آبادی کم ہے اس لئے ان وسائل کو زیادہ بے دردی سے استعمال بھی نہیں کیا جا رہا ہے۔ مگر فی الحال ہم کینیڈا کے ذکر کو پس پشت ڈال کر کیوبیک کے معاملے پر روشنی ڈالتے ہیں۔ میگ نے ہمیں ٹورنٹو سے وقت رخصت ہی بتا دیا تھا کہ کیوبیک اور ٹورنٹو کے درمیان کہنے کو تو صرف پانچ سو میل کا فاصلہ ہے مگر اس کے ساتھ ہی تین سو سالہ تاریخ بھی بیچ میں حائل ہے۔ تاریخ، روایات، اقدار، سبھی کچھ تو مختلف ہے۔ کیوبیک کے علاقے میں شروع ہی سے فرانس سے آنے والوں کی اکثریت رہی ہے۔ آباد کاروں کا عموماً یہی طریقہ رہا ہے کہ جہاں کسی کو سر

چھپانے کی جگہ مل گئی اس نے اپنے ہم وطنوں' رشتے داروں' دوستوں اور عزیزوں کو بلانا شروع کر دیا۔ کیوبیک میں بھی ایسا ہی ہوا ہو گا۔ یہاں اکثریت تو فرانس والوں کی تھی مگر صنعت و تجارت اور کاروبار پر انگریز چھائے ہوئے تھے۔ انگریزوں کو ہمیشہ سے ایک کاروباری قوم کہا جاتا ہے۔ یہ جہاں بھی گئے کاروبار کرنے کے لئے گئے بعد میں حسب ضرورت حکومت بھی کرنی شروع کر دی۔ کیوبیک میں بھی یہی واقعہ ہوا۔ فرانس والوں کی آبادی تو زیادہ تھی مگر وہ زیادہ تر ورکرز اور کاشتکار تھے۔ انگریز تجارت پر چھائے ہوئے تھے۔ حکومت بھی انہیں کی تھی۔ شاید ہم یہ بتانا بھول گئے کہ انگریزوں نے جب دنیا کو زیرو زبر کرنے کے ارادے سے اپنے جزیرے سے قدم باہر نکالا تو بہت سے دوسرے ملکوں کی طرح کینیڈا کا بھی رخ کیا اور اس ملک کو اول تا آخر تسخیر کر لیا۔ پہلے کیوبیک کے علاقے پر فرانس کی عملداری تھی۔ باقی علاقوں پر انگریزوں کا تسلط تھا۔ جب انہوں نے پیر پھیلانے شروع کئے تو جنگ ہو گئی جو ۱۷۵۶ سے ۱۷۵۹ء تک جاری رہی یہاں تک کہ انگریزوں نے کامیابی حاصل کر لی اور کیوبیک کو فتح کر لیا پھر فرانس والوں نے تھوڑی بہت جدوجہد جاری رکھی مگر انگریزوں نے انہیں بے دخل کر کے ہی دم لیا یہاں تک کہ ۱۷۶۳ میں کیوبیک پر انگریزوں کا مکمل قبضہ اور عمل دخل ہو گیا اور اسے بعد میں برطانوی نو آبای کا درجہ دے دیا گیا۔ شروع میں تو یہاں ۹۹ فیصد فرانس کے لوگوں کی آبادی تھی مگر پھر انہوں نے مایوس ہو کر دوسرے علاقوں کا رخ کیا تو یہاں فرنچ آبادی کم ہونے لگی۔ اب بھی یہاں فرنچ آبادی ۷۰ اور ۷۵ فیصد کے قریب ہے۔ جب صوبوں کو خود مختاری ملی تو کیوبیک میں فرانس والوں نے پھر پرزے نکالنے شروع کر دیے اور اپنی اکثریت کی بنیاد پر فرنچ زبان اور کلچر کو فروغ دینے لگے۔ اس طرح کیوبیک کینیڈا کا حصہ تو بن گیا اور انگریزوں کی نو آبادی بھی ٹھہرا مگر فرانس کی حکومت نے اس علاقے کے فرنچ لوگوں کی سرپرستی ترک نہیں کی۔ انگریز آبادی کو یہ شکایت بھی ہے کہ فرانس کی حکومتیں کیوبیک کی فرنچ آبادی کو اکساتی اور بہکاتی رہتی ہیں۔ جس زمانے میں جنرل ڈیگال فرانس کے صدر تھے' وہ کینیڈا کے دورے پر گئے تو کیوبیک بھی پہنچے اور انہوں نے خود مختاری کے حق میں کھلے کھلے بیان دینے شروع کر دیے برطانوی حکومت اور کینیڈا کی حکومت نے اس پر احتجاج بھی کیا مگر ڈیگال صاحب بڑے زبردست آدمی تھے۔ وہ کسی کے احتجاج کو بھلا کب خاطر میں لانے والے تھے۔ اگر جنرل ڈیگال کچھ عرصے اور برسرِاقتدار رہتے تو بہت ممکن تھا کہ فرانس کی جانب سے کیوبیک کو براہ راست ہر قسم کی امداد فراہم کر دی جاتی اور شاید وہ اب تک خود مختار بھی ہو چکا ہوتا۔ بہرحال' باہمی بے اعتمادی' شک و شبہ اور نفرت کے اس پس منظر میں کیوبیک آج بھی کینیڈا کا حصہ تو ضرور ہے مگر ذہنی اور نفسیاتی طور پر انگریزوں اور انگریزی سے قطع تعلق کر چکا ہے اور کچھ بعید نہیں کہ آئندہ چند سالوں میں وہ کینیڈا کی فیڈریشن سے علیحدہ ہو کر ایک خود مختار فرنچ ریاست بننے کا اعلان کر دے۔ اب کیوبیک میں مقامی حکومت نے انگریزی کے خلاف جو اعلان جنگ کیا ہے اس نے انگریزی بولنے والوں کو بہت پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے یہاں تک کہ بہت سے لوگ کیوبیک چھوڑ کر اونٹ آریون اور دوسرے علاقوں کا رخ کر رہے ہیں۔

میگ نے اپنی کار ایک خوب صورت ریستوران کے سامنے روکی اور کہا "کیا خیال ہے کافی اور اسنیک کے بارے میں؟"

ہم نے کہا "خیال تو اچھا ہے' مگر کیا اس ملک میں آئس کریم نہیں ملتی؟"

کہنے لگی "آئس کریم بہت' کس قسم کی آئس کریم پسند کریں گے؟"

ہم نے کہا "ہر قسم کی۔ بشرطیکہ وہ میٹھی ہو اور ٹھنڈی ہو" وہ ہنسنے لگی۔

دراصل مرزا غالب نے آموں کے بارے میں جو خوبی بیان کی ہے کہ میٹھے ہوں اور بہت ہوں وہی ہمارے نزدیک آئس کریم کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ہم جب سے کیوبیک میں پہنچے تھے۔ پیدل چلنے کی نوبت ہی نہ آئی تھی اس لئے آئس کریم نہ تو فروخت ہوتی ہوئی نظر آئی نہ ہمیں کھانے کا موقع ملا۔ ریستوران کے برابر میں ایک چھوٹی سی خوب صورت اسنیک بار ٹائپ جگہ تھی۔ باہر ایک خوب صورت سائن بورڈ پر لکھا ہوا تھا۔ "گلاسز" گلاس فرنچ میں آئس کریم کو کہتے ہیں۔ پیرس میں ہم نے "گلاسز" کی دکانیں بھی دیکھی تھیں اور کھانے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔ ہم نے میگ سے کہا "وہ رہی آئس کریم۔ چلو پہلے آئس کریم ہی کھاتے ہیں۔"

اس نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا "کیا تم فرنچ پڑھ لیتے ہو؟"

ہم نے کہا "دو چار الفاظ آتے ہیں جو پیرس کے متعدد سفروں کا حاصل ہیں۔"

دکان کے باہر ہی کون آئس کریم کی مشین لگی ہوئی تھی۔ ہم وہاں پہنچے تو ایک کھلتے

ہوئے سانولے رنگ کی نوجوان لڑکی بھی اندر سے نکل آئی۔ سانولی رنگت' سیاہ بال' سیاہ آنکھیں' دلکش نقوش' دیکھنے میں پاکستانی سی نظر آئی اگرچہ بال ترشے ہوئے تھے۔ اس نے جینز اور قمیص پہن رکھی تھی۔

ہم نے بے ساختہ اردو میں کہا "کون کون سا فلیور ہے آپ کے پاس؟"

وہ حیرت زدہ ہو کر ہمارا چہرہ دیکھنے لگی "میخ سی موسیو" یعنی معاف کیجئے' آپ کی بات نہیں سمجھی۔

ہمیں اپنی حماقت پر ندامت سی ہونے لگی۔ محض سانولی رنگت پر ہم اسے پاکستانی سمجھ بیٹھے تھے۔

میگ نے فوراً مذاکرات کی ذمے داری سنبھال لی۔ فلیور کا کیا ہے۔ ہمیں تو آئس کریم سے مطلب تھا۔ بہت خوش ذائقہ نکلی۔

ہم نے لڑکی سے پوچھا "انگریزی جانتی ہو؟"

وہ ہونقوں کی طرح ہماری شکل دیکھتی رہی۔ ہم نے میگ سے کہا کہ اس سے معلوم کرے کہ ان لوگوں کا آبائی وطن کون سا ہے۔ پتا چلا الجزائر کی رہنے والی ہے اور مسلمان ہے۔ مونٹریال ہی میں پیدا ہوئی ہے۔

ہم نے پوچھا "یو آر مسلم؟"

سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی "الحمد اللہ۔"

لیجئے' یہ تو عربی بولنے والی نکلی۔ سوچا اگر عربی جانتی ہے تو اردو کے چند بول بھی سمجھ لے گی مگر اردو سے نابلد تھی۔ میگ نے اس سے کچھ اور سوالات بھی کئے اور ہم لوگ ریستوران کی طرف چل پڑے۔ ہم برصغیر کے مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ مذہب کے معاملے میں حد سے زیادہ جذباتی ہوتے ہیں۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ چاہے وہ ہمیں گھاس ڈالیں یا نہ ڈالیں مگر ہم ان کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ جاتے ہیں اور تن' من' دھن لٹانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح دنیا کے کسی بھی خطے میں اگر کوئی مسلمان مل جائے تو اس سے وابستگی اور تعلق سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لڑکی سے بھی ہمیں خواہ مخواہ ایک انسیت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ افسوس یہ ہوا کہ ہم نے اس کا نام تک نہ پوچھا۔ اگر بٹ صاحب ہمارے ساتھ ہوتے تو سب سے پہلے نام ہی

دریافت کرنے پر مجبور کرتے۔ خیر' کچھ بھی نام ہو۔ ہمیں کیا' اور پھر ہمیں کون سا دوبارہ اس سے ملنا ہو گا۔ ایک دو روز کے لئے مونٹریال آئے ہیں۔ گھوم پھر کر واپس چلے جائیں گے' بلاوجہ جذباتی ہونے کا فائدہ؟

ریستوران کا نام "میکسم" تھا اور نیون سائن میں لکھا ہوا تھا۔ میگ نے یہ اطلاع فراہم کی کہ یہ ایک انگریز کا ریستوران ہے۔ پہلے اس کا نام "میکس" تھا مگر جب حکومت نے کہا کہ فرنچ نام لکھو تو مالک نے سوچا کہ کیوں نہ اس کا نام ہی بدل دیا جائے۔ "میکسم" پیرس کا مشہور ریستوران ہے۔ اس نام کی وجہ سے فرنچ گاہکوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا بعض لوگ کہتے ہیں کہ نام میں کیا رکھا ہے۔ ہمارا ذاتی تجربہ بھی یہ ہے کہ نام سے کافی فرق پڑتا ہے۔ چاہے انسانوں کا ہو یا کسی اور چیز کا۔ اس ریستوران کے مالک کا تجربہ بھی یہی تھا۔ میکس سے میکسم نام بدلتے ہی اس کے گاہکوں میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا اور منافع میں بھی اور حکومت کو بھی خوش کر دیا۔ اسے کہتے ہیں آم کے آم' گٹھلیوں کے دام۔

ریستوران بہت خوش وضع اور پر فضا تھا۔ اس طرح کہ عمارت کے اندر ایک جانب دیوار کے بجائے شیشہ لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے باہر کا سبزہ زار بھی ریستوران ہی کا ایک حصہ نظر آتا تھا۔ وہاں خوب صورت فوارے چل رہے تھے۔ بڑے فن کارانہ انداز میں روشنی کا بندوبست تھا۔ اس انداز کی سجاوٹ ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ایک گوشے میں ہم دونوں نے کرسیاں سنبھالیں اور میگ نے اپنا بڑا سا ہینڈ بیگ کرسی سے لٹکانے کے بعد کرسی سے پشت ٹکا دی۔ ایک اسمارٹ ویٹریس گلابی رنگ کی یونی فارم میں نمودار ہوئی۔ اس کے چہرے اور جسم کی رنگت بھی گلابی ہی تھی۔ سر کے بال بھی سرخی مائل تھے۔ سر تا پا سلگتا ہوا انگارہ بنی ہوئی تھی۔ کافی اور ویجی ٹیبل سینڈوچز کی فرمائش کرنے کے بعد میگ نے ہم سے پوچھا' علی! میں نے تمہیں سرسری طور پر شہر تو دکھا دیا ہے مگر تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہیں فلم کی شوٹنگ کے لئے کس قسم کی لوکیشنز کی ضرورت ہے؟"

ہمارے دل میں تو آئی کہ صاف صاف بتا دیں کہ ابھی فلم اور اس کی کہانی کا کوئی وجود نہیں ہے اور یہ سارا ہنگامہ شوکت صاحب کی غلط بیانی نے کھڑا کیا ہے۔ مگر پھر فٹی

فنی سچائی پر اکتفا کیا اور کہا "بات یہ ہے کہ کہانی ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ اس پر نظر ثانی بھی ہونی ہے۔ نوک پلک بھی سنوارنی ہے۔ اس لئے ہم صرف ایک اندازے کے لئے یہ مقامات دیکھ رہے ہیں۔ ویسے اگر مونٹریال کا تذکرہ نہ ہو پھر بھی خوب صورت مناظر کے لئے ہم یہاں مختلف مقامات پر شوٹنگ کر سکتے ہیں۔"

"تمہیں اداکاروں کی ضرورت تو ہو گی ہی؟ میرا مطلب ہے لڑکے اور لڑکیاں وغیرہ۔"

"ظاہر ہے۔"

"میرے کچھ جاننے والے بھی شاید تمہارے لئے کار آمد ثابت ہو سکیں۔ اگر پسند کرو تو میں تمہیں ان سے ملا دوں؟"

ہم نے کہا "فی الحال تو ضرورت نہیں ہے۔ شوٹنگ کا پروگرام بنے گا تو ضرور ملیں گے۔"

ویٹریس نے کافی اور سینڈوچز سامنے لا کر رکھ دیے اور ایک دلکش مسکراہٹ کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ خوش شکل ویٹریس رکھنے اور ان کے مسکرانے کا رواج بہت اچھا ہے۔ اس سے ماحول بھی روشن ہو جاتا ہے۔ اور بھوک بھی کھل جاتی ہے، مگر ہمارے ملک میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جس کی بے شمار وجوہ ہیں۔ ایک بات جو ہماری سمجھ میں آج تک نہیں آئی وہ یہ ہے کہ اتنی بہت سی خوش شکل اور خوش اندام لڑکیاں ان لوگوں کو کہاں سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔ معمولی معاوضے پر محنت سے کام کرتی ہیں۔ نہ کوئی نخرہ، نہ کوئی ناز و ادا۔ اس کے مقابلے میں ہمارے ہاں تو فلم کے لئے ہیروئن تلاش کرنے نکلو تو ڈھنگ کی شکلیں نظر نہیں آتیں۔ ہم نے بے شمار ایسی ویٹریسیں دیکھیں جو اگر ہمارے ملک میں ہوتیں تو ساری ہیروئنوں کو مات کر دیتیں۔ مثال کے طور پر اس گلابی ویٹریس کو ہی دیکھ لیجئے۔ مجسم پرانے شعرا کی "گلابی" نظر آتی ہے۔ ہم نے تو فوراً اسے ہیروئن کے طور پر پسند کر لیا۔ میگ کے سامنے یہ خیال ظاہر کیا تو بولی "مگر وہ آپ کی زبان تو جانتی نہیں ہے بلکہ انگریزی بھی نہیں جانتی۔ صرف فرنچ بول سکتی ہے۔"

ہم نے کہا "تو پھر کیا ہوا۔ ہم اس کے مکالمے اردو میں ڈب کر لیں گے۔"

پوچھنے لگی "مگر اداکاری کا کیا کریں گے؟"

"کیا مطلب؟ بھئی اداکاری کا بھی کیا کرنا ہے۔ اداکاری تو وہ کرے گی۔"

"مگر کیسے؟ اسے اداکاری آتی کہاں ہے۔ نہ کسی تربیتی ادارے میں گئی۔ نہ اکیڈمی میں سیکھی۔"

ہم نے کہا "یہ سب فضول باتیں ہیں۔ اداکاری تو ایک فطری صلاحیت ہوتی ہے۔ سیکھنے سکھانے سے نہیں آتی، جس میں قدرتی صلاحیت ہوتی ہے وہ سب پر بازی لے جاتا ہے۔"

وہ کچھ حیرت اور بے یقینی سے ہمیں دیکھتی رہی۔ پھر جیسے ہمیں تسلی دینے کی غرض سے بولی "اوکے، مان لیا مگر پھر بھی اتنی جلد بازی کی کیا ضرورت ہے۔ ابھی تو مونٹریال میں تمہارا پہلا دن ہے۔ کیا پتا اور کتنی خوب صورت لڑکیاں تمھیں نظر آئیں گی۔ اس لئے بہتر ہے کہ ابھی ہیروئن کی جگہ خالی ہے رکھو۔"

ہم نے کہا "ہم کون سا اس کے ساتھ معاہدہ سائن کر رہے ہیں۔ بس دل ہی میں تو سوچا ہے۔ جب چاہیں گے اپنی سوچ بدل لیں گے۔"

وہ ہنسنے لگی۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر بولی "علی! ایک بات بتاؤ۔ کیا میں ایک دوست کے طور پر تم پر بھروسا کر سکتی ہوں؟"

ہم نے کہا "مگر ابھی ہم دوست بنے کب ہیں۔ ہماری ملاقات کو دیر ہی کتنی ہوئی ہے؟"

بولی "دوستی وقت گزرنے کی محتاج نہیں ہوتی۔ یہ تو بس ایک احساس ہوتا ہے ایک جذبہ اور ہم آہنگی ہوتی ہے۔ کچھ لوگ زندگی بھر اجنبی لگتے ہیں اور بعض ملتے ہی اپنے اپنے سے محسوس ہونے لگتے ہیں۔"

ہم نے کہا "خیریت تو ہے، کیا ہم تمہیں اپنے اپنے سے لگ رہے ہیں؟"

بولی "مذاق کی بات نہیں ہے۔ میں بہت سیریس ہوں۔"

"ارے تو ناراض کیوں ہوتی ہو، اگر تم دوست سمجھتی ہو تو بس ہم بھی تمہارے دوست بن گئے۔"

وہ خوش ہو گئی "اچھا، تو ملاؤ ہاتھ۔" اس نے اپنا ہاتھ ہماری طرف بڑھا دیا۔ مغربی

ملکوں میں ہاتھ ملانا بھی ایک لازمی امر ہے۔ ملیں تو ہاتھ ملاؤ۔ رخصت ہوں تو ہاتھ ملاؤ۔ خوش ہوں تو ہاتھ ملاؤ۔ اور سیاسی لیڈر تو دن بھر میں اتنے لوگوں سے ہاتھ ملاتے ہیں کہ یقین نہیں آتا کہ ان کا ہاتھ اصلی ہے۔ اتنی بار ہاتھ ملانے کے بعد ہاتھ کا صحیح سلامت رہ جانا بہت تعجب انگیز ہے۔ خیر، ہم نے بھی بڑی خوشی سے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا جو میگ نے گرم جوشی سے تھام لیا۔ پھر کہنے لگی "میں تم سے ایک ذاتی معاملے پر گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تمہیں مونٹریال لانے کے پیچھے بھی میرا یہی ذاتی مقصد ہے۔"

ہم نے چونک کر اسے دیکھا۔ یہ لڑکی تو توقع سے زیادہ پر اسرار ثابت ہو رہی تھی۔

کہنے لگی "میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ بس افیئرز کرتی رہی ہوں۔"

اس بار تو ہم واقعی سوچ میں پڑ گئے کہ کہیں یہ ہمیں شادی کا پروپوزل ہی نہ دے دے مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ اسے معلوم ہے کہ ہماری شادی ہو چکی ہے۔ تو پھر معاملہ کیا ہے؟

ہم نے کہا "ہاں، آگے کہو۔"

بولی "مگر اب میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

"تو پھر رکاوٹ کیا ہے اس میں؟"

کہنے لگی "ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ میں نے سوچا شاید تمہاری وجہ سے وہ دور ہو جائے۔"

ہم نے خاموش رہ کر سننا ہی مناسب سمجھا، کہنے لگی "تم پاکستانی ہو نا؟"

"سنٹ پر سنٹ۔"

"مزلم بھی ہو۔"

ہم نے کہا "مزلم تو نہیں ہیں۔ البتہ مسلم ضرور ہیں۔"

اس نے ہماری تصحیح پر توجہ نہیں دی، کہنے لگی "کیا تم مزلم لوگ کسی غیر مزلم لڑکی سے شادی نہیں کرتے؟"

مروا دیا۔ اب تو ہمیں واقعی فکر پڑ گئی کہ یہ لڑکی تو واقعی فاسد ارادے رکھتی ہے۔ پھر بھی ہم نے اسے مسئلہ بتانا مناسب سمجھا "دیکھو میگ! ہم مسلم لوگ صاحب کتاب لڑکی سے شادی کر سکتے ہیں۔ صاحب کتاب سمجھتی ہو نا؟ جس مذہب کے ماننے والوں پر آسمان سے کتاب نازل ہوئی ہے۔ جیسے کرسچن، یہودی"

"بس تو ٹھیک ہے" اس نے ہماری بات کاٹ دی "میں کرسچن ہوں۔ بائبل ہماری مقدس اور آسمانی کتاب ہے۔"

"وہ تو ہے اگرچہ خیر، رہنے دو۔"

"نہیں نہیں۔ اپنا فقرہ پورا کرو۔"

"مطلب یہ کہ بائبل اب سو فیصد آسمانی کتاب نہیں رہی کیونکہ اس میں بہت سی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ پھر بھی، تم ایک صاحب کتاب لڑکی ہو۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میری شادی ایک مزلم سے ہو سکتی ہے۔"

ہم نے کہا "مگر تم تو شادی سے پہلے ہی اس بے چارے پر ظلم کر رہی ہو۔"

"وہ کس طرح؟"

"اسے مزلم کہہ کر۔ آخر تم مسلم کیوں نہیں کہتیں؟"

"بہت مشکل ہے، مگر میں مسلمان کہہ سکتی ہوں۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ آئندہ مزلم نہ کہنا۔ مسلمان ہی کہنا۔"

"اوکے۔ اوکے" وہ بے صبری سے بولی "اب میری بات بھی تو سنو یا بے کار بولے جاؤ گے۔"

ہم نے کہا "اسے بے کار کہتی ہو؟ ارے یہ مسئلے مسائل کا معاملہ ہے۔ ہم مسلمانوں کے لئے ان معاملات پر بحث کرنے سے زیادہ ضروری اور کوئی چیز نہیں ہے۔"

"سمجھ گئی۔ اب میری بات غور سے سنو۔ میں ایک مسلمان کو پسند کرتی ہوں۔"

"اوہ" ہم کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ وہ اپنی نیلی نیلی آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔

"اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

"وہ کیا چاہتا ہے" بے اختیار ہمارے منہ سے نکلا، مگر پھر ہم نے پوچھا "پہلے یہ تو بتاؤ کہ وہ ہے کون؟"

کہنے لگی "ایک پاکستانی ہے۔"

میرے اللہ' یہ تو پہیلیاں بجھوا رہی ہے۔ پھر ہمیں بیس سوالوں والا کھیل یاد آ گیا۔ آخر یہ چاہتی کیا ہے؟

"اچھا۔ تو وہ ایک مسلمان ہے اور ایک پاکستانی ہے' ٹھیک ہے۔ رہتا کہاں ہے؟"

"یہیں مونٹریال میں' اس کا نام مارگوب ہے۔"

ہم سوچ میں پڑ گئے۔ یہ مارگوب بھلا کیا نام ہوا "کیا نام بتایا تم نے۔"

"مار۔۔۔ گوب" اس نے ایک ایک حرف پر زور دے کر کہا۔

ہم نے ذرا غور کیا تو معاملہ سلجھ گیا۔ مرغوب کو وہ "مارگوب" کہہ رہی تھی۔

ہم نے کہا "سنو میگ! تم اس سے شادی کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔"

"وہ کس لئے؟"

"اس لئے کہ جس شخص کا تم نام بھی صحیح نہیں لے سکتیں اس کے ساتھ تمہاری زندگی کیسے گزرے گی۔ تمہارے اور اس کے کلچر میں' سوچ میں' زبان میں' ہر چیز میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

"یہ سب فضول باتیں ہیں۔ عملی زندگی میں ان کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

"تمہارا خیال بالکل غلط ہے۔ عملی زندگی میں ہر لمحے اور ہر قدم پر یہ فرق محسوس ہوتا ہے۔ بہرحال' یہ ہمارا ذاتی خیال ہے۔ تم آگے بیان کرو۔"

کہنے لگی "مارگوب مسلمان ہے' پڑھا لکھا ہے' ایک ادارے میں انجینئر ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔"

"تو پھر رکاوٹ کیا ہے؟"

"مذہب' وہ کہتا ہے کہ جب تک میں مسلمان نہیں ہوں گی شادی نہیں ہو سکتی۔"

"اور تم مسلمان نہیں ہونا چاہتیں؟"

"یہ بات نہیں ہے۔ میں تو بالکل تیار ہوں۔"

ہم نے تنگ آ کر کہا "دیکھو میگ! تم نے بہت زیادہ کنفیوژن پھیلا دیا ہے۔ تم دو لفظوں میں کیوں نہیں بتاتیں کہ مسئلہ کیا ہے؟"

کہنے لگی "کنفیوژن تو مارگوب نے پھیلایا ہے۔ اس کی باتیں تو خود میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ تم میرے ساتھ چل کر ملاقات کر لو؟" اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔

ہم نے جواب دیا "ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ کہاں ملے گا یہ مارگوب؟"

وہ خوش ہو گئی "میں ابھی فون کر کے اس سے وقت طے کر لیتی ہوں" وہ تیزی سے اٹھ کر پبلک فون بوتھ کی جانب چلی گئی اور ہم سوچ میں پڑ گئے کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ آپس میں شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میگ اس کی خاطر مسلمان ہونے کو تیار ہے۔ پھر بھی یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ آخر کیوں؟

چند لمحے کے اندر میگ واپس آ گئی "گڈ لک' وہ اپارٹمنٹ میں ہی مل گیا۔ چلو ابھی چلتے ہیں" اس نے اپنا پرس اٹھا کر ویٹریس کو اشارے سے بلایا۔ ہم نے بل پر ایک نظر ڈالی اور پانچ ڈالر کا نوٹ ٹرے میں ڈال دیا۔ میگ حیران ہو کر دیکھنے لگی "کیا مطلب ہے؟ تم نے میرا بل بھی ادا کر دیا۔"

ہم نے کہا "تم اتنے دن سے مارگوب سے مل رہی ہو۔ تمہیں اب تک اندازہ نہیں ہوا کہ ہمارے کلچر میں بل ہمیشہ مرد ہی ادا کرتے ہیں۔"

وہ ہنسنے لگی "شاید تم ٹھیک کہتے ہو' مگر جب بھی ہم دونوں ملتے ہیں تو میرا دھیان ان باتوں کی طرف بالکل نہیں جاتا۔"

صاف ظاہر ہے کہ اس غریب کا دھیان شادی کے مسئلے کی طرف لگا رہتا ہوگا۔

مرغوب کا اپارٹ منٹ زیادہ دور نہیں تھا۔ تمام راستے میگ اس کی خوبیاں بیان کرتی رہی۔ ہمیں خوشی اس بات کی تھی کہ ہمارے ایک پاکستانی بھائی نے کسی مغربی لڑکی کو اتنا متاثر کیا تھا۔ اس نے ہمیں مرغوب کے بارے میں ساری معلومات فراہم کر دیں۔ آٹھ نو سال سے مونٹریال میں مقیم ہے۔ انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ بہت ہوشیار طالب علم تھا۔ امتیازی نمبروں سے پاس ہو گیا اور پھر ایک ادارے نے اسے بہت اچھے معاوضے پر رکھ لیا۔ سال دو سال کے بعد پاکستان چلا جاتا ہے مگر اب وہ کینیڈین ہو چکا ہے اور باقی عمر یہیں گزارنے کا خواہش مند ہے۔ میگ سے اس کی ملاقات ایک تقریب میں ہوئی تھی جس کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آنے لگے۔ یہاں تک کہ دوستی ہو گئی۔ جب مرغوب سے دوستی ہوئی تو میگ نے دوسرے تمام مردوں سے دوستی ختم کر دی۔ جب وہ مونٹریال آتی ہے تو وہ دونوں عموماً ایک ساتھ

ہی رہتے ہیں۔

"تمہارے والدین کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے؟" ہم نے پوچھا

"انہیں کوئی اعتراض ہو سکتا ہے؟" اس نے جواب میں پوچھا ہم شرمندہ ہو گئے ہم یہ بھول ہی گئے تھے کہ وہ ایک مغربی لڑکی ہے اور کینیڈا میں رہتی ہے۔

ایک بہت اچھے رہائشی علاقے میں مرغوب کا ٹاؤن ہاؤس تھا۔ گھر کے سامنے دو کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک ویگن ٹائپ کی اور دوسری بہت لمبی چوڑی اور قیمتی امریکن کار تھی۔ امریکا اور کینیڈا میں عام طور پر لوگ دو یا تین کاریں رکھتے ہیں۔ میگ نے اپنی کار ڈرائیو وے پر روک دی اور ہم دونوں مکان کی طرف بڑھے۔ وہ نو عمر بچیوں کی مانند مضطرب اور ہیجان میں مبتلا نظر آتی تھی۔ گھنٹی بجاتے ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے ایک لمبا تڑنگا' خوش شکل پاکستانی کھڑا تھا۔

"ہائی" اس نے میگ کو دیکھ کر دانت نکال دیے اور پھر ہم سے اردو میں مخاطب ہوا "السلام علیکم' آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ایمان سے" اس نے گرم جوشی سے ہمارا ہاتھ تھام لیا اور گھر کے اندر لے گیا۔ میگ نے غالباً اسے مختصر طور پر ہمارے بارے میں بتا دیا تھا۔

"آرام سے بیٹھئے' اسے اپنا ہی گھر سمجھئے" اس نے ہمارے شانے پر بے تکلفی سے ہاتھ مار کر کہا "آپ کا نام تو میں نے بھی سن رکھا ہے۔ جب کراچی میں تھے تو اخباروں میں پڑھا کرتے تھے۔ ایک دو فلمیں بھی دیکھی ہیں آپ کی' مگر نام یاد نہیں رہے۔ آپ اس بات پر ناراض تو نہیں ہوں گے؟"

خاصا بے تکلف اور زندہ دل آدمی تھا۔ عمر میں میگ سے دو ایک سال بڑا ہو گا۔ مگر چہرے پر بھولپن اور شرارت کے باعث نو عمر نظر آتا تھا۔

"میرا نام تو آپ جان ہی گئے ہیں آفاقی صاحب' اور آپ کا نام میں پہلے ہی جانتا ہوں۔ اس لئے تعارف تو ہو گیا ختم۔ اب یہ بتائیں کہ کیا خاطر کریں آپ کی؟"

ہم نے کہا "ابھی ہم لوگ ریستوران ہی سے آ رہے ہیں۔"

ریستوران میں اور گھر میں بہت فرق ہوتا ہے۔ سب سے بڑا فرق تو یہ ہے کہ گھر میں کسی چیز کا بل نہیں دینا پڑتا" وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ ہمیں بھی ہنسی آگئی۔ بات بات پر زور دار قہقہے لگانا اس کی عادت میں شامل تھا۔ خاصا ہنس مکھ بلکہ مسخرا آدمی نکلا۔

"اچھا آپ بولئے۔ کیا پئیں گے؟"

ہم نے کہا "کافی یا چائے پی لیں گے۔"

"بھائی کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ ہم یہاں والوں کو کیا منہ دکھائیں گے؟ اتنی دور سے مہمان آیا ہو اور اسے چائے کافی پر ٹرخا دیں۔ اجی توبہ کیجئے۔ یہ بتائیں ڈرنکس میں کیا چلے گا؟"

"ہم تو ڈرنکس نہیں پیتے۔"

"کیا مطلب! آپ کچھ پیتے ہی نہیں؟ تو پھر زندہ کس طرح ہیں؟"

"مطلب یہ کہ نشہ آور چیزیں نہیں پیتے؟"

"یعنی آپ وہ ہیں جنہیں انگریزی میں "ٹی نو تلر" کہتے ہیں۔ ویسے یقین نہیں آتا۔ ہم نے تو سنا ہے کہ فلم والے مچھلی کی طرح پیتے ہیں اور بڑے پاپی ہوتے ہیں، مگر آپ کے چہرے سے لگ رہا ہے کہ سچ ہی بول رہے ہیں۔ ٹھیک ہے تو پھر آپ کے لئے کافی آ جائے گی۔"

"اتنی جلدی کیا ہے" ہم نے اسے روکنا چاہا۔

"ارے صاحب! کافی بنانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ وہ دیکھئے سامنے تیار رکھی ہے۔ بس پیالی میں ڈالنے کی دیر ہے۔

آپ بلیک کافی لیں گے یا

"دو تین چمچے چینی اور اچھا خاصا دودھ۔"

"مزہ آگیا اب پتا چلا ہے کہ پاکستانی سے ملے ہیں۔"

اس گفتگو کے دوران میں میگ خاموش مگر پسندیدہ نظروں سے مرغوب کو دیکھتی رہی اور مسکراتی رہی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات سے اس کی والہانہ الفت کا اظہار ہو رہا تھا۔

سامنے کچن کاؤنٹر پر ہمارے لئے کافی بناتے ہوئے اس نے میگ سے انگریزی میں پوچھا "میگی! تم کیا پسند کرو گی؟"

"وہی جو تم پسند کرو گے۔"

اس نے زور دار قہقہہ لگایا اور انگریزی میں کہنے لگا "دیکھا آپ نے۔ یہ لڑکیاں کتنی چالاک ہوتی ہیں۔ مردوں کو شیشے میں اتارنے کا فن خوب جانتی ہیں۔"

میگ بھی ہنسنے لگی۔ دوسرے لمحے وہ ایک ٹرے میں کافی کا مگ اور دو جام شراب لئے ہوئے ہمارے پاس آگیا "چیرز" اس نے اپنا جام اٹھا کر میگ کے جام اور ہمارے کافی کے مگ سے ٹکرایا پھر میگ سے مخاطب ہو کر بولا "اب اپنا میوزک شروع کرو۔"

میگ نے کچھ مجوب انداز میں ہماری طرف دیکھا اور بولی "میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب آپ بھی انہیں بتائیں کہ ہماری شادی کیوں نہیں ہو سکتی؟"

مرغوب یکایک سنجیدہ ہو گیا۔ پھر ہماری طرف دیکھ کر متانت سے پوچھنے لگا "آپ نے سارا کیس سن لیا ہے؟"

ہم نے اقرار میں سرہلا دیا اور کہا "مگر تم سے ملنے کے بعد حیرت ہو رہی ہے"

"حیرت کی کیا بات ہے؟" اس نے دوبارہ اردو میں بات چیت شروع کر دی۔

"شادی کے لئے مسلمان ہونے اور نکاح کرنے کی شرط سن کر ہم یہ سمجھے تھے کہ تم کوئی پکے مسلمان قسم کے آدمی ہو گے مگر یہاں تو رنگ ہی کچھ اور ہے۔ شراب بھی پیتے ہو۔ شادی کے بغیر ایک لڑکی کے ساتھ رہتے ہو۔"

وہ ہنسنے لگا، پھر کہا "دیکھئے مسلمان چاہے کچھ بھی کرے مگر دلی طور پر وہ مسلمان ہی رہتا ہے۔ اب میں کتنے سالوں سے یہاں رہتا ہوں پھر بھی میرے اندر کا مسلمان کمزور نہیں پڑا۔ جتنے گناہ پاکستان میں کرتا تھا اتنے ہی یہاں بھی کرتا ہوں، مگر یوں لگتا ہے جیسے میں پہلے کے مقابلے میں زیادہ پکا مسلمان ہو گیا ہوں۔"

مسلمانوں کی نفسیات کا یہ پہلو ہمیشہ معما رہا ہے کہ ایک طرف تو وہ برائیوں میں پڑ جاتے ہیں دوسری طرف نماز روزہ بھی کرتے ہیں اور اسلام کے بعض اصولوں کو بہت مضبوطی سے تھام کر رکھتے ہیں۔ یہ معما کم از کم ہماری سمجھ میں تو کبھی آیا نہیں۔

ہم نے مرغوب سے کہا "اچھا" اس بحث کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ تمہاری شادی کے راستے میں رکاوٹ کیا ہے۔ یہ لڑکی مسلمان ہونے کے لئے تیار ہے۔ تم اسے بیوی بنانا

چاہتے ہو۔ پھر مشکل کیا ہے؟"

کہا "مشکل یہ ہے کہ مولوی صاحب اسے مسلمان کر کے اس کا نکاح میرے ساتھ پڑھانے پر آمادہ نہیں ہیں۔

"وہ کیوں؟"

"وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک گناہ گار لڑکی ہے۔ کتنے ہی مردوں کے ساتھ زندگی گزار چکی ہے۔"

"مگر اب تو یہ توبہ کر کے مسلمان ہو رہی ہے۔"

"مگر پچھلے گناہوں کا کیا ہو گا؟ اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ میرا نکاح پڑھانے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ اتنے عرصے تک گناہ کی زندگی بسر کی ہے۔ اب تمہارا نکاح کیسے پڑھا دوں۔"

ہم سوچ میں پڑ گئے۔ مولوی صاحب کا اعتراض بھی بجا تھا مگر کسی شخص کو مسلمان بنانے سے انکار کرنا بھی کچھ عجیب سی بات تھی۔ میگ بولی "میں یہ بات سمجھتی ہوں۔ مگر یہ بتائیں کہ اگر کوئی شخص اپنے گناہوں سے توبہ کر لے تو پھر کیا مشکل ہے۔ ہم کرسچین تو ہفتے کے ہفتے پادری کے پاس جا کر گناہوں کا اعتراف کر لیتے ہیں اور وہ دعا دے کر بخشش کرا دیتے ہیں۔"

ہم نے کہا "میگ تمہارے پادری اور ہمارے مولوی صاحب میں بہت فرق ہے۔ جس طرح تمہارے مذہب میں اور ہمارے مذہب میں فرق ہے۔ تمہارے پادری صاحب نے تو اس کو ایک معمولی سی بات بنا دیا ہے۔ یعنی تمام ہفتے گناہ کرو' اتوار کے روز گرجا جا کر پادری صاحب کے سامنے گناہوں کا اعتراف کر لو۔ سارے پچھلے گناہ معاف اور آئندہ نئے گناہ کرنے کی کھلی چھٹی۔ توبہ کا مطلب ہمارے مذہب میں یہ ہے کہ گناہ کا احساس کرنے کے بعد سچے دل سے اللہ سے معافی مانگی جائے اور پھر دوبارہ وہ گناہ نہ کیا جائے۔"

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی "علی! میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ اب میں کیا کروں؟"

ہم نے مرغوب سے کہا "کیا ایک بار اپنے مولوی صاحب سے ملا سکتے ہو؟"

بولا "ابھی لیجئے" اس نے فوراً ٹیلی فون ملایا۔ علیک سلیک کی اور کہا کہ ہم چند منٹ کے لئے ابھی آپ کے پاس آ رہے ہیں۔

مولوی صاحب کا اپارٹ منٹ زیادہ دور نہیں تھا۔ راستے میں مرغوب نے ان کا حدود اربعہ بھی بتا دیا۔ پاکستان میں وہ تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ کینیڈا بھی تبلیغ کے سلسلے میں ہی آئے تھے اور پھر یہیں رہ گئے۔ کسی پٹرول پمپ پر کام کرتے ہیں اور خالی وقت میں تبلیغ بھی کرتے ہیں۔ کئی بار چھٹی لے کر بھی تبلیغ کے لئے نکل جاتے ہیں اور اس چکر میں ان کی نوکری بھی چلی جاتی ہے' مگر نوکریوں کی وہاں کیا کمی ہے۔ ان کا نام عبدالغنی صدیقی تھا۔

مولوی صاحب کا اپارٹ منٹ بھی ویسا ہی تھا جیسے دوسرے ہوتے ہیں۔ صوفہ' میز کرسی' البتہ دیواروں پر طغرے آویزاں تھے۔ ایک طرف سائڈ بورڈ پر قرآن شریف اور کچھ کتابیں رکھی ہوئی نظر آئیں۔ معلوم ہوا کہ مذہبی کتابیں ہیں۔ مولوی صاحب کو ہم نے دیکھا تو بہت حیران ہوئے۔ وہ عمر میں مرغوب ہی کے برابر ہوں گے۔ سرخ و سفید رنگ' سیاہ بال' سیاہ داڑھی مونچھیں۔ بہت نورانی چہرہ تھا۔ کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھے مگر گلے میں ٹائی نہیں تھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ٹائی نہیں لگاتے کیونکہ یہ صلیب کی علامت ہے۔ بات چیت اور رہن سہن سے بھی ان میں کوئی "مولوی" والی بات نظر نہیں آئی۔ بہت گرم جوشی سے ملے۔

ہاتھ ملایا اور بغل گیر ہوئے۔ مرغوب سے بھی مصافحہ کیا میگ سے "السلام علیکم" کہہ کر مخاطب ہوا۔ اس نے جواب میں بہت مشکل سے "وا لیکم اسلام" کہا۔

کہنے لگے "مجھے نصف گھنٹے بعد ڈیوٹی پر جانا ہے۔ اس لئے آپ کی تواضع نہ کر سکوں گا۔ فرمائیے' کیسے آنا ہوا؟"

ہم نے جلدی جلدی حرفِ مدعا بیان کیا اور عرض کیا کہ حضرت یہ لڑکی مسلمان ہونا چاہتی ہے تو اسے مسلمان کیوں نہیں کرتے اور ان دونوں کو میاں بیوی بنانے میں آپ کو کیا اعتراض ہے؟

انہوں نے کھنکار کر گلا صاف کیا' پھر سنجیدہ ہو گئے' کہنے لگے "دیکھئے بھائی صاحب' مذہب کے معاملے میں کوئی رعایت نہیں ہو سکتی۔ یہ دونوں پہلے ہی گناہ کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اسلام کی رو سے ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جائے۔ یہ اپنے اس گناہ کا بذات خود اعتراف کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا نکاح میں کیسے پڑھا

دوں؟"

ہم تو ان کی باتیں سن کر پریشان ہو گئے مگر وہ نہایت نارمل انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔ پھر کہنے لگے "اور یہ صاحب زادی اسلام کے فیوض و برکات سے باخبر ہو کر مسلمان نہیں ہو رہی ہیں بلکہ مرغوب کے ساتھ شادی کرنے کی خاطر اسلام قبول کر رہی ہیں۔ اب اگر ایسی عورت کو مسلمان کر بھی لیا جائے تو فائدہ کیا ہو گا؟ دل سے تو یہ کبھی مسلمان نہ ہو گی۔ نہ ہی اپنے بچوں کو مسلمان بنائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان بن کر غیروں کے سامنے ایک بھونڈی مثال پیش کرے گی اور عمل کے لحاظ سے ویسی ہی رہے گی جیسی کہ اب ہے۔ نماز روزہ تو دور کی بات ہے یہ تو اسلام کے معمولی مطالبات اور مسائل تک سے واقف نہ ہو گی۔ تو پھر اسے برائے نام مسلمان بنانے کا گناہ میں اپنے سر کیسے لے لوں؟"

مولوی صاحب کی بات بھی معقول تھی۔ ان کی باتوں کا کوئی معقول اور مثبت جواب ہمیں فوری طور پر نہ سوجھا اس لئے ہم نے کہا "دیکھئے غنی صاحب اس وقت آپ بھی جلدی میں ہیں اور ہمارے پاس بھی وقت نہیں ہے۔ ہم آپ کا نقطۂ نظر سمجھ گئے ہیں۔ اس موضوع پر پھر کبھی بات ہو گی۔"

وہ بولے "انشاء اللہ اب آپ کی کیا خاطر کروں؟ جوس پیش کروں یا چائے کافی؟"

ہم نے بہتیرا کہا کہ اس وقت جلدی ہے' پھر کبھی سہی' مگر وہ نہ مانے اور چائے پلا کر ہی دم لیا۔ میگ کو اندازہ ہو چکا تھا کہ مذاکرات ناکام ہو چکے ہیں اس لئے وہ بہت خاموش اور مایوس نظر آ رہی تھی۔ ہمیں اس غریب پر بہت ترس آیا مگر بقول مولوی صاحب کے مذہب کا معاملہ تھا' ہم کیا کر سکتے تھے؟

واپسی میں ہم نے مرغوب کو ان کے مکان پر چھوڑا اخلاقی امداد کے لئے ہم نے کہا "بھائی تم ان مولوی صاحب کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟ یہ کوئی عالم تو ہیں نہیں۔ کوئی اور مولوی ڈھونڈ لو۔"

کہنے لگا "نہیں آفاقی صاحب! میرا دل نہیں مانتا۔ یہ بہت صحیح آدمی ہیں۔ جو کہتے ہیں ٹھیک کہتے ہیں کسی دوسرے کے پاس جانا تو محض اپنے آپ کو دھوکا دینا ہو گا۔"

ہم نے ایک تجویز پیش کی "دیکھو' تم دونوں آج کل کسی شادی وادی کے بغیر ہی

رہتے ہو نا۔ اس سے یہ بہتر نہیں ہے کہ تم سول میرج کر لو"

وہ بات کاٹ کر بولا" یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ سول میرج یا کورٹ میرج تو وہ لوگ کرتے ہیں جو مذہب کو نہیں مانتے۔ میں یہ کیسے کہوں گا کہ میرا کوئی مذہب نہیں ہے۔"

"تو پھر اس کا حل کیا ہے؟"

"ابھی تو کچھ نظر نہیں آتا۔ جب تک کام چلے گا چلائیں گے۔ بعد میں اللہ مالک ہے۔"

مرغوب کی ''مسلمانی'' کا یہ روپ ہمارے لئے انوکھا تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کو سراہیں یا مذمت کریں۔ ایک طرف تو یہ جذبہ ہے کہ اسلامی احکامات کی تعمیل کرنی چاہیے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مرغوب اور ان کے پیر صاحب دونوں قابل تعریف ہیں۔ مگر جب دوسری طرف یہ دیکھئے کہ میگ اور مرغوب جس گناہ کی زندگی میں ملوث ہیں وہ کون سا اسلامی فعل ہے اور کیا اس سے بہتر یہ نہ ہو گا کہ وہ دونوں شادی کر لیں اور کم از کم ایک گناہ سے تو بچ جائیں۔ پھر مولوی صاحب کا فتویٰ بھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر ایک لڑکی مسلمان ہونے پر آمادہ ہے تو محض اس لئے کہ ماضی میں گناہ کرتی رہی ہے اور اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ مسلمان کی محبت میں گرفتار ہو کر مسلمان ہونا چاہتی ہے تو اسے مسلمان بنانے میں کیا حرج ہے؟ بہرحال اپنا اپنا عقیدہ اور اپنی اپنی سوچ کا انداز ہے۔ ان معاملات میں بحث مباحثے سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اس لئے ہم نے اس سلسلے میں مزید گفتگو سے پرہیز کیا۔

میگ غریب خاموش اور اداس نظر آ رہی تھی۔ یوں تو اس کے لئے یہ سب کچھ غیر متوقع نہ تھا پھر بھی دنیا امید کے سہارے قائم ہے اس کو یہ خیال ہو گا کہ ممکن ہے ہم مرغوب کو اور ان کے مولوی صاحب کو سمجھا بجھا کر راہ راست پر لے آئیں۔ اب جب کہ یہ امید بھی ٹوٹ چکی تھی' وہ پہلے سے زیادہ مایوس اور دل گرفتہ ہو گئی تھی۔

''علی اس سارے معاملے کو تم کیا کہو گے؟''

اس نے ہوٹل واپس جاتے ہوئے ہم سے پوچھا۔

دل میں تو آئی کہ صاف صاف کہہ دیں کہ ہمارے خیال میں تو یہ ''منافقت'' کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مگر پھر سوچا کہ یہ لڑکی خواہ مخواہ مسلمانوں کے بارے میں اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اس لئے ہم نے پہلے تو کھنکار کر گلا صاف کیا اور پھر کہا ''بہت بدقسمتی کی بات ہے۔''

پوچھنے لگی ''یہ بتاؤ کہ اگر تم مرغوب کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟''

یہ خاصا مشکل اور براہ راست سوال تھا۔ یورپ اور امریکہ میں لوگ اس قسم کے سوالات اکثر پوچھا کرتے ہیں۔ دراصل ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو دوسرے کی جگہ رکھ کر سوچے تو وہ زیادہ انصاف پسند ہو سکتا ہے۔ مگر ہمارے ہاں تو ایسا کوئی رواج ہی نہیں ہے۔ ہر کوئی محض اپنی ذاتی رائے' نظریے اور فیصلے کو ترجیح دیتا ہے۔ دوسرا جائے جہنم میں۔

ہم نے کہا ''دیکھو میگ! یہ ذاتی اور انفرادی قسم کے مسائل ہیں۔ ہر شخص دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اس کے سوچنے کا انداز الگ ہوتا ہے۔ انسانوں اور جانوروں میں یہی تو فرق ہے کہ جانور سوچ نہیں سکتے جب کہ انسان اپنی عقل کے مطابق سوچنے اور فیصلے کرنے پر قادر ہے۔''

وہ کہنے لگی ''کاش ہم انسان بھی سوچنے سمجھنے کی قوت سے محروم ہوتے۔''

''معاف کرنا یہ تو بہت ناانصافی ہے۔ حالات تمہارے موافق نہیں ہیں تو تم انسانوں کی عقل و فہم کی دشمن ہو گئی ہو۔''

''یہ بات نہیں ہے۔ میرے ذاتی تجربے سے اس بات کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ انسان کی عقل نے اسے کتنے نقصانات پہنچائے ہیں' کتنا برباد کیا ہے۔ یہ ایجادات' سائنس کی ترقیاں' خود غرضیاں' مختلف نظریات' فارمولے اور خیالات ان سب چیزوں نے سوائے لڑائی جھگڑے اور تباہی کے ہمیں اور کیا دیا ہے؟''

ہم نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔

کچھ دیر بعد اس نے ایک لمبی سرد آہ بھری اور خود کلامی کے انداز میں بولی ''کاش میں نے ایک مسلمان سے دل نہ لگایا ہوتا۔ میں تو نفسیاتی مریضہ بن کر رہ گئی ہوں۔ اس سے پہلے جذباتی رشتوں میں مجھے کبھی کوئی الجھن اور پریشانی پیش نہیں آئی۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ شاید آنکھیں بھی بھر آئیں۔ اس لئے اس نے کار ایک جانب کھڑی کر دی۔ چند لمحے وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی

تھیں اور وہ اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے دبا رہی تھی۔ یہ غم و اندوہ کو برداشت کرنے کے سلسلے میں مغربی خواتین کا مخصوص انداز ہے۔ اس سے پہلے جب ہم عورتوں کو ہالی ووڈ کی فلموں میں ایسا کرتے ہوئے دیکھتے تو اسے محض اداکاری سمجھتے تھے مگر جب یورپ اور امریکہ گئے تو پتا چلا کہ اصل زندگی میں بھی عورتیں ایسا ہی کرتی ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ ہم کیا کریں؟ اسے تسلی دیں؟ اظہار ہمدردی کریں یا مرغوب کو برا بھلا کہیں؟ پھر یہی مناسب سمجھا کہ خاموش رہیں کیونکہ داناؤں کے بقول ایک چپ ہزار نصیحتوں پر بھاری ہوتی ہے۔ مگر ہمیں یہ احساس بھی تھا کہ اس غریب کی ساری پریشانی ایک پاکستانی اور ایک مسلمان کی بدولت ہے۔ اس لحاظ سے ہم خود اپنے آپ کو بھی مجرم محسوس کر رہے تھے۔

چند لمحے وہ اسی طرح ہونٹ چباتی اور آنکھیں جھپکاتی رہی۔ پھر سامنے رکھے ہوئے ٹشو پیپر سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ پرس میں سے آئینہ نکال کر میک اپ چیک کیا اور مطمئن ہو کر دوبارہ ڈرائیونگ شروع کر دی۔ دس بارہ منٹ بعد جب ہم ہوٹل پہنچے تو وہ قریب قریب نارمل ہو چکی تھی۔

ہم نے اسے کافی پینے کی دعوت دی تو وہ مسکرانے لگی۔ بولی "مجھے کچھ دیر کے لئے اپنے والدین کے پاس بھی جانا ہے اور ہاں رات کا کھانا آج تمہیں ان ہی کے ساتھ کھانا ہے۔"

ہم نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے مگر؟"

کہنے لگی "مگر اگر کی گنجائش نہیں ہے۔ دراصل میرے والدین نے آج تک کوئی پاکستانی فلم ساز نہیں دیکھا ہے۔ جب سے میں نے تمہارے بارے میں بتایا ہے۔ وہ بہت بے تاب ہو گئے ہیں۔ اوکے۔ اب میں چلوں گی۔ سات بجے تمہیں لینے آ جاؤں گی۔"

وہ ہمیں ہوٹل کے باہر ڈراپ کر کے رخصت ہو گئی۔ سات بجنے میں ابھی کافی وقت تھا۔ ہم نے کچھ دیر آس پاس گھومنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک خوبصورت علاقہ تھا۔ نہایت صاف ستھری اور خوبصورت دکانیں' شوروم' دفاتر' چند ریستوران بھی تھے۔ جب کہ پہلے بتا چکے ہیں انگریزی اور فرنچ دونوں کینیڈا کی قومی زبانیں ہیں مگر کیوبیک کے صوبے میں فرنچ کا بہت زور شور ہے۔ اکثر سائن بورڈ فرنچ میں لکھے ہوئے نظر آئے اور ہمیں وہی مشکل پیش آئی جس سے ہم پیرس میں دو چار ہوتے رہتے تھے۔ یعنی یہ کہ کسی جگہ کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہوا کہ یہ ہے کیا؟ محض اندازے سے آپ جان لیں تو اور بات ہے۔ ایک چھوٹی سی گفٹ شاپ کی کھڑکی میں سے ہم چھوٹے چھوٹے آرائشی سامان کو دیکھتے رہے۔ پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے سے دروازے پر لگی ہوئی گھنٹی بجنے لگی اور ایک سائیڈ کے دروازے سے کسی توقف کے بغیر ایک انتہائی خوش رو نازنیں برآمد ہوئیں۔ آتے ہی انہوں نے ایک دلنواز مسکراہٹ ہماری جانب پھینکی اور نہایت میٹھی آواز میں معذرت کرنے لگی "میخ سی موسیو۔"

ہم نے کہا "آپ انگریزی جانتی ہیں؟"

مسکرا کر فرمایا "تھوڑی تھوڑی۔" اس کے ساتھ ہی ہاتھ اٹھا کر شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان انتہائی مہین فاصلہ پیدا کر کے بھی دکھایا۔ اس حساب سے تو وہ شاید یس اور نو کے سوا کچھ نہیں جانتی ہو گی۔ ہم نے ایک سگریٹ لائٹر اٹھا کر پوچھا۔ "ہاؤ مچ۔"

انہوں نے فرنچ میں قیمت بتا دی۔ ہم نے پوچھا کتنے ڈالر؟ جواب میں انہوں نے ایک لمبی سی داستان سنائی جو ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ اس قدر گاڑھی اور گنجان فرنچ سمجھنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ ہم نے مجبور ہو کر چند نوٹ ان کی جانب بڑھائے تو انہوں نے مسکرا کر دس ڈالر کا ایک نوٹ اٹھا لیا اور باقی رقم ہمارے حوالے کر دی۔ پھر مسکرا کر ایک عدد "میخ سی" پھر عرض کر دی۔ ان کی یہ حرکت ہمیں بالکل پسند نہیں آئی۔ اصولی طور پر تو انہیں صاف بتا دینا چاہئے تھا کہ وہ انگریزی سے نابلد ہیں۔ ہمارے ملک میں تو انگریزی نہ جاننے والوں کو جاہل اور ان پڑھ کہتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ انہیں کیا کہیں۔ مگر وہ اس قدر حسین تھیں کہ انہیں برا کہنے کو بھی دل نہیں چاہا۔ انہوں نے ایک خوبصورت ڈیزائن والے کاغذ کے لفافے میں جھٹ پٹ لائٹر لپیٹ کر ہماری نذر کر دیا۔ انگریزی سے ناواقف تھیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ بہت دلکش اور پرکشش خاتون تھیں ہم نے بھی رسمی طور پر جواب میں انہیں میخ سی کہا اور باہر جانے کا قصد کیا۔

یکایک دروازے میں لگی ہوئی گھنٹی بہت زور کی آواز سے بجنے لگی۔ دروازہ کھلا اور

ایک نوجوان اندر داخل ہوا، مگر اس سے پہلے اس کی آواز اندر داخل ہو گئی۔ "ہائی ہنی" اس نے ہاتھ کے اشارے سے ایک بوسہ سیلز گرل کی جانب اچھالا اور بڑی شائستہ انگریزی میں کہنے لگا "بڑی مشکل سے وقت نکال کر آیا ہوں، مگر یاد رکھو رات کی ڈیٹ بالکل پکی ہے۔"

ہم تو سمجھے کہ شاید وہ کسی اور کے دھوکے میں اس دکان کے اندر چلا آیا ہے۔ مگر جب دکان والی حسینہ نے بڑی صفائی کے ساتھ انگریزی میں جواب دیا تو ہم ساکت رہ گئے۔

"ٹھیک ہے تم فکر نہ کرو۔ میں وقت مقررہ پر پہنچ جاؤں گی۔" انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ اس کا لب و لہجہ بھی خالص امریکی تھا۔

نوجوان جتنی تیزی سے اندر داخل ہوا تھا اسی تیزی سے باہر چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے دروازے کے پاس رک کر ایک بوسہ ہوا میں اچھالا اور پکار کر کہا "سی یو ہنی" مطلب یہ کہ پھر ملاقات ہو گی۔

ہنی نے جواب میں آواز لگائی "سی یو"

چند لمحے دکان میں خاموشی طاری رہی۔ پھر ہم "ہنی" کے نزدیک گئے جو چھوٹی سی میز پر بیٹھی کچھ کاغذات الٹ پلٹ کر رہی تھیں۔ ہمیں اپنے نزدیک کھڑے ہوئے دیکھا تو انہوں نے اپنی نشیلی آنکھیں اٹھا کر ہماری طرف دیکھا اور بولیں بہر حال وہ جو کچھ بھی بولیں وہ سب فرنچ میں تھا۔ مفہوم اس کا غالباً یہ تھا کہ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟

ہم نے شکایتاً کہا "سنئے مس! جب ہم آپ سے بات کر رہے تھے تو آپ نے ایک لفظ بھی انگریزی میں نہیں ادا کیا اور ان صاحب کے ساتھ آپ فر فر انگریزی بول رہی تھیں۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو اس کا سبب بتا سکتی ہیں کہ غیر ملکی مہمانوں سے آپ یہ سلوک کیوں کرتی ہیں؟"

وہ بڑی لگاوٹ سے مسکرائیں۔ پھر انگریزی میں کہنے لگیں "میں آپ کو ایک بہترین سبب بتا سکتی ہوں۔ بات یہ ہے کہ پیٹر میرا بوائے فرینڈ ہے اور کوئی اعتراض؟"

ان کے ایک ہی جواب نے ہمارا منہ بند کر دیا۔ ہمیں غصہ تو بہت آیا۔ مگر پھر پیار کی بوالعجبی پر پیار بھی آیا۔ یہ بھی کیا عجیب جذبہ ہے جو شدید نسلی تعصب رکھنے والوں کو بھی ایک دوسرے کے نزدیک کر دیتا ہے۔

بعد میں جب ہم نے میگ سے اس بات کا تذکرہ کیا تو وہ مسکرائی اور بولی "آپ نے درست نوٹ کیا۔ ویسے تو انگریزی اور فرنچ بولنے والوں کے درمیان بہت وسیع فاصلہ ہے مگر پیار محبت کے معاملے میں سارا تعصب دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے۔"

گفٹ شاپ سے باہر نکل کر ہم نے تھوڑی سی ونڈو شاپنگ کی۔ بہت خوب صورتی اور نفاست سے سجی ہوئی دکانیں انواع و اقسام کی اشیا سے بھری ہوئی تھیں۔ بہت سی چیزیں فرانس کی بنی ہوئی تھیں۔ ایک خاص بات جو ہم نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ اس شہر میں فرانس کی تاریخی عمارتوں اور مشہور شخصیات کی یادگاریں بھی دکانوں میں سجی ہوئی تھیں۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ ملک میں نوادرات اور یادگاروں کے طور پر اسی ملک کی چیزیں فروخت کی جاتی ہیں مگر یہ فرانس کے ساتھ کیوبیک اور مانٹریال کے لوگوں کی محبت اور وابستگی کا ایک نمایاں ثبوت تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ فرانس کے لوگوں نے اپنے آبائی وطن سے جذباتی اور ذہنی رشتہ نہیں توڑا تھا۔ اس شہر کی آبادی کی اکثریت بھی فرنچ ہے اس لئے فرانس والوں کی نفاست، نزاکت اور سلیقہ بھی ہر چیز سے نمایاں ہے۔ خوبصورت خواتین، جدید تراش اور وضع کے ملبوسات، خوشبوؤں سے مہکتی ہوئی سڑکیں اور دکانیں، چند دکانوں پر فرانس کے جنگی ہیرو جنرل ڈیگال کی تصویریں بھی آویزاں نظر آئیں۔ ڈیگال کے مجسمے اور ان کے چہرے سے مشابہ بال پن وغیرہ تو اکثر دکانوں میں دستیاب تھے۔ ہمیں یاد آیا کہ جنرل ڈیگال وہ بزرگ ہیں جنہوں نے اپنے زمانہ صدارت میں کیوبیک کا دورہ کیا تو انہیں ہر طرح کی فرنچ امداد کا پوری طرح یقین دلایا اور انہیں کینیڈا سے الگ ہو کر خود مختار ہونے کا بھی مشورہ دیا۔ ان کی اس حرکت پر کینیڈا کی حکومت نے بہت احتجاج بھی کیا تھا۔

سات بجے سے پہلے ہم اپنے ہوٹل واپس پہنچ گئے۔ ہوٹل کے دروازے سے کچھ دور فٹ پاتھ پر ہمیں ایک ادھیڑ عمر خاتون نے "میخ سی موسیو" کہہ کر روک لیا۔ ادھیڑ عمر تو ہم نے محض اٹکل ہی سے کہہ دیا کیونکہ وہ نوجوان یا جوان تو بالکل نہیں تھیں۔ مگر جب ذرا غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ادھیڑ عمر بھی نہیں تھیں۔ مغرب کی عورتوں کا یہ معما

کبھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ یا تو نوجوان ہوتی ہیں یا جوان رہتی ہیں اور پھر ایک دم بوڑھی ہو جاتی ہیں یا یوں کہنا چاہئے کہ بوڑھی نظر آنے لگتی ہیں۔ ادھیڑ عمری سے وہ کبھی دو چار نہیں ہوتیں۔ خدا جانے یہ ان کے میک اپ کا کمال ہے یا ورزشوں وغیرہ کی برکت ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پلاسٹک سرجری وغیرہ سے مدد لی جاتی ہو۔ بہر حال وہ صاحبہ ہمارے سامنے استادہ تھیں۔ بہت خوش رنگ اسکرٹ اور بلاؤز میں ملبوس' بال لہروں کی شکل میں شانوں تک پھیلے ہوئے' چہرے پر معصومانہ دلکشی' بہت اسمارٹ اور چاق و چوبند نظر آ رہی تھی۔

ہم نے انگریزی میں کہا "معاف کیجئے۔ ہم صرف انگریزی جانتے ہیں۔"

وہ مسکرائیں اور انگریزی میں کہنے لگیں "کوئی بات نہیں۔ میں انگریزی بھی بول سکتی ہوں۔"

ہم نے دلچسپی سے انہیں دیکھا "تو پھر بولئے۔"

پوچھنے لگی "آپ اجنبی لگتے ہیں کیا جنوبی امریکہ سے آئے ہیں؟"

ہم نے کہا "جی نہیں' ہم ایشیائی ہیں' پاکستان سے آئے ہیں۔"

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ کیا آپ ٹورسٹ ہیں یا بزنس کے سلسلے میں آئے ہیں؟"

ہم نے کہا "دونوں ہی سمجھ لیجئے۔"

"اوہ۔" مسکرائیں۔ "پھر تو آپ کو یقیناً میری ضرورت ہو گی۔"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا وہ پوچھنے لگیں "آپ پامسٹر اور ستاروں پر یقین رکھتے ہیں؟"

اس اچانک اور غیر متوقع سوال پر ہم حیران رہ گئے۔

"جی نہیں۔ یہ تو بس دل کو بہلانے کی باتیں ہیں۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔" وہ بولیں "اگر کچھ وقت دیں تو میں آپ کو قائل کر سکتی ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے اپنے پرس میں سے اپنا ملاقاتی کارڈ نکال کر ہمارے حوالے کیا۔ کارڈ پر ان کا نام مس فلے چر وغیرہ لکھا ہوا تھا۔ یہ بھی درج تھا کہ وہ پامسٹری اور علم نجوم کی ماہر ہیں۔ ایڈریس بھی درج تھا اور فون نمبر بھی۔ کہنے لگیں "اپنی قسمت کا حال جاننے میں کچھ دلچسپی رکھتے ہیں؟"

ہم نے جواب دیا "ان معاملات کو ہم پوشیدہ ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر آنے والے واقعات بھی پہلے سے معلوم ہو جائیں تو زندگی کتنی بے مزہ اور بے معنی ہو کر رہ جائے۔"

ان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ہمارے کانوں میں میگ کی آواز آئی۔ وہ پارکنگ میں کار کھڑی کرنے کے بعد ہماری جانب بڑھ رہی تھی۔ مس فلے چر کو دیکھ کر اس کی رفتار کچھ کم ہو گئی۔ کہنے لگی "سوری شاید میں مخل ہوئی ہوں؟"

ہم نے کہا "بالکل نہیں۔" اور پھر ان دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف کرا دیا۔

مس فلے چر نے کہا "مطلب یہ ہے کہ آپ اس وقت مصروف ہیں۔ اس لئے اجازت چاہتی ہوں۔ اگر آپ اپنی رائے پر نظر ثانی کریں تو کارڈ پر میرا فون نمبر لکھا ہوا ہے۔ بائی۔" اتنا کہا اور مسکراتی ہوئی چل پڑیں۔

ہم نے میگ کو بتایا کہ یہ ماہر نجوم و دست شناس ہیں۔ ہمارا زائچہ بنانا چاہتی ہیں۔

وہ ہنسنے لگی "زائچہ نہیں' تم کو بے وقوف بنانا چاہتی ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ یہ بھی غیر ملکیوں سے دوستی کرنے کا ایک بہانہ ہے۔"

"ارے نہیں' وہ تو باقاعدہ سند یافتہ ہیں۔ یہ دیکھو؟ ہم نے اسے کارڈ دکھایا۔

وہ کہنے لگی "سند یافتہ ضرور ہیں مگر ان کا دھندا کچھ اور ہے۔ مونٹریال میں ایسی عورتوں سے ذرا ہوشیار رہنا۔ کوئی آپ کو نجومی کے نام پر دن میں ستارے دکھائے گی کوئی قابل دید مقامات دکھانے کے بہانے گائیڈ بننے کی پیش کش کرے گی اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ تم تو جانتے ہو گے۔ اتنے بھولے اور معصوم تو نہیں لگتے۔ مرد بہت چالاک ہوتے ہیں۔"

ہم نے چھیڑنے کے لئے کہا "تم تو بلاوجہ ہی جیلس ہو رہی ہو۔ عورتیں ہر چیز میں مردوں کی بے وفائی اور چالاکی کا پہلو تلاش کر لیتی ہیں۔"

وہ ہنسنے لگی بولی "یہ بحث راستے میں کر لیں گے۔ سات بج رہے ہیں۔ ماما' پاپا ہمارے منتظر ہوں گے۔"

ایک خوب صورت گوری میم' سرخ رنگ کی قیمتی اسپورٹس کار میں آپ کے برابر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہو اور مقام مونٹریال کا حسین شہر ہو تو خواہ مخواہ آس پاس کی ہر چیز دلکش نظر آنے لگتی ہے۔

میگ نے کہا "میں نے انہیں تمہارے بارے میں بتا دیا ہے۔ کافی دلچسپی ہو گئی ہے انہیں۔"

"مگر ہمیں بھی تو ان کے بارے میں کچھ بتاؤ۔"

"اوہ' یہ تو میں بھول ہی گئی۔ میرے پاپا ایک ریٹائرڈ پولیس افسر ہیں' ماما کے ساتھ رہتے ہیں۔ میرا کوئی اور بھائی بہن نہیں ہے۔ ماما' پاپا کے کچھ رشتے دار ہیں جو مونٹریال اور گردو نواح میں رہتے ہیں۔"

ایک پر سکون اور خوشنما رہائشی علاقے میں ایک ٹاؤن ہاؤس میں ان کی رہائش تھی۔ آس پاس کا علاقہ خوب سرسبز اور شاداب تھا۔ گھر کے باہر دو کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ گھنٹی کا بٹن دبانے پر چند لمحے میں دروازہ کھل گیا۔ نگاہوں کے سامنے جو خاتون کھڑی ہوئی تھیں وہ کسی طور پر بھی میگ کی والدہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ کم از کم سگی ماں تو بالکل نہیں تھیں۔ ہمیں تو انہوں نے محض سرسری نظر سے دیکھا مگر میگ کو بہت گرم جوشی سے مخاطب کیا بلکہ گلے لگا کر اس کے رخسار پر بوسہ بھی دیا۔ اس کے بعد ہماری جانب متوجہ ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ہمارے ساتھ وہ سلوک نہیں کر سکتی تھیں جو میگ کے ساتھ کیا تھا۔ مگر ان کینیڈا والوں کا کچھ بھروسہ بھی نہیں ہوتا۔ اس لئے ہم ذرا چوکنا ہو گئے۔

میگ نے ہمارا تعارف کرایا "یہ مسٹر علی آفاقی ہیں' پاکستان سے آئے ہیں اور علی یہ ہماری پڑوسن وینڈی ہیں۔"

وینڈی نے فوراً مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ہم نے کہا "ہم تو خواہ مخواہ سوچ میں پڑ گئے تھے۔"

"وہ کیوں؟"

"حیران تھے کہ تمہاری والدہ اتنی کم عمر اور خوب صورت ہیں۔"

وہ دونوں ہنسنے لگیں۔ وینڈی نے کہا "آپ کی غلط فہمی بھی بجا ہے۔ میگ نے آپ کو بتایا ہو گا کہ یہاں اس کے ماما پاپا رہتے ہیں۔ مجھے دیکھا تو آپ کنفیوز ہو گئے۔"

اندر سے ایک زنانہ آواز سنائی دی "میگ کیا یہ تم ہو ڈارلنگ؟"

"ہاں ماما تم کدھر ہو؟"

اندر کے کمرے سے ایک اسمارٹ سی بڑی بی نمودار ہوئیں۔ پہلے میگ سے ہیلو ہیلو کی پھر ہماری طرف توجہ دی۔ تعارف کا مرحلہ طے ہوا تو انہوں نے ہمیں ڈرائینگ روم میں چلنے کی دعوت دی۔ یہ ایک درمیانہ سائز کمرا تھا جس کے ایک گوشے میں کچن بھی تھا۔ ڈرائنگ روم اور کچن کو تقسیم کرنے کے لئے ایک کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ ہم لوگ صوفوں پر براجمان ہو گئے۔ ماما نے بتایا کہ پاپا نیچے تہ خانے میں کارپینٹری کر رہے ہیں۔ ابھی آجاتے ہیں۔

وینڈی نے رخصت کی اجازت طلب کی اور چلی گئی۔ اچھی شکل و صورت والی لڑکی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میگ نے بتایا کہ وینڈی بھی کچھ عرصے بعد ٹورنٹو جانے والی ہے حالانکہ اس کا فرنچ بوائے فرینڈ مونٹریال میں رہتا ہے اگلے سال ان کا شادی کرنے کا ارادہ تھا مگر فی الحال یہ اسکیم کھٹائی میں پڑ گئی ہے۔

ہم نے تو سبب دریافت کرنا مناسب نہیں سمجھا مگر ماما نے خود ہی ایک سرد آہ بھر کر مزید معلومات بھی فراہم کر دیں۔ کہنے لگیں "خدا سمجھے ان سیاستدانوں کو لوگوں کی خوشیاں برباد کر دیتے ہیں۔"

ہم نے حیران ہو کر ان کی جانب دیکھا۔ سیاست یا سیاست دانوں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا تھا۔ غالباً ہمارے چہرے پر الجھن کا تاثر دیکھ کر انہوں نے اس موضوع پر مزید روشنی ڈالی۔

کہنے لگیں "کتنی پیاری لڑکی ہے وینڈی۔ کیوں ہے کہ نہیں؟"

ہم نے جھجکتے ہوئے کہا "ہاں' ہے تو سہی۔ اچھی خاصی ہے۔"

پر زور لہجے میں بولیں "اچھی خاصی نہیں بہت اچھی ہے۔ صورت شکل فیگر' تعلیم' رکھ رکھاؤ' کس چیز کی کمی ہے اس میں؟"

ہم نے گھبرا کر ان کی ہاں میں ہاں ملانے میں ہی عافیت جانی۔

کہنے لگیں "دو سال سے یہ دونوں ایک ساتھ رہتے ہیں۔ بہت خوش و خرم زندگی ہے۔ ان کی۔ بہت انڈر اسٹینڈنگ ہے دونوں میں۔"

"تو پھر؟"

"تو پھر یہ کہ سیاست بیچ میں آن کودی۔ کیوبک کے حالات تو تمہیں میگ نے بتائے ہوں گے۔ انگریزی نسل کے لوگ کاروبار اور نوکریاں چھوڑ چھاڑ کر اونٹاریو اور دوسرے صوبوں میں جا رہے ہیں۔"

اتنی دیر میں میگ کے پاپا بھی آ گئے۔ وہ ایک شارٹ نیکر (مختصر سا نیکر) اور بنیان نما جرسی پہنے ہوئے تھے۔ اچھے صحت مند اور باوقار آدمی تھے۔ بڑی گرم جوشی سے انہوں نے ہاتھ ملایا۔ پھر معذرت فرمائی کہ وہ نیچے ایک الماری کی مرمت کرنے میں مصروف تھے اس لئے ذرا دیر ہو گئی۔

انہوں نے سر سے پیر تک ہمارا جائزہ لیا اور پھر اپنی بیٹی سے مخاطب ہو کر بولے "تم انہیں فلم والا بتا رہی تھیں۔ یہ تو اچھے خاصے شریف اور معقول آدمی نظر آتے ہیں۔"

ہم نے کہا "کیا فلم والے شریف اور معقول نہیں ہوتے؟"

کہنے لگے "ہوتے ہوں گے۔ تمہیں دیکھ کر تو یہ ماننا ہی پڑتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ بہت زور سے قہقہہ مار کر ہنسے۔ یہ ان کی عادت تھی کہ بات بات پر بہت زور سے قہقہ مارتے تھے اور پھر ایک دم یوں خاموش ہو جاتے تھے جیسے چابی ختم ہو گئی ہو۔ ہم نے غور کیا تو پتا چلا کہ وہ محض گلے سے ہنستے تھے۔ چہرے پر ہنسی کے تاثرات نظر نہیں آتے تھے۔ یہ ہنسی کا ایک انوکھا انداز تھا۔ انہوں نے بڑے خلوص کے ساتھ اپنا تعارف کرایا۔ مسٹر روتھر فیلڈ ان کا اسم شریف تھا۔ خاصے ہنس مکھ آدمی تھے۔ ایک ہنس مکھ اور خوش مزاج پولیس والے کو دیکھ کر ہم تو بہت حیران ہوئے۔ ممکن ہے وہ ریٹائرڈ ہونے کے بعد ایسے ہو گئے ہوں۔ یا شاید مونٹریال میں سبھی پولیس والے ایسے ہوتے ہوں۔ خدا جانے۔ مسٹر روتھر فیلڈ کہنے کو تو پولیس والے تھے مگر بڑے ہنر مند آدمی تھے۔ کوئی ایسا کام نہیں تھا جو انہیں نہ آتا ہو۔ بجلی خراب ہو تو خود ہی ٹھیک کر لیا کرتے تھے۔ کار میں کوئی گڑبڑ ہو جائے تو درست کر لیتے تھے۔ فرنیچر کی مرمت بھی کر لیتے تھے۔ باغبانی تو خیر وہ کرتے ہی تھے۔ گھر میں کوئی ٹوٹ پھوٹ ہو جائے تو باہر سے مستری بلانے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ کھانا بہت اچھا پکا لیتے تھے۔ مکان میں رنگ روغن بھی وہ خود ہی کرتے تھے۔ ایسے سلیقہ مند شوہر کے ہوتے ہوئے ان کی بیگم کی قسمت میں تو عیش ہی عیش لکھا ہوا تھا۔ ہم نے اتنا سگھڑ اور سلیقہ مند شوہر دستیاب ہونے پر میگ کی ماما کو مبارک باد پیش

کی۔ انہوں نے مسکرا کر قبول کر لی مگر ساتھ ہی یہ تبصرہ فرمایا کہ ان کے ہاتھ میں صفائی زیادہ نہیں ہے۔ مگر خیر نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے۔ دیکھا آپ نے : یہ بیگمات اپنے شوہروں سے کبھی مطمئن نہیں ہوتیں۔

مسٹر روتھر فیلڈ ہمارے لئے وہسکی اور شمپین وغیرہ کا بندوبست کئے بیٹھے تھے۔ جب معلوم ہوا کہ ہم اس نعمت سے محروم ہیں تو بہت حیران ہوئے۔ پھر اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر بولے "دیکھا تم نے۔ یہ پاکستانی کتنے مذہبی ہوتے ہیں۔ ہم لوگوں کو ان سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔" پھر انہوں نے "مارگوب" (مرغوب) کا تذکرہ شروع کر دیا۔ کہنے لگے "ہم لوگ تو اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئے ہیں۔ تم ذرا اپنی زبان میں سمجھانے کی کوشش کرو۔ ممکن ہے اس کی سمجھ میں آ جائے۔"

ہم نے کہا "وہ تو شادی کرنے پر آمادہ ہے۔ دراصل اس کے مذہبی ایڈوائزر کو اختلاف ہے۔"

وہ کہنے لگے "یہی تو میں بھی کہتا ہوں۔ شادی وادی کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بلاوجہ کی مصیبت ہے۔ جب شادی ہوتی ہے تو پھر طلاق بھی ہوتی ہے اس کے علاوہ دوسرے جھگڑے بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جائداد کا جھگڑا' قرضوں کی ادائیگی کا جھگڑا' بچوں کی پرورش کا جھگڑا' شادی میں جھگڑوں کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔"

ہم نے کہا "حیرت ہے کہ آپ شادی کے مخالف ہیں۔ مگر آپ نے خود بھی تو شادی کی ہے۔"

بولے "بس غلطیاں انسان ہی سے ہوتی ہیں اور پھر بہت پرانے زمانے کی بات ہے۔ اب تو دنیا بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ تم ذرا اس سے یہ پوچھو کہ شادی کر کے اسے ملے گا کیا؟ بہت اچھی گزر رہی ہے۔ جب تک گزرتی ہے گزارے۔ جب دل بھر جائے اچھے دوستوں کی طرح علیحدہ ہو جائے۔ تم اپنے گھر خوش ہم اپنے گھر خوش۔"

ہم تو میگ کے والدین کے خیالات سن کر حیران رہ گئے۔ ہمارے ہاں بھلا کوئی یہ تصور کب کر سکتا ہے کہ ایک نوجوان لڑکی کے والدین اسے یہ سمجھائیں کہ شادی کے بغیر ہی کسی شخص کے ساتھ رہنے میں فائدہ ہے' چھوڑو شادی وادی کو۔"

میگ نے ہمیں الجھن میں دیکھا تو پوچھا "علی! تم ایمانداری سے سچ سچ بتاؤ کہ اگر تم میرے ماما پاپا کی جگہ ہوتے تو مجھے کیا مشورہ دیتے؟ تمہارے ملک میں ایسے موقعوں پر والدین کا کیا رویہ ہوتا ہے؟"

ہم نے کہا "ہمارے ملک کی بات نہ کریں۔ وہاں کی بات اور ہے۔"

کہنے لگی "پھر بھی پتا تو چلے آخر۔ دیکھو تمہیں قسم ہے میرے سر کی۔ بالکل صاف صاف اور سچی بات کہنا۔ تمہارے ملک میں ایسے معاملات میں والدین کا رویہ کیا ہوتا ہے؟"

ہم نے کہا "ہمارے ملک میں تو والدین یہ گوارا ہی نہیں کر سکتے کہ ان کی بیٹی شادی کے بغیر کسی شخص کے ساتھ رہے۔ اسے بہت بے شرمی اور بے غیرتی کی بات سمجھا جاتا ہے۔ نہ ہمارا مذہب اس بات کی اجازت دیتا ہے نہ معاشرہ۔"

وہ تینوں حیرت زدہ ہو کر ہماری صورت دیکھنے لگے۔ "تو پھر؟"

"تو پھر یہ کہ اگر یہ واقعہ ہمارے ملک میں رونما ہوتا تو اب تک کم از کم دو قتل ہو چکے ہوتے۔"

"دو قتل؟" وہ گھبرا کر بولے "کس کے؟"

ہم نے کہا "لڑکے اور لڑکی کے۔"

چند لمحے تو خاموشی طاری رہی۔ پھر مسٹر روتھر فیلڈ بولے "اوہ مطلب یہ کہ اٹلی والوں کی طرح تمہارے ملک کے لوگ بھی اس معاملے میں بہت قدامت پسند ہیں۔"

"بہت زیادہ۔ اٹلی والے تو ہمارے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں اس معاملے میں۔"

"تھینکس گاڈ کہ تم پاکستان میں نہیں ہو۔" مسٹر روتھر نے آہ بھر کر اپنی بیٹی سے کہا۔

میگ نے اتنی دیر میں کافی بنائی۔ کچھ کوکیز (بسکٹ) اور پنیر ساتھ میں لا کر ہمارے سامنے رکھ دیا۔ میگ کی شادی کا مسئلہ قریباً ختم ہو گیا تو دوسرے مسائل پر تبادلہ خیالات شروع ہوا۔ کیوبیک کی حکومت کی پالیسیوں کے بارے میں تبصرہ کیا گیا۔ مسٹر روتھر نے کافی خیال افروز گفتگو کی۔ ان کا خیال تھا کہ انگریزی بولنے والوں کا تو کچھ نہیں بگڑے گا مگر کیوبیک والوں کو بہت نقصان ہو گا۔ بہت سے کارخانے بند ہو جائیں گے۔ کاروباری

لوگ یہاں سے رخصت ہو جائیں گے اور باہر کا سرمایہ نہیں آئے گا۔

ہم نے کہا "مسٹر روتھر! آخر آپ لوگ فرنچ کیوں نہیں بولتے اور اس کے استعمال پر ناراض کیوں ہوتے ہیں؟"

کہنے لگے "ہم سب فرنچ بولتے ہیں مگر وہ لوگ انگریزی بولنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ بہت متعصب قوم ہے یہ فرنچ۔"

ان کی بیوی نے تبصرہ کیا "آج کے زمانے میں ایسی ذہنیت 'توبہ توبہ۔'"

جب میگ کافی کے برتن لے کر کچن میں گئی تو مسٹر روتھر فیلڈ نے ہمارے کان کے پاس اپنا چہرہ لا کر سرگوشی میں کہا "میں سمجھتا ہوں کہ یہ ٹورنٹو جا کر رہے گی تو بہت ممکن ہے کہ وہاں کسی اور سے دوستی ہو جائے۔ کم سے کم مارگوب سے تو نجات ملے گی۔"

ان کی بیوی نے کہا "مارگوب سے تمہیں کیا شکایت ہے۔ شادی کے لئے تو تمہاری بیٹی مری جا رہی ہے۔ وہ تو شادی کرنے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہے۔"

"ابھی نا تجربے کار ہے۔ دو چار شادیاں کرنے کے بعد خود ہی سمجھ جائے گی۔"

خود اپنی بیٹی کے بارے میں والدین کی یہ گفتگو سن کر ہم حیران ہو رہے تھے۔

میگ باورچی خانے سے آئی تو کچھ دیر تک مقامی سیاست کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ مسٹر روتھر فیلڈ خود بھی تنگ آئے ہوئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ عنقریب وہ بھی ٹورنٹو یا اوٹاوہ چلے جائیں گے۔ کیونکہ مونٹریال میں رہنا ممکن نہیں رہا۔ پاکستان کے بارے میں بات چیت شروع ہوئی تو مسٹر روتھر نے پولیس کے بارے میں کچھ سوالات کئے۔ وہ ہماری پولیس کے طریقہ کار اور کارکردگی کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ ہم انہیں کیا بتاتے؟ ہم نے وہاں کی پولیس کو جو کام کرتے ہوئے دیکھا تھا ہمارے ہاں پولیس والے اسے اپنے فرائض میں داخل ہی نہیں سمجھتے۔ وہ ہم سے پوچھتے رہے کہ آپ کے ملک میں جرائم کی شرح کیا ہے اور تفتیش کے لئے کون سے جدید ذرائع اور آلات استعمال کئے جاتے ہیں؟

ہم نے کہا "ہماری پولیس کے پاس بہترین طریقہ "ڈرائنگ روم میتھڈ" اور "چھتر" کا ہے۔"

وہ بہت حیران ہوئے۔ پوچھا "یہ کیا ہوتا ہے؟ میں نے تو کبھی ان کا نام تک نہیں سنا۔"

ہم نے کہا "یہ دراصل خالص پاکستانی ایجادیں ہیں اور انتہائی موثر بھی ہیں۔" پھر ہم نے انہیں بتایا کہ ہماری پولیس کو تو جرم سرزد ہونے سے پہلے ہی اس کا پتا چل جاتا ہے اور وہ مجرموں کے بارے میں بھی معلومات حاصل کر لیتی ہے۔ ان کی حیرانی مزید بڑھ گئی۔ پوچھنے لگے "وہ کیسے؟"

ہم نے کہا "ان کے اپنے مخصوص طریقے ہیں۔" وہ خاصے مرعوب نظر آنے لگے۔ ہم نے انہیں جان بوجھ کر یہ نہیں بتایا کہ ہمارے ہاں تو عام حالات میں پولیس کو اعتماد میں لئے بغیر جرم ہی سرزد نہیں ہوتا مگر ہم نے اتنا ضرور کہا کہ ہمارے ہاں پولیس کو مجرموں کا اعتماد حاصل ہے۔

"اچھا یہ تو بہت عجیب سی بات ہے۔ یعنی آپ کی پولیس پر عوام تو کیا مجرموں تک کو مکمل اعتماد ہے؟"

ہم نے کہا "جی ہاں، بس یہی سمجھ لیجئے۔"

بولے "پھر تو وہاں جرائم کی شرح برائے نام ہو گی۔ میں حیران ہوں کہ دوسرے ملکوں سے پولیس والے تربیت حاصل کرنے کے لئے آپ کے ملک میں کیوں نہیں بھیجے جاتے۔ یہ بتائیے کہ اس اعتماد اور بہترین کارکردگی کا سبب کیا ہے آخر؟"

ہم نے کہا "مک مکا۔"

وہ تعجب سے ہمارا منہ دیکھنے لگے۔ "موک موکا؟"

انہوں نے دہرایا "حیرت انگیز! مگر یہ کون سا سسٹم ہے؟"

ہم نے کہا "یہ بھی ہماری پولیس کا مخصوص سسٹم ہے بلکہ ان کی کارگزاری کی بنیاد اس مک مکا کو سمجھ لیجئے۔"

مسٹر روتھر کہنے لگے "آپ نے تو مجھے حیرت زدہ کر دیا ہے۔ میں ساری زندگی پولیس میں رہا ہوں اور مجھے اس بارے میں تحقیق کرنے کا بہت شوق ہے۔ میں اپنے تجربات اور تحقیقات پر مبنی ایک کتاب بھی لکھنا چاہتا ہوں۔ اگر موقع ملا تو میں پاکستان آ کر ضرور آپ کی پولیس کی کارکردگی کا مطالعہ کروں گا۔"

ہم نے سوچا' جب یہ آئیں گے تب دیکھا جائے گا

فی الحال تو ایسا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس لئے کیوں نہ انہیں مرعوب اور متاثر کرنے کی کوشش کی جائے۔ مسٹر روتھر نے اپنی نوٹ بک میں یہ تینوں باتیں نوٹ کرلیں۔ یعنی ڈرائنگ روم میتھڈ۔ چھترا اور مک مکا۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ آخر پولیس کو مجرموں کا اعتماد کیوں کر حاصل ہے اور وہ کون سی ترکیب ہے جس کی مدد سے جرم سرزد ہونے سے پہلے پولیس کو اس کا علم ہو جاتا ہے۔

"فنٹاسٹک' فنٹاسٹک۔" انہوں نے تاسف بھرے لہجے میں کہا "کاش مجھے پاکستان کی پولیس فورس میں کام کرنے کا موقع مل جاتا۔"

رات کے نو ساڑھے نو بجے کے قریب ہم واپس لوٹے۔ میگ ہمیں رخصت کرنے کے لئے ہوٹل کی لابی تک آئی۔ ہم نے کن انکھیوں سے دیکھا تو استقبالیہ میں صبح والی خاتون موجود نہیں تھیں۔ اس وقت ایک درمیانہ عمر کے اسمارٹ سے صاحب کی ڈیوٹی تھی۔ انہوں نے ہم دونوں کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ دوسرے دن صبح کا پروگرام طے کرنے کے بعد میگ نے اجازت چاہی۔ ہم نے تجویز پیش کی کہ کیوں نہ ہم کل شام واپس ٹورنٹو روانہ ہو جائیں۔ دراصل مونٹریال میں ہمیں کوئی خاص کام بھی نہیں تھا۔ شہر کو ہم نے سرسری طور پر دیکھ لیا تھا فلم کے آغاز سے پہلے گردونواح کے علاقے کو دیکھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی بلکہ وقت کا زیاں ہی تھا کیونکہ ابھی تک نہ تو فلم ساز کمپنی کا قیام عمل میں آیا تھا' نہ فلم کے موضوع کا انتخاب ہوا تھا' نہ کہانی لکھی گئی تھی۔ ان حالات میں بلاوجہ گھوم پھر کر وقت ضائع کرنا اس محاورے کے مطابق تھا کہ سوت نہ کپاس' جولاہے سے لٹھم لٹھا۔ سچ پوچھئے تو ہم سرے سے دورہ مونٹریال کے حق میں نہیں تھے' مگر شوکت صاحب کا بھرم رکھنے کے لئے شرما شرمی میں تیار ہو گئے تھے۔

ہم نے میگ کو کافی کی پیش کش کی مگر اسے دراصل ماگوب سے ملاقات کی جلدی تھی اس لئے "بائی بائی" کہہ کر رخصت ہو گئی۔ ہم نے بھی روکنے کی کوشش نہیں کی۔

ابھی وقت زیادہ نہیں ہوا تھا اور ہمیں اس شہر کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ پھر زبان کی پرابلم بھی تھی۔ اس لئے ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ تھوڑا بہت وقت ہوٹل ہی میں گھوم پھر کر گزار دیا جائے۔ لاؤنج سے مختلف گیلریوں سے مختلف جگہوں کو راستے جاتے تھے۔ مثلاً سوئمنگ پول' کافی شاپ' برازری' سوانا باتھ' آرائش گیسو وغیرہ وغیرہ۔ سب سے پہلے تو ہم سوئمنگ پول پر گئے۔ موسم ان دنوں خوشگوار تھا مگر مونٹریال والوں

کے لئے تو موسم گرما ہی تھا۔ سوئمنگ پول زیادہ بڑا نہیں تھا مگر دل کی شکل میں بہت خوب صورت اور صاف شفاف نظر آ رہا تھا۔ چاروں طرف روشنیاں لگی ہوئی تھیں۔ تین اطراف میں بیٹھنے اور ٹہلنے کے لئے کرسیاں بچھی ہوئی تھی۔ چوتھی جانب ڈرنکس کا کاؤنٹر تھا۔ اس وقت سوئمنگ پول پر زیادہ رش نہیں تھا۔ مشکل سے دس بارہ افراد موجود تھے جن میں عورتوں اور مردوں کی تعداد یکساں تھی۔ شاید وہ جوڑوں کی شکل میں تھے۔ چند خواتین پانی میں اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ مرد بیر کے مگ سامنے رکھے تاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ بار گرل ایک اسمارٹ اور خوب صورت لڑکی تھی۔ اس نے جو لباس پہنا ہوا تھا' جسم کے نچلے حصے میں ایک ذرا لمبا سا جانگیا تھا اور بالائی حصہ انہوں نے ایک بنیان نما لباس سے ڈھانپ رکھا تھا مگر ڈھانپنے کا انداز شاعر کے الفاظ میں یہ تھا کہ

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

سوئمنگ پول پر جو لوگ موجود تھے غالباً ان میں سے کوئی بھی تنہا نہیں تھا۔ اور اگر تھا تو وہ سوئمنگ کے لباس میں تھا۔ ہم ایک تو اکیلے تھے' دوسرے مکمل لباس پہنے ہوئے تھے۔ اس لئے اس محفل میں عجیب سے لگ رہے تھے۔ ابھی ہم واپس جانے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ برابر سے ایک نسوانی آواز نے ہمیں مخاطب کیا "میخ سی موسیو" سر گھما کر دیکھا تو بار گرل ہی کے لباس میں ملبوس ایک خاصی خوش شکل لڑکی گلے میں ایک چھوٹی سی ٹرے لٹکائے ہوئے کھڑی تھی جس میں سگار تمباکو' چاکلیٹ قسم کی چیزیں رکھی تھی۔

ہم نے فوراً انہیں مطلع کیا کہ ہم فرنچ نہیں جانتے۔ انہوں نے دلکش مسکراہٹ سے جواب دیا "آئی اسپیک انگلیز۔ یو اسپیک۔ "شاید مطلب یہ تھا کہ میں انگریزی جانتی ہوں۔ آپ بے فکر ہو کر مجھ سے انگریزی میں بات کر سکتے ہیں۔ ہم کیا بات کرتے۔ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ وہ بولیں "یو سوئیم!" پھر ہمارا جواب سننے سے پہلے کہنے لگیں "کوم وزی۔ کوستیوم آئی تیک یو۔"

ہمیں ایسی فرنچ سمجھنے کا تجربہ ہو چکا تھا اس لئے ان کا مطلب جاننے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ اگر سوئمنگ کرنا چاہتے ہیں تو میرے ساتھ آیئے۔ میں آپ کو غسل کا لباس فراہم کردوں گی۔

ہم نے کہا "میخ سی۔ نو سوئمنگ۔"

پوچھنے لگیں "ڈرنکس؟"

وہ اس قدر خلوص اور محبت سے دریافت کر رہی تھیں کہ ہم نے ان کا دل رکھنا مناسب سمجھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

بولیں "یو کوموزی موسیو۔" اور اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے بار کاؤنٹر کی جانب چل پڑیں جہاں ان ہی کی طرح کی دوسری خاتون مستعد کھڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے مختصراً انہیں ہمارے بارے میں کچھ بتایا تو وہ سراپا میزبان بن گئیں۔

پوچھنے لگیں "آپ کیا پینا پسند کریں گے؟" یہ کہہ کر انہوں نے مختلف مشروبات کے نام بتانے شروع کر دیے۔ یہاں تک کہ فہرست تمام ہو گئی مگر ہم خاموش کھڑے رہے۔ ان دونوں نے حیران ہو کر ایک دوسری کی جانب دیکھا پھر ہمارا منہ دیکھنے لگیں۔ ان کی توجہ اور مہربانی کے پیش نظر ہمیں بالکل صاف جواب دیتے ہوئے بھی شرمندگی سی ہو رہی تھی۔

ہم نے ان سے پوچھا "آپ کے پاس کوک ہو گا؟"

اگر ہم انہیں پستول سے گولی مار دیتے تو شاید انہیں اتنا زبردست شاک نہ لگتا جتنا یہ بات سن کر لگا۔ پہلے تو شاید انہیں اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں آیا۔ پھر بار گرل نے تصدیق طلب انداز میں ہماری طرف جھک کر پوچھا "آپ کا مطلب ہے کوکا کولا؟"

ہم نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

انہوں نے معذرت بھرے انداز میں بتایا کہ ان کے پاس کوکا کولا نہیں ہے۔

ہم نے کہا "کوئی بھی سافٹ ڈرنک مل سکتا ہے"

دونوں نے پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک خاتون نے ہم سے نیم انگریزی اور نیم فرنچ میں کہا "یو نو سوئیم۔ یو نو ڈرنک اوکے؟"

ہم نے کہا "اوکے۔"

"یو وانٹ سوفٹ ڈرنک اوکے؟"

ہم نے پھر کہا "اوکے۔"

وہ مسکرائیں اور نہایت مشفقانہ لہجے میں بولیں "موسیو۔ یو گو تو یور روم۔ ٹاک تو

روم سروز۔ اوکے؟"

جی میں تو آئی کہ کہہ دیں کہ تم سے ہم نے فرمائش کب کی تھی جو ہمیں کوکا کولا حاصل کرنے کی ترکیبیں بتا رہی ہو، مگر پھر ارادہ بدل دیا اور "مینغ سی" کہہ کر وہاں سے چلے آئے۔ وہ دونوں حیران نظروں سے ہمیں دیکھتی رہیں۔ سوئمنگ پول کے دروازے پر پہنچ کر ہم نے پلٹ کر دیکھا تو وہ بدستور حیرت سے آنکھیں پھاڑے ہمیں تک رہی تھیں۔ ہم نے ہاتھ ہلا کر انہیں خدا حافظ کہا تو انہوں نے بھی ہاتھ ہلا دیا۔ مگر ہمیں یقین ہے کہ انہوں نے اپنے جاننے والوں کو ایک عجیب و غریب "مہمان" کا واقعہ ضرور سنایا ہو گا اور خود بھی غالباً تمام عمر یہ انوکھا تجربہ انہیں یاد رہے گا۔ اس تلخ تجربے کے بعد ہم نے مناسب سمجھا کہ بک شاپ میں جا کر کوئی کتاب یا میگزین تلاش کریں اور کچھ نہیں تو سگار ہی خرید لیں۔ اس طرح کچھ نہ کرتے ہوئے ہمیں خود اپنے آپ سے شرم محسوس ہو رہی تھی۔

گیلری سے گزرے تو ایک جانب سائن بورڈ پر "سوانا باتھ" کی طرف جانے کا اشارہ نظر آیا۔ انگریزی میں فرنچ میں یہ معلومات فراہم کی گئی تھیں کہ بھاپ کے غسل کے علاوہ مساج بھی کیا جاتا ہے۔ آپ خود کو نیا انسان محسوس کرنا چاہتے ہیں تو ہماری خدمات ضرور حاصل کریں۔ ہمیں کیونکہ نیا آدمی بننے کا شوق نہیں تھا اس لئے اس اشارے کو نظرانداز کر کے گزر گئے۔

بک شاپ ایک گوشے میں واقع تھی اور اس میں جو سیلز گرل تشریف فرما نظر آئی اسے دیکھ کر ہمارے دل کی حرکت چند ساعت کے لئے تھم کر رہ گئی۔ اتنی حسین اور دل کش لڑکی ہم نے سارے مونٹریال میں نہیں دیکھی تھی۔ صورت شکل، جسم، انداز و اطوار ہر لحاظ سے اتنی مکمل کہ اگر مس کیوبیک کے مقابلے میں حصہ لے تو یقیناً کامیاب ہو جائے۔ وہ سرخ اور نیلے رنگ کے لباس میں اور زیادہ شوخ اور چمکدار نظر آ رہی تھی۔ سرخ رنگ کے بالوں پر پڑنے والی روشنی سے آتش دان میں سلگتی ہوئی آگ جیسا تاثر پیدا ہو رہا تھا۔ ہم تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ ہمارے دوست مشہور شاعر تنویر نقوی مرحوم انتہائی رومان پسند اور حسن پرست انسان تھے۔ عاشق مزاج ایسے کہ راہ چلتی حسیناؤں پر فی الفور عاشق ہو جاتے تھے۔ ان کی ایک خاص عادت یہ تھی کہ جہاں کوئی خوب صورت

چہرہ نظر آتا، ان کے منہ سے بے ساختہ "سبحان اللہ" نکلا اور ان کی گردن حسینہ کی جانب مڑنی شروع ہو گئی۔ انہیں یہ بھی ہوش نہیں رہتا تھا کہ وہ کار ڈرائیو کر رہے ہیں۔ وہ تو شکر ہے کہ اس زمانے میں ٹریفک بہت کم ہوا کرتا تھا ورنہ ہر روز حادثہ پیش آتا۔ تنویر صاحب صحیح معنوں میں شاعر مزاج بلکہ خالص شاعر آدمی تھے، بلکہ آدمی تو خواہ مخواہ کا اضافہ ہے صرف شاعر کہنا ہی کافی ہو گا۔ ہم جب پہلی بار یورپ گئے اور وہاں ہر طرف خوب صورت چہروں اور شاداب جسموں کی بہتات دیکھی تو ہمیں تنویر نقوی صاحب بہت یاد آئے۔ افسوس کہ انہیں کبھی یورپ اور امریکہ جانے کا موقع نہیں ملا ورنہ خدا جانے ان کا کیا حال ہوتا۔ مگر کافی عرصے تک یہ کیفیت رہی کہ جب بھی کوئی اچھی شکل نظر آتی ہمیں تنویر صاحب یاد آتے۔ وہ اگر اس وقت ہمارے ساتھ ہوتے تو "سبحان اللہ" کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ سچ تو یہ ہے کہ خوب صورتی قدرت نے ایسی چیز بنائی ہے جو پتھروں تک سے خراج حاصل کر لیتی ہے پھر ہم تو گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان ہیں۔ بک شاپ میں اس وقت چند اور لوگ بھی موجود تھے۔ ایک موٹے اور گنجے سے صاحب بہادر تھے۔ ان کی انتہائی پرکشش بیوی ہمراہ تھیں۔ میاں اور بیوی کی عمروں میں نمایاں فرق نظر آتا تھا۔ شوہر صاحب بڑے فدویانہ انداز میں بیوی کی فرمائشیں پوری کرنے میں مصروف تھے۔ ان کی بیگم دو درجن کے قریب کتابیں، چھ سات میگزین اور چاکلیٹ کے دس بارہ پیکٹ خرید چکی تھیں۔ چاکلیٹ وہ مسلسل اور مستقل طور پر کھا رہی تھیں۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے انہوں نے تین چار پیکٹ ختم کر دیے اور ان کی کمی پوری کرنے کے لئے مزید چھ سات پیکٹ خرید کر اپنے شوہر کے ہاتھ میں تھما دیے جو بار برداری کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ ایک انتہائی ضعیف العمر بڑی بی بھی موجود تھیں مگر ان کے سنگھار میں کوئی کمی نہیں تھی۔ لباس سے لے کر جوتے، ہیٹ اور ہاتھ کے پرس تک انہوں نے ہر چیز کو میچ کیا تھا بلکہ ان کے چہرے کا میک اپ بھی ہلکے گلابی رنگ ہی کا تھا۔ انتہائی شوخ اور بھڑک دار لباس میں وہ عجیب سی لگ رہی تھی۔ انہوں نے کاؤنٹر پر سے دو ایسے میگزین اٹھا لئے تھے جن کی درآمد ہمارے ملک میں ممنوع ہے اور دو ایسی خود نوشت آپ بیتیوں کے بارے میں دریافت کر رہی تھیں جو اپنی بے باکی اور عریاں بیانی کے لحاظ سے دنیا بھر میں شہرت حاصل کر چکی تھیں۔ ایک دس بارہ انچ لمبے

سگریٹ ہولڈر میں سگریٹ پھنسا کر وہ کش بھی لگاتی جا رہی تھیں۔ ہم بھی خاموشی سے کتابیں دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ جب فدوی شوہر اور شوخ و شنگ بڑی بی دکان سے رخصت ہو گئے تو ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ ان تین ہستیوں کی وجہ سے دکان میں ایسا ہنگامہ برپا تھا جیسے درجنوں لوگ گھس آئے ہوں۔ ان کے جانے کے بعد نہ صرف دکان میں سکون چھا گیا تھا بلکہ خوب صورت سیلز گرل کو بھی اطمینان نصیب ہو گیا تھا اور وہ اب ہماری جانب توجہ دینے کے قابل ہو گئی تھیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم وقت گزاری کے خیال سے کون سی کتاب خریدیں جو ہلکی پھلکی ہو اور زیادہ مہنگی بھی نہ ہو۔ ہم زیادہ ضخیم اور زیادہ سنجیدہ کتاب بھی نہیں خریدنا چاہتے تھے۔ بہرحال جب ہمیں کتابوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے کافی دیر ہو گئی تو وہ سراپا خوشبو خود بخود ہمارے پاس چلی آئیں اور انگریزی میں پوچھنے لگیں "معاف کیجئے۔ کیا میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتی ہوں؟"

ہمیں ایسی حسین لڑکی سے اس قدر فرض شناسی اور خوش اخلاقی کی توقع نہیں تھی۔ اپنے ملک میں ہمارا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ کوئی صاحبہ جتنی زیادہ حسین و جمیل ہوتی ہیں اتنی ہی زیادہ مغرور اور بد اخلاق بھی ہوتی ہیں اور ان سے کسی قابلیت کی امید بھی نہیں رکھنی چاہئے۔ یہاں تو معمولی سا سیلز مین بھی بڑے سے بڑے گاہک کو دیکھ کر اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا۔ شوکیس پر دونوں ٹانگیں رکھے نیم دراز رہتا ہے۔ لہٰذا جب اس پیکر جمال نے بذات خود ہمیں مخاطب کیا اور اپنی خدمات کی پیش کش بھی کر دی تو ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ کچھ دیر تو ہم چپ رہے کہ آخر رعب حسن بھی ایک چیز ہوتی ہے۔ پھر ہم نے انہیں اپنی پرابلم بتائی کہ کس قسم کی ہلکی پھلکی کتاب کی ہمیں تلاش ہے۔ وہ مسکرائیں اور سامنے کی الماری میں سے ایک اسمارٹ سی کتاب اٹھا کر لے آئیں۔ یہ جیمز ہیڈلے چیز کی تحریر کردہ ایک ناول تھی۔ جیمز ہیڈلے چیز ہمارا پسندیدہ مصنف ہے۔ اگر آپ کے پاس تھوڑا وقت ہو اور آپ ذہن پر زور ڈالے بغیر کچھ دیر دلچسپ مطالعہ کرنے کے خواہش مند ہوں تو پھر اس مقصد کے لئے جیمز ہیڈلے چیز سے بہتر کوئی اور مصنف نہیں ہے۔ ہم نے خاتون کی سمجھ داری کی داد دی اور کتاب خرید لی۔ وہاں سے رخصت ہونے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر کوئی معقول عذر بھی موجود نہ تھا اس لئے

واپسی کے لئے دروازے کی جانب پلٹے۔

یکایک انہوں نے ہم سے مخاطب ہو کر پوچھا "سنئے' کیا آپ برصغیر پاک و ہند کے رہنے والے ہیں؟"

ہم نے حیران ہو کر کہا "جی ہاں' مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

مسکرا کر بولیں "میں ستاروں کا علم جانتی ہوں۔ چہرہ دیکھ کر سب کچھ بتا سکتی ہوں۔"

ہم نے کہا "چھوڑیے' مذاق نہ کیجئے۔ ان ملکوں میں تو لوگ اپنے علاوہ کسی دوسرے ملک کو نہیں جانتے' مگر آپ نے تو شناخت بھی کر لیا۔"

کہنے لگیں "دراصل تاریخ میرا مضمون رہا ہے۔ علوم عامہ سے بھی دلچسپی ہے۔ اخبارات اور ٹائم میگزین بھی باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ برصغیر کے لوگ دوسرے ایشیائی لوگوں کے مقابلے میں علیحدہ پہچانے جاتے ہیں۔ اچھا یہ بتائیے آپ انڈیا سے تعلق رکھتے ہیں یا پاکستان سے؟"

ہم نے جواب دیا "پاکستان سے۔"

بولیں "پھر تو شاید آپ مسلمان ہوں گے۔"

ہم نے کہا "شاید نہیں' سو فیصد۔"

کہنے لگیں "ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب ایک بات اور بتا دیجئے۔ اگر ناگوار نہ ہو تو۔"

ہم نے کہا "شوق سے پوچھئے۔"

بولیں "آپ پاکستان کے لوگ اسرائیل اور یہودیوں کے اتنے دشمن کیوں ہیں؟ میں نے دیکھا ہے کہ اتنی دشمنی تو عربوں اور فلسطینیوں کو بھی اسرائیل اور یہودیوں سے نہیں ہے جتنی کہ پاکستانیوں کو ہے۔ آپ کے ملک میں حکومت خواہ کسی کی بھی ہو اس بارے میں سب کی پالیسی ایک ہی رہتی ہے آخر یہودیوں نے آپ پاکستانیوں کا کیا بگاڑا ہے؟"

یورپ اور امریکا میں کئی بار ہم سے یہ سوال پوچھا گیا اور ہم نے یہی جواب دیا کہ پاکستانیوں کو یہودیوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے لیکن اسرائیل کا ملک کیونکہ زبردستی عربوں

کے علاقوں پر قبضہ کر کے بنایا گیا ہے اور مسلمانوں کے مقدس مقامات پر اسرائیل نے تسلط جما لیا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس دھاندلی اور ناانصافی کو کیسے برداشت کیا جا سکتا ہے۔ یہی جواب ہم نے ان خاتون کو بھی دے دیا۔

کہنے لگیں ”اس مسئلے پر آپ سب پاکستانی بہت جذباتی ہوتے ہیں۔ یہ میرا تجربہ ہے۔ بہرحال یہ سیاسی گفتگو کرنے کا وقت ہے نہ موقع۔ اس لئے اس کا ختم کرنا ہی بہتر ہے۔“

ہم نے سوال کیا ”اگر اعتراض نہ ہو تو کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ آپ کہیں یہودی تو نہیں ہیں؟“

وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ فرمایا ”خوب پہچانا آپ نے۔ مگر ہماری تو آپس میں کوئی لڑائی نہیں ہے نا؟“

ہم نے کہا ”بالکل نہیں ہے۔“

کہنے لگیں ”تو پھر یہ ثابت کرنے کے لئے آپ کو میرے ساتھ کافی پینی ہوگی۔ دیر نہیں لگے گی۔ یہاں ہر وقت تیار رہتی ہے۔“

ہمارے اقرار پر وہ اٹھ کر برابر والے کمرے میں گئیں اور کافی کے دو مگ بنا کر لے آئیں۔ اس اثنا میں ایک دو اور خریدار بھی دکان میں آ گئے تھے۔ انہوں نے مگ اپنی چھوٹی سی میز پر رکھ دیا اور ان کی خدمت کے لئے پہنچ گئیں۔ ہم نے نوٹ کیا کہ وہ جتنی حسین تھیں' اتنی ہی ذہین بھی تھیں اور باخبر بھی۔ چند منٹ بعد وہ ان سے فراغت پا کر آئیں اور معذرت پیش کرنے کے بعد اپنی کافی نوش کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

ہمارے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ مونٹریال ہی میں پیدا ہوئی تھیں۔ ماں باپ کا تعلق انگلستان سے ہے۔ لٹریچر اور تاریخ میں ایم اے کر چکی ہیں اور یہ دکان ان کے ڈیڈی کی ہے۔

ہم نے کہا ”ہم یہ تو جان گئے تھے کہ آپ پڑھی لکھی ہیں مگر اتنا زیادہ تعلیم یافتہ ہیں اس کا ہمیں اندازہ نہیں تھا۔ ویسے دیکھنے میں آپ بہت کم عمر نظر آتی ہیں۔“

انہوں نے ہنسنا شروع کر دیا تو چہرہ شفق گوں ہو گیا۔ کہنے لگیں ”میرا اس میں کوئی کمال نہیں ہے۔ یہ خوبی مجھے اپنے والد سے ملی ہے۔ آپ انہیں دیکھیں تو یہی سمجھیں گے کہ میرے جڑواں بھائی ہیں۔“

ہم نے ذرا جھجکتے ہوئے ایک ذاتی سوال دریافت کرنے کی اجازت چاہی اور پوچھا ”کیا آپ کی شادی ہو گئی ہے؟“

بہت زور سے ہنسیں اور کہنے لگیں ”ابھی تک تو شادی کرنے کی فرصت ہی نہیں مل سکی۔ اب ارادہ ہے۔ تل ابیب میں میرا بوائے فرینڈ رہتا ہے۔ سیکورٹی فورس میں ہے۔ شادی کے بعد میں بھی وہیں رہوں گی۔“

ہمارے دل میں اچانک کراہیت سی پیدا ہو گئی۔ غالباً اس نے بھی ہمارے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا۔ کہنے لگی ”دیکھا' میں نہ کہتی تھی کہ آپ پاکستانیوں کو اسرائیل اور یہودیوں سے دشمنی ہے۔ آپ کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا ہے۔“

ہم نے سوچا' ان کی میٹھی باتوں سے دل بہلانے کی کیا ضرورت ہے۔ کیوں نہ صاف صاف کھری کھری سنا دیں۔ ہم نے کہا ”دیکھئے مس ایک تو اسرائیل نے عربوں کی زمینوں پر قبضہ کر رکھا ہے اور دوسرے ان کو ظلم و ستم کا شکار بھی بناتے رہتے ہیں۔ اسرائیلی فوجیں لبنان اور دوسرے عرب علاقوں پر بم برساتی رہتی ہیں اور نہتے لوگوں پر حملے کرتی رہتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں سے ہمیں محبت کیسے ہو سکتی ہے؟“

کہنے لگیں ”مگر عربوں سے آپ پاکستانیوں کا کیا رشتہ ہے؟“

ہم نے کہا ”وہی جو روس' جرمنی' امریکہ اور کینیڈا کے یہودیوں کا اسرائیل سے ہے۔ آخر دنیا بھر کے یہودی اسرائیل کو ہر قسم کی امداد کیوں دیتے رہتے ہیں؟“

وہ کچھ لاجواب سی ہو گئیں۔ پھر کہنے لگیں ”آپ یہ کیوں بھولتے ہیں کہ ان علاقوں پر کسی زمانے میں اسرائیل کی حکومت تھی۔“

ہم نے کہا ”آپ تو تاریخ کی طالبہ ہیں اس لئے جانتی ہوں گی کہ یہ درست نہیں ہے۔ محض پروپیگنڈہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہودیوں کی یہ منطق تسلیم کر لی جائے تو دنیا کے بہت سے ملکوں پر کسی زمانے میں دوسری اقوام کا قبضہ تھا۔ تو کیا ان سب کو یہ حق حاصل ہے کہ دوبارہ ان علاقوں پر جبری قبضہ کر لیں؟“

وہ کہنے لگیں ”آپ کچھ زیادہ ہی جذباتی معلوم ہوتے ہیں۔“

ہم نے کہا ”ہمارا بھی آپ کے بارے میں یہی خیال ہے۔“

اتنی دیر میں چند اور لوگ دکان کے اندر داخل ہوئے۔ یوں بھی ماحول بدمزہ اور کشیدہ ہو گیا تھا اس لئے ہم نے رخصت ہونا ہی بہتر جانا۔ "گڈ نائٹ" کہہ کر ہم باہر جانے لگے تو انہوں نے ہمیں پکارا اور بولیں "آپ یہ کتاب یہیں چھوڑے جا رہے ہیں۔"

ہم نے کہا "شکریہ آپ کے ساتھ باتوں میں کافی اچھا وقت گزر گیا ہے۔ اب سونے کا وقت ہے۔"

ہم بک شاپ سے باہر نکلے تو وہ بہت عجیب اور طنزیہ نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہی تھیں اور ہم یہ سوچ رہے تھے کہ یہودی کتنی چالاک اور ہوشیار قوم ہے اور اپنے مخالفوں کو ختم کرنے کے لئے کیسے کیسے طریقے استعمال کرتے ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس لڑکی کے حسن و جمال اور ذہانت و قابلیت کے ہم معترف ہو گئے۔ افسوس کہ ہم اس کا نام نہ پوچھ سکے۔ اگر بٹ صاحب ہمارے ہمراہ ہوتے تو سب سے پہلے اس کا نام ہی دریافت کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کے بغیر جہاں بھی گئے وہ ہمیں یاد ضرور آئے۔

دوسرے دن حسب وعدہ صبح نو بجے میگ نے استقبالیہ سے ہمیں فون کیا تو ہم بالکل تیار تھے۔ وہ اپنی سرخ اسپورٹس کار میں اسی رنگ کا خوش رنگ لباس پہن کر آئی تھی۔ کہنے لگی "شہر کے قابل ذکر مقامات تو ہم دیکھ چکے ہیں آج آس پاس کے مناظر دیکھنے چلتے ہیں۔"

ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ مگر ہم نے یاد دہانی کرائی کہ آج شام ہمیں واپس ٹورنٹو جانا ہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ وہ کچھ چپ چپ سی ہے۔ پوچھا "کیا بات ہے! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

بولی "رات کو میری اور مارگوب کی خوب لڑائی ہوئی۔ میں نے اسے صاف صاف بتا دیا ہے کہ اگر اس نے اپنا مولوی نہیں بدلا تو ہماری دوستی ختم ہو جائے گی ہمیں بے اختیار ہنسی آ گئی۔

اس نے حیران ہو کر پوچھا "اس میں ہنسی کی کیا بات ہے؟"

ہم نے کہا "ہنسی کی تو بات ہے۔ گرل فرینڈ اور مولوی کے درمیان مقابلہ ہے۔ ہم نے آج تک میاں بیوی اور لڑکا لڑکی کے مابین بہت سے معاملات پر جھگڑا ہوتے ہوئے دیکھا ہے مگر یہ پہلا موقع ہے کہ کسی شخص کو اپنے مولوی اور اپنی گرل فرینڈ میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا موقع دیا گیا ہے۔"

اسے بھی ہنسی آ گئی۔ کہنے لگی "یہ تو تم نے سچ کہا۔ یہ بھلا کیا بات ہوئی؟ کہاں ایک مولوی اور کہاں ایک گرل فرینڈ دونوں بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں نے کوئی عقل مندی کی بات نہیں کی۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مسئلے کا حل کیا ہو گا؟"

ہم نے کہا "وقت سارے مسئلے حل کرا دیتا ہے۔ فی الحال صبر کرو۔ کچھ عرصے بعد خود بخود کوئی حل نکل آئے گا۔"

کہنے لگی "مثلاً ٹورنٹو میں مجھے کوئی اور دوست پسند آ جائے گا یا مولوی کے منع کرنے پر مارگوب خود مجھی سے ملنا چھوڑ دے گا۔ میں تو حیران ہوں کہ مولوی صاحب نے مارگوب کو مجھ سے ملنے سے منع کیوں نہیں کیا؟"

ہم نے کہا "اس مسئلے کو بھول جاؤ۔ انسان کو ہمیشہ آگے کی جانب دیکھنا چاہئے۔ یہ بتاؤ کہ اگر ہم مونٹریال میں فلم کی شوٹنگ کریں گے تو ہمیں یہاں کون سی سہولتیں مل سکتی ہیں؟"

کہنے لگی "یہاں میں ہوٹلوں کے کرائے میں رعایت کرا دوں گی۔ ٹرانسپورٹ کے لئے دو تین دوستوں کی کاریں بھی مل سکتی ہیں۔ پے انگ گیسٹ کے طور پر رہنے کے لئے اچھے اور سستے مکان بھی مل جائیں گے۔ مگر شرط یہ ہے کہ ان لوگوں کے لئے بھی فلم میں کوئی نہ کوئی گنجائش نکالنی ہو گی۔"

اتنی دیر میں ہم مونٹریال کے انتہائی خوب صورت علاقے میں جا نکلے تھے۔ قطار اندر قطار خوب صورتی سے ترشے ہوئے درخت، سبزہ زار، پھولوں سے لدے باغات، جھیلیں، قدرتی مناظر کی کمی نہیں تھی۔ قدرت کی صناعی اور حضرت انسان کی کوششوں نے مل جل کر ان مقامات کو جنت نگاہ بنا دیا تھا۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ مونٹریال اور اس کے آس پاس علاقوں میں ساری فلم کی شوٹنگ مکمل کی جا سکتی تھی۔

حکومت کی جانب سے مراعات ملنے کی بھی توقع تھی۔ اونٹاریو کی حکومت اس زمانے میں مختلف علاقائی اور نسلی اقوام کی تہذیب و تمدن کے تحفظ کی خاطر ان زبانوں میں

فلمیں بنانے والوں کو مالی امداد بھی فراہم کیا کرتی تھی۔ عبدالواجد صاحب نے جو فلم بنائی تھی اس کے لئے ان ہی ذرائع سے مدد حاصل کی گئی تھی۔ اس طرح چند بھارتی فلم سازوں نے بھی کافی فنڈز بٹورے تھے۔ میگ کا خیال تھا کہ کیوبیک کی حکومت کو بھی اس قسم کی امداد پر آمادہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ ان علاقوں میں مناظر کی فلم بندی کے ذریعے دوسرے ملکوں کے لوگوں کو سیاحت کی طرف متوجہ کیا جا سکتا ہے۔ ثبوت کی طور پر وہ ہمیں محکمہ سیاحت کے دفتر لے گئی۔ ایک بڑی باوقار خاتون سے ہماری ملاقات ہوئی۔

میگ نے انہیں ہماری فلم کے منصوبے کے بارے میں بتایا۔ پہلے تو بات چیت فرنچ میں شروع ہوئی مگر پھر انگریزی تک نوبت پہنچ گئی۔ کیونکہ میگ نے انہیں بتا دیا کہ یہ صاحب فرنچ سے واقف نہیں ہیں۔ وہ بلا تامل انگریزی میں گفتگو کرنے لگیں۔ میگ نے انہیں بتایا کہ ان کی یہ فلم پاکستان میں تو چلے گی ہی مگر دوسرے ملکوں میں بھی لوگ اسے دیکھیں گے اور کیوبیک کے خوبصورت مناظر کو دیکھ کر بے شمار سیاح بھی یہاں آئیں گے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ ایک طرح سے آپ کا اشتہار ہو گا۔ اگر صوبائی حکومت فلم ساز کے ساتھ تعاون کرے تو یہ ایک اچھا منصوبہ بن سکتا ہے۔ انہیں فوراً اس تجویز میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ہمارے ملک کا کوئی سرکاری افسر ہوتا تو شاید ساری باتیں سننے کے بعد ویسے ہی ٹرخا دیتا۔ مگر ان خاتون نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور مشورہ دیا کہ ہم اپنی تجویز تحریری طور پر پیش کریں تو ہمیں بہت سی سہولتیں حاصل ہو سکتی ہیں۔

"مثلاً؟" ہم نے پوچھا۔

بولیں "مثلاً مختلف شہروں میں آپ کے فلم یونٹ کے قیام و طعام کا بندوبست ہو جائے گا۔ کیوبیک کے دور دراز علاقوں تک جانے کے لئے ہم آپ کو ٹرانسپورٹ گاڑیاں اور ہیلی کاپٹر بھی دے دیں گے۔ اس کے علاوہ اور بھی آسانیاں دی جا سکتی ہیں۔ بس آپ فلم کے ٹائٹل میں ہمارے محکمہ سیاحت کا شکریہ ادا کر دیجئے گا۔"

ان کی باتیں بہت حوصلہ افزا تھیں اور ہم نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ اس فلم کی نمائش کے ذریعے لوگوں کو کیوبیک کی سیاحت پر اکسایا جا سکتا تھا۔ اگر اس مقصد کے لئے کیوبیک کی حکومت مختلف ذرائع سے پبلسٹی کرے تو اسے بہت زیادہ خرچہ کرنا پڑے گا۔ دوسری طرف ہمیں بطور فلم ساز کافی سہولت ہو جائے گی۔ جب میگ نے انہیں بتایا کہ یہ اپنی فلم کا ایک حصہ اونٹاریو میں بھی فلمائیں گے تو وہ خاتون سراپا سیلز گرل بن گئیں اور ہمیں اس بات پر آمادہ کرنے لگیں کہ آپ زیادہ تر فلم کی شوٹنگ ہمارے صوبے میں کریں تو ہم آپ کو بہت زیادہ امداد اور تعاون فراہم کر سکتے ہیں۔

دیکھا آپ نے۔ دوسرے ملکوں میں سرکاری محکموں کے ذمے دار لوگ کس انداز سے کام کرتے ہیں؟ انہوں نے ہمارے سامنے اس قدر دلکش اور پرکشش پروپوزل پیش کیا تھا کہ ہمیں اپنے سارے منصوبے پر نظرثانی کرنے کی ضرورت پیش آگئی۔

اسی شام ہم مونٹریال سے ٹورنٹو روانہ ہو گئے۔

ایکسپریس وے اور دوسری شاہراہوں کی بدولت سفر اتنا آسان، مختصر اور خوبصورت ہو گیا ہے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

ٹورنٹو میں واجد صاحب، شوکت صاحب اور دوسرے حضرات کو جب ہم نے کیوبیک کے محکمہ سیاحت کی تجویز بتائی تو ان سب کو یہ خیال بہت پسند آیا۔ مگر واجد صاحب کی یہ رائے تھی کہ ہم صوبہ اونٹاریو میں بھی اس قسم کی سہولتیں حاصل کر سکتے ہیں اور یہاں پاکستانی بہت زیادہ ہیں اور اس لئے ان کی وجہ سے بھی بہت زیادہ آسانی رہے گی۔ کیوں نہ محکمہ سیاحت سے رابطہ قائم کیا جائے۔

ہم نے کہا "دیکھئے صاحبان۔ آپ گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ جب تک فلم کا باقاعدہ اور جامع منصوبہ نہ بن جائے یہ سب باتیں شیخ چلی کے منصوبوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔"

واجد صاحب کہنے لگے "کیوں نہ ہم اس کمپنی کا نام شیخ چلی کے نام پر رکھ دیں؟"

شوکت صاحب نے یہ سب باتیں تو سن لیں مگر جب ہمیں شام کے وقت ملے تو وہ یہ جاننے کے لئے مرے جا رہے تھے کہ اس سفر میں میگ کے ساتھ ہماری کیسی گزری؟ جب ہم نے بتایا کہ ہم میگ اور اس کے پاکستانی بوائے فرینڈ کے مسائل سلجھانے میں مصروف رہے تو پہلے تو انہیں یقین ہی نہیں آیا۔ پھر کہنے لگے "بھائی ہم نے آپ کو اس لئے تو اتنے لمبے سفر پر نہیں بھیجا تھا۔"

"تو پھر کس لئے بھیجا تھا؟"

کہنے لگے "میگ بہت اچھی لڑکی ہے۔ ہمارا خیال تھا آپ کی دوستی ہو جائے گی

اور آپ کا سفر بھی اچھا گزر جائے گا۔"

خیر سفر تو ہمارا اچھا ہی گزرا تھا۔ میگ سے دوستی بھی ہو گئی تھی مگر یہ مرد عورت والی دوستی نہیں تھی۔ ہم نے شوکت صاحب سے کہا "دیکھئے آپ ہمارے وقت کی زیادہ فکر نہ کیجئے۔ بلا وجہ گھومنے پھرنے اور لوگوں سے تعلقات پیدا کرنے کی کوششوں میں ضائع کرنے کے لئے ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔"

شوکت صاحب فلم کے منصوبے میں کافی دلچسپی لے رہے تھے مگر نہ جانے کیوں ہماری چھٹی حس ہمیں خبردار کر رہی تھی کہ ان کی دلچسپی محض سطحی اور شوق کی حد تک ہے۔

ہم نے واجد صاحب کے سامنے اس خیال کا اظہار کیا تو انہوں نے سمجھایا کہ شوکت صاحب کا انداز ایسا ہے ورنہ وہ ہم سب سے زیادہ فلم کے منصوبے کے بارے میں سنجیدہ ہیں۔ چنانچہ ایک بار پھر ملاقاتوں اور کھانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مگر سیرو تفریح بھی جاری رہی۔ اگر کوئی شخص ٹورنٹو جائے اور نیاگرا آبشار نہ دیکھے تو اس کی دماغی حالت کے بارے میں کسی شک و شبہے کے بغیر تشویش کا اظہار کیا جا سکتا ہے اور ہمارے لیئے تو نیاگرا ایک قابل دید مقام ہی نہیں، شوٹنگ کے لئے بھی ایک اہم مقام تھا۔ پھر بھلا وہ ہم سے کیسے بچا رہ جاتا؟

نیاگرا کے بارے میں کون نہیں جانتا۔ اس کی تصویریں بھی عام ہیں مگر نیاگرا سے ہمارا باقاعدہ تعارف فلم "نیاگرا" کے ذریعے ہوا تھا۔ ہالی ووڈ کی بنائی ہوئی اس فلم میں نیاگرا اور اداکار مارلین منرو دونوں کو ایک دوسرے کا حریف بنا کر پیش کیا گیا تھا۔ مطلب یہ کہ فلم کے دوران میں دیکھنے والا یہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ نیاگرا کے حسن کو دیکھے یا مرلین منرو کی رعنائیوں کا مشاہدہ کرے؟ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ دونوں ہی چیزیں قدرت کے بہترین شاہکار تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ مارلن منرو ایک فانی ہستی تھی جب کہ نیاگرا ایک جغرافیائی منظر تھا جس کی عمر انسانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتی ہے۔

مارلین منرو غریب تو چند سال اپنی بہار دکھا کر دنیا سے رخصت ہو گئی مگر نیاگرا آج بھی موجود ہے یعنی مارلین منرو اب ایک کہانی بن کر رہ گئی ہے مگر نیاگرا بدستور ایک ٹھوس حقیقت ہے۔

"نیاگرا" ایک انتہائی خوب صورت فلم تھی۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے اس فلم کی شوٹنگ نیاگرا آبشار کے پس منظر میں کی گئی تھی اور مارلن منرو کے حسن و جمال اور پرکشش جسم اور نیاگرا کے پرشور نظاروں کو اس خوبی سے یکجا کیا گیا تھا کہ چشم تماشا حیران رہ جاتی تھی۔ فلم کا کلا ئمکس بھی نیاگرا کے آبشار ہی پر فلمایا گیا تھا اور دیکھنے والا اس خوب صورت آبشار کے پر ہیبت اور خطرناک پہلو کو دیکھ کر خوف زدہ سا ہو جاتا تھا۔ اس فلم کو ہم نے کئی بار دیکھا اور اگر بس چلتا تو اور بھی دیکھتے۔ فلم دیکھنے کے بعد ہم نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اگر اللہ نے توفیق دی تو زندگی میں دو کام ضرور کریں گے۔ ایک مارلین منرو سے ملاقات اور دوسرا نیاگرا کی سیر۔ ایک طویل عرصے تک وقت نے ان دونوں آرزوؤں کی تکمیل کی مہلت ہی نہیں دی۔ سالہا سال کے بعد جب امریکہ اور کینیڈا جانے کا موقع حاصل ہوا تو مارلین منرو دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔ صرف اس کی داستانیں، فلمیں اور تصویریں باقی رہ گئی تھیں۔ نیاگرا کا آبشار بدستور اپنی جگہ موجود تھا۔ ہم نیاگرا گئے تو مارلین منرو کو یاد کر کے غمگین ہو گئے۔ یوں سمجھیے کہ نیاگرا نے مارلین کی موت کا غم تازہ کر دیا۔

مارلین منرو ایک ایسی ہستی تھی جسے اپنی زندگی ہی میں لیجنڈ کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ ہوش سنبھالنے کے بعد ہی اس کی کہانیاں بننی شروع ہو گئیں۔ یہاں تک کہ وہ خود بھی بے شمار کہانیوں کا عنوان بنی۔ ایک گمنام اور بے سہارا لڑکی چند سال کے اندر دنیا کی مشہور ترین اداکارہ اور حسین ترین عورت کے مقام تک پہنچ گئی۔ مارلین منرو کا سب سے قیمتی اثاثہ اس کا بے محابہ اور بے پناہ حسن و جمال تھا۔ خوب صورتی کے ساتھ ساتھ اس کے سراپا میں ایک انوکھی قسم کی جنسی کشش بھی تھی۔ اس کا چہرہ ایک معصوم بچی کا چہرہ تھا مگر اس کا جسم ایک زہد شکن اور قیامت خیز شاہکار تھا۔ پچاس کی دہائی میں مالین منرو نے اپنی اداکاری اور شہرت کا آغاز کیا تھا اور ۱۹۶۲ میں وہ موت کی نیند سو گئی۔ زندگی کے آخری چند سال اس کی شہرت، دولت اور کامیابی کی معراج کے سال تھے لیکن یہی وہ زمانہ تھا جب مارلین منرو مایوسیوں، ناکامیوں اور ذہنی پریشانیوں کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔ دنیا بھر میں اس کا نام ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ کون سا ایسا شخص تھا جو اس کا طلب گار نہ تھا مگر اس کے باوجود وہ ایک بھٹکی ہوئی روح کی طرح ذہنی سکون کی تلاش میں

ماری ماری پھر رہی تھی۔ یہاں تک کہ ایک روز پر اسرار انداز میں مری ہوئی پائی گئی۔

اس کی موت بھی کئی کہانیوں کا عنوان بن گئی اور آج لگ بھگ تیس سال گزر جانے کے باوجود اس کی موت کا معما حل نہیں ہو سکا۔ اس نے خودکشی کی تھی یا اسے ہلاک کیا گیا تھا؟ اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن قدرت کی ستم ظریفی یہ ہے کہ ایک عام انسان کی نگاہ میں اس کی اداسی' مایوسی اور ذہنی بے سروسامانی کا کوئی سبب نہیں تھا۔ قدرت نے اسے کیا نہیں بخشا تھا؟ انتہائی خوب صورت چہرہ' بے پناہ اور متناسب سراپا' اداکاری کی صلاحیت' بے اندازہ دولت' بے حد و حساب شہرت اور مقبولیت۔ اس سب کے باوجود وہ خوش نہیں تھی؟ حالانکہ اسے جو کچھ بخشا گیا تھا اس کا عشر عشیر بھی کسی عورت کے حصے میں آ جائے تو وہ تا قیامت موت کو گلے لگانے پر آمادہ نہ ہو۔ مگر یہ بھی قدرت ہی کا ایک عطیہ ہے کہ جن انسانوں کو بہت کچھ دیا جاتا ہے۔ انہیں ایک بے چین روح اور بے سکون ذہن بھی ضرور عطا ہوتا ہے۔ خیر مارلین منرو کی کہانی ایک علیحدہ داستان ہے۔ نیاگرا کے ذکر پر اس کی یاد پھر تازہ ہو گئی۔

نیاگرا کا آبشار اپنی رعنائی اور قدرتی حسن کی بنا پر دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ امریکہ اور کینیڈا کے درمیان میں حد فاصل بھی ہے۔ سرحد کا فرض سرانجام دیتا ہے۔ اس کا ایک چوتھائی حصہ امریکہ میں اور تین چوتھائی کے قریب کینیڈا میں ہے۔ یوں دیکھنے والی نگاہ کے لئے تو یہ منظر سرحدی پابندیوں سے بالکل آزاد ہے لیکن امریکی حصے کے مقابلے میں کینیڈا کے حصے میں آنے والا آبشار کہیں زیادہ خوب صورت ہے۔

نیاگرا کا پہلا نظارہ دیکھنے والے کی نگاہ اور ذہن پر ہمیشہ کے لئے نقش بن کر رہ جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ نواب صاحب حسب معمول بیرونی دورں پر مصروف تھے اور ہم سیر و تفریح کے معاملے میں خود کفیل ہو گئے تھے۔ کار ہمارے پاس تھی۔ راستوں کے نقشے ہماری جیب میں تھے اور مسلسل مٹر گشت کی وجہ سے سارے راستے ہمیں آسان لگنے لگے تھے چنانچہ ٹورنٹو پہنچنے کے چار پانچ روز بعد ہم نے نیاگرا جانے کا پروگرام بنایا۔ نیاگرا کا فاصلہ ٹورنٹو سے زیادہ نہیں ہے غالباً ۷۰۔۸۰ کلو میٹر ہے۔ سڑکیں اور شاہراہیں ایسی آرام دہ اور خوب صورت ہیں کہ یہ اور بھی مختصر لگتا ہے۔ ہم نے کچھ

معلومات تو زبانی نواب خالق سے حاصل کیں۔ کچھ ملنے والوں سے دریافت کیں اور پھر نقشہ سنبھال کر ایک روز صبح سویرے ٹورنٹو سے نیاگرا کے لئے روانہ ہو گئے۔ جہاں تک سڑکوں کے نقشے کا تعلق ہے ہمارے لئے اس کی حیثیت ایک تعویز سے زیادہ نہیں ہے۔ یعنی اسے ہم ساتھ ضرور رکھتے ہیں مگر پڑھ نہیں سکتے۔ پتا نہیں کیا بات ہے کہ نقشوں کا حساب کبھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر "مورل سپورٹ" کے لئے باہر کے ملکوں میں نقشہ ساتھ رکھنا بھی ایک ٹوٹکا ہے۔ صبح ناشتا کر کے گھر سے رخصت ہوئے تو اشتیاق اور بے تابی کے مارے ہمارا عجیب عالم تھا۔ لبنیٰ کو بھی نیاگرا دیکھنے کی بے تابی تھی۔ مگر دونوں بچیوں پر کوئی خاص اثر نہیں تھا۔ نادیہ کی عمر آٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ اس لئے آبشار سے اسے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ البتہ یہ سن کر انہیں دلچسپی پیدا ہو گئی کہ وہاں سیر و تفریح کا سامان بھی ہے اور کھانے پینے کا بھی بندوبست ہے۔ شاپنگ بھی ہو سکتی ہے۔ کھلونے مل سکتے ہیں۔ گھوڑا گاڑی' چھوٹی سی ٹرین یہاں تک کہ آس پاس کے مناظر دیکھنے کے لئے ایک ائر لفٹ بھی موجود ہے جب یہ تمام تفصیلات انہیں بتائی گئیں تو وہ ازراہ کرم نیاگرا جانے کے لئے تیار ہو گئیں' مگر باروکو ان چیزوں سے نہیں بہلایا جا سکتا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ ان دونوں نے فلم نیاگرا بھی نہیں دیکھی تھی اور مارلین منرو کے نام تک سے نا آشنا تھیں۔ انہیں نیاگرا جانے کے مقابلے میں سینٹرل آئی لینڈ جا کر کشتی میں سیر کرنا اور میکڈانلڈ میں برگر اور آئس کریم کھانا زیادہ دلچسپ اور پرکشش معلوم ہوتا تھا۔ ہم نے انہیں سمجھایا کہ نیاگرا جائیں گے تو میکڈانلڈ وہاں بھی ہو گا۔ آئس کریم اور برگر بھی مل جائے گا۔ اس کے علاوہ تفریح اور کھیل کا اور سامان بھی ہو گا۔ یہاں تک کہ جھولے تک ہوں گے۔ یہ سن کر دونوں لڑکیوں کے چہروں پر تھوڑی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ نیاگرا جانے پر آمادہ ہو گئیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ انسان کی دلچسپیوں اور انداز فکر میں کتنی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں' کبھی غور کیجئے تو یہ بذات خود ایک مضمون ہے۔ یونگ اسٹریٹ سے گزر کر ایکسپریس وے پہنچنے میں تھوڑی سی دیر لگی' اس کے بعد تو فاصلے سمٹ کر رہ گئے۔ راستہ اس قدر حسین کہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ڈرائیونگ کریں یا آس پاس کے مناظر کو اپنی نگاہوں میں بسا لیں۔ کچھ قدرت کا حسن اور پھر کچھ انسانی ہنرمندی کی برکت' شاید ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ کینیڈا بے حد خوبصورت ملک ہے۔ مگر حسن کی ثنا

خوانی بار بار کرنے میں کیا حرج ہے؟

نیاگرا آبشار تو ہے ہی مگر اس کے گرد جو آبادی ہے اس کا نام بھی نیاگرا ہے۔ یعنی نیاگرا سٹی۔ یہ ایک مختصر سا رقبہ سمجھ لیجئے مگر دنیا بھر کی آسائشیں' دلچسپیاں اور رعنائیاں اس چھوٹے سے رقبے میں سمیٹ کر یکجا کر دی گئی ہیں۔ ایک فن فیئر قسم کی رونق تو یہاں مستقل لگی رہتی ہے۔ پھر ہوٹلوں' ریستورانوں اور دکانوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ وہ سڑک جو آبشار سے شہر کی جانب جاتی ہے زیادہ لمبی نہیں ہے۔ مگر یہاں دنیا بھر کے کھیل تماشے اور دلچسپیاں موجود ہیں۔ ریستوران بھی ہیں اور اس حساب سے تعمیر کئے گئے ہیں کہ وہاں بیٹھ کر بھی آبشار کا کوئی نہ کوئی حصہ ضرور نگاہوں کے سامنے رہتا ہے۔ ایک چھوٹی سی ٹرین مستقل حرکت میں رہتی ہے۔ گھوڑا گاڑیاں ہیں۔ ایئر لفٹ اتنی بڑی ہے کہ اس میں ساٹھ ستر افراد بیک وقت سوار ہو سکتے ہیں اور اس میں سے آبشار کا نظارہ کچھ اور ہی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔

یہ تمام چیزیں تو مغربی ملکوں کے ہر تفریحی مقام پر میسر ہیں۔ مگر جو چیز کہیں اور دیکھنے کو نصیب نہیں ہوتی وہ آبشار ہے۔ آبشار کو دیکھنے کے لئے ایسا بندوبست کیا گیا ہے کہ آپ ہر زاویے سے اس کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ جگہ جگہ بڑی بڑی دوربینیں اور خوردبینیں نصب ہیں جن کے ذریعے نیاگرا کے ہر حصے کو دیکھا جا سکتا ہے۔ آبشار کا بہنا اور اونچائی سے اتنے بہت سے پانی کا مسلسل نیچے گرنا ایک پر شور عمل ہے جس کی گونج دور دور تک سنائی دیتی ہے۔ کینیڈا کی جانب سے کھڑے ہو کر سامنے دیکھیں تو امریکا کے حصے کا نیاگرا بھی نظر آ جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی امیر رشتے دار بچی کچھی چیز اپنے غریب رشتے دار کو دے دے۔ سچ جانئے یہاں سے اگر امریکا کو دیکھئے تو اس پر بہت ترس آتا ہے۔

آبشار کو دیکھنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کشتیوں میں سوار ہو کر آبشار کے نیچے تک پہنچ جائیں۔ ہماری تو پانی کے نام سے جان نکلی جاتی ہے۔ اور پھر جب اتنا زیادہ پانی ہو تو پھر اس میں جانے کی بھلا کیا تک ہے۔ مگر لبنیٰ نے ہمیں سمجھایا کہ یہ محض پانی نہیں ہے۔ نیاگرا کا آبشار ہے۔ اس آبشار کو بلندی سے گرتے ہوئے پانی کے عین نیچے سے دیکھنے کا موقع زندگی میں بار بار نصیب نہیں ہوتا۔ (ہمیں یہ خوش قسمتی سے تین بار نصیب ہو گیا)

بچیاں بھی اس مہم کے لئے بہت پر جوش تھیں۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق ہم بھی شرما شرمی میں رضامند ہو گئے ورنہ بچیاں تالیاں بجا کر شور مچا دیتیں کہ پاپا ڈرتے ہیں۔ ہم ڈر تو رہے تھے مگر اس روز ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ ڈرنا بذات خود کوئی چیز نہیں ہے۔ بری بات تو یہ ہے کہ اس خوف کا اظہار کیا جائے۔ جو غریب ڈر کا اظہار کر دیتا

ہے وہ ڈرپوک کہلاتا ہے۔ جو اسے ظاہر نہیں کرتا وہ بہادر کا لقب پاتا ہے یہ اس طرح سمجھ لیجئے جیسے بہت سے جرم کرنے والے کبھی نہیں پکڑے جاتے۔ مگر جو غریب قسمت کا مارا پکڑا جاتا ہے وہ مجرم کہلاتا ہے اور اسے سزا دینے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جو شاید اس سے بھی زیادہ جرائم کرتے ہیں مگر کیونکہ پکڑے نہیں گئے اس لئے شریف اور معزز قرار پاتے ہیں۔ پتا نہیں یہ فلسفہ آپ کی سمجھ میں آیا کہ نہیں؟

آبشار کی اصلی سیر کرنے کے لئے سب کو نیچے اتر کر ایک گھاٹ پر جانا ہوتا ہے۔

یہاں سیاحوں کی قطاریں لگی ہوتی ہیں۔ جوان' بچے' بوڑھے' عورت' مرد سبھی ایک ہی قطار میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ ٹکٹ خریدیے اور اپنی باری کا انتظار کیجئے۔ یہ ٹکٹ خاصا مہنگا ہے۔ مگر نیاگرا آبشار کے عین اندر سے گزرنا بھی تو کوئی معمولی تجربہ نہیں ہے۔ یہ کشتیاں اوپر سے کھلی ہوئی ہوتی ہیں۔ ایک خوبرو خاتون نے ٹکٹوں کے ساتھ ہی سیاہ رنگ کی برساتیاں بھی ہمارے حوالے کر دیں۔

ہم نے پوچھا "ان برساتیوں کی کیا ضرورت ہے؟ کیا بارش کا امکان ہے؟"

وہ ہماری سادگی (بلکہ بے وقوفی) پر مسکرائیں اور رکنے لگیں "مسٹر آپ کی یہ کشتی دریا کا چکر لگانے کے بعد آبشار کے نیچے بھی جائے گی۔ آپ وہ سامنے آبشار دیکھ رہے ہیں؟"

ہم نے جواب دیا "بالکل دیکھ رہے ہیں۔"

بولیں "جب یہ ہزاروں ٹن پانی اتنی بلندی سے نیچے گرتا ہے تو اس سے چھینٹیں بھی اڑتی ہیں۔ بس یوں سمجھئے کہ ان چھینٹوں سے آپ کے لباس کو محفوظ کرنے کے لئے یہ برساتیاں دی گئی ہیں۔" ہمیں اس وقت تک سچ مچ یقین نہیں آیا تھا کہ ہماری کشتی واقعی آبشار کے نیچے سے بھی گزرے گی۔ ہمارے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے اور جو کہیں اتنے زور دار پانی کے دباؤ میں آکر کشتی الٹ گئی تو ہمارا کیا حشر ہو گا؟ ہماری آنکھوں کے سامنے بھنور بناتا' جھاگ اڑاتا ہوا ایک سمندر نظر آ رہا تھا۔ ہماری ہمت جواب دے گئی۔ ہم نے لیئی سے کہا "بھئی یہ تو بہت خطرناک معاملہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس پروگرام کو ملتوی کر دیں۔"

لیئی نے کہا "کیوں؟ کیا ڈر لگ رہا ہے؟" آخر وہ ہماری بیوی ہے۔ اس سے بہتر ہماری نفسیات اور کون جان سکتا ہے۔

ہم نے سر ہلا کر اقرار کیا اور کہا "ویسے بھی بلاوجہ اتنے بہت سے پانی کے نیچے جانے کی تک کیا ہے۔ بھئی آبشار کو ہم نے سو طرح دیکھ لیا ہے۔"

انہوں نے کہا "اور جو یہ سینکڑوں لوگ وہاں جانے کے لئے بے تاب ہو رہے ہیں تو ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

ہم نے کہا "ہو سکتا ہے یہ بھی ہماری طرح دل ہی دل میں ڈر رہے ہوں۔"

"آپ ذرا اپنی بچیوں کی طرف دیکھئے۔ یہ کہیں ڈر رہی ہیں؟"

"ان کا کیا ہے' یہ تو بے وقوف ہیں' معصوم ہیں۔"

لیئی نے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہمیں دلیل سے قائل کرنے کی کوشش کی' بولیں "دیکھئے کتنے بچے' بوڑھے' عورتیں' وہاں جانے کی منتظر ہیں۔ یہ سب کے سب تو بے وقوف اور معصوم نہیں ہو سکتے۔ اس میں اگر کوئی خطرہ ہوتا تو ہر روز ہزاروں لوگ یہ حماقت نہ کرتے۔ ویسے خطرے کی صورت میں حفاظت کا بھی کافی بندوبست ہے۔ وہ دیکھئے۔"

لیئی نے ہماری توجہ حفاظتی کشتیوں اور ان میں سوار مستعد پیراکوں اور غوطہ خوروں کی جانب مبذول کرائی۔ ہم سوچ میں پڑ گئے۔

لیئی نے کہا "اور یہ بھی سوچ لیجئے۔ زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب آپ پچھتائیں گے کہ آپ ہمارے ساتھ اس تجربے میں شریک نہیں تھے"

"ہمارے ساتھ سے آپ کی کیا مراد ہے؟" ہم نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"مراد یہ ہے کہ تینوں تو وہاں سے ہو آئیں گے۔ آپ ہی اکیلے محروم رہ جائیں گے۔"

"بھئی کیسی باتیں کر رہی ہو۔ جس چیز کو میں خطرناک سمجھتا ہوں وہاں اپنی بیوی اور بچیوں کو جانے کی اجازت کیسے دے سکتا ہوں۔ کیا مجھے آپ لوگوں کی زندگی پیاری نہیں ہے؟"

لیئی نے مسکرا کر کہا "تو پھر چپکے سے کشتی میں بیٹھ جائیں۔"

مرتا کیا نہ کرتا والا مقولہ آپ نے بھی سنا ہو گا۔ سنا تو ہم نے بھی تھا مگر اس کا

اصل مطلب اس روز ہم پر منکشف ہوا۔ ہم نے اپنے حصے کی سیاہ پلاسٹک والی برساتی سنبھالی اور آگے چل پڑے۔ بڑے آرام سے لوگ ایک کھلی جگہ پہنچ کر برساتیاں پہن لیتے تھے اور پھر آگے بڑھ کر اپنی "بوٹ" میں سوار ہو جاتے تھے۔ اس برساتی کے ہمراہ ایک ٹوپی بھی ہوتی ہے' بلکہ یہ برساتی ہی کا ایک حصہ سمجھ لیجئے۔ کئی لوگوں نے تو یہ "ٹوپ" آغاز سفر ہی میں سر پر اوڑھ لئے اور ہمارے جیسے کچھ لوگ اس امید پر بیٹھے رہے کہ جب سر پر پڑے گی تو دیکھا جائے گا۔ لیجئے صاحب بوٹ میں سب لوگ بڑے آرام اور اطمینان سے اپنی پلاسٹک کی خوبصورت سیٹوں پر بیٹھ گئے اور وقت مقررہ پر بوٹ کا انجن حرکت میں آگیا۔ جتنی سیٹیں تھیں' اتنے ہی مسافر تھے۔ اس لئے دھکم پیل تھی نہ ہی شور شرابا۔ سب لوگ اس کھلی چھت کی کشتی میں سوار پانی میں آگے بڑھ رہے تھے۔

جس جگہ یہ الغاروں پانی اس قدر بلندی پر سے نیچے گرتا ہے وہاں ایک جھیل سی بن گئی ہے جس میں ہردم تلاطم برپا رہتا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ اوپر سے پانی مسلسل گرتا رہتا ہے۔ اس لئے جھیل میں ہروقت مدو جزر کی کیفیت موجود رہتی ہے۔ انتہائی شفاف جھاگ اڑاتا ہوا نیلا پانی ایک طلسماتی منظر پیش کرتا ہے۔ ہماری کشتی میں ساٹھ ستر کے قریب مسافر سوار تھے۔ ان میں ہر جنس سے تعلق رکھنے والے مسافر تھے۔ خوبصورت اور طرح دار عورتیں جو سیاہ برساتیاں اور سیاہ ٹوپیاں پہن کر کسی اور ہی سیارے کی مخلوق نظر آ رہی تھیں۔ بوڑھی عورتیں بھی اسی حلئے میں تھیں مردوں کا بھی یہی لباس تھا اور بچوں کا تو کہنا ہی کیا۔ خوب صورت گورے چٹے بچے سر سے پیر تک سیاہ لبادے میں لپٹے ہوئے بہت پیارے لگ رہے تھے۔ یکایک اناؤنسر خاتون نے انگریزی اور پھر فرنچ میں اعلان فرمایا کہ سب لوگ اپنی ٹوپیاں پہن لیں کیونکہ اب کشتی آبشار کے نیچے سے گزرے گی۔ ایک صاحب جو ہمارے پاس ہی تشریف فرما تھے اور غالباً ہم سے بھی زیادہ ڈر رہے تھے' اس لئے بد مزاجی کا مظاہرہ بھی کر رہے تھے۔ جب اناؤنسر نے کہا کہ سب اپنی اپنی ٹوپیاں پہن لیں تو اپنی بیوی سے کہنے لگے "ظاہر ہے سب اپنی اپنی ٹوپیاں ہی پہنیں گے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں اپنے برابر والی کی ٹوپی پہن لوں اور تم میری ٹوپی پہن لو۔ ارے بھئی یہ ٹوپیاں تو برساتیوں کے ساتھ ہی لگی ہوئی ہیں۔"

ان کے پاس بیٹھی بچی نے کہا "ڈیڈی! دیکھئے وہاں کتنا بہت سا پانی ہے۔"

بد مزاجی سے بولے "ارے بھئی آبشار ہے۔ اس میں بہت سا پانی نہیں ہو گا تو اور کیا ہو گا۔ یہ تمہارے باتھ روم کا شاور تو نہیں ہے نا۔ آبشار ہے اور وہ بھی نیاگرا آبشار۔"

وہ اسی قسم کی دل جلی باتیں کر کے اپنا دل جلاتے اور دوسروں کو تفریح کا سامان بہم پہنچاتے رہے۔ اب ہماری کشتی کشاں کشاں آبشار کی جانب رواں تھی اور آبشار کے پانی سے اڑنے والی ہلکی ہلکی پھوار ہم سب پر برسنی شروع ہو گئی تھی۔

وہ صاحب بولے "لو آئی مصیبت' اب کپڑے خراب ہوں گے۔"

ان کے برابر بیٹھی ہوئی ایک بچی نے کہا "مگر ہم سب نے برساتیاں پہنی ہوئی ہیں۔"

وہ بچی کو گھور کر رہ گئے۔ جیسے جیسے کشتی آبشار کی جانب بڑھ رہی تھی پانی کے شور کی آواز بڑھتی جا رہی تھی۔ دراصل آبشار سے گرنے والا پانی یہاں اکٹھا ہوتا ہے اور پھر دریا کی شکل میں آگے روانہ ہو جاتا ہے۔ یہاں پانی میں ہلچل تو ہوتی ہے مگر کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ کچھ دیر بعد ہلکی پھوار نے بارش جیسی صورت اختیار کر لی یہاں تک کہ کشتی آبشار سے گرنے والے پانی کے نیچے پہنچی تو زور شور سے پانی نے ہم سب پر گرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ہم آبشار کے دھارے میں سے گزر کر آبشار کے پیچھے چلے گئے۔ آبشار کے پانی نے ہمارے سامنے پانی کی ایک دیوار سی کھڑی کر دی تھی جس کے دوسری جانب کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ چند لمحے یہ کیفیت رہی اور اس کے بعد کشتی نے ایک بار پھر آبشار سے گرنے والے پانی میں سے گزرتے ہوئے کھلی جگہ کا رخ کیا۔ ہم بتا چکے ہیں کہ پانی سے ہمیں ڈر لگتا ہے مگر یہ منظر اور ماحول اس قدر دلکش تھا کہ ہمارا خوف بالکل غائب ہو گیا تھا۔ جب ہماری کشتی آبشار کے پانی کی دیوار کے دوسری جانب پہنچی تو نیم تاریکی سی چھا گئی۔ یوں لگا جیسے رات ہونے والی ہے۔ ظاہر ہے کہ سورج کی روشنی کو پانی کی موٹی سی دیوار نے روک دیا تھا۔ اس جھٹپٹے میں کشتی میں سوار مسافر جو سر سے پاؤں تک سیاہ برساتیوں میں ملبوس تھے اور سروں پر سیاہ ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے پر اسرار قسم کی آسمانی مخلوق نظر آ رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہم کسی اجنبی سر زمین میں ہیں یا پھر خواب کی دنیا میں سفر کر رہے ہیں۔ قریب قریب سبھی مسافر یوروپین تھے اس لئے سیاہ

لباسوں میں ان کے دمکتے ہوئے سرخ و سفید چہرے بہت بھلے لگ رہے تھے۔

ہماری کشتی گرتے ہوئے آبشار کی موٹی پانی کی دیوار سے باہر نکلی تو ایک بالکل انوکھا منظر ہماری نگاہوں کے سامنے تھا۔ ہماری نظروں کے سامنے جھیل اور دریا تھا جس کے پس منظر میں پہاڑی تھی اور پیش منظر میں قوس قزح کی کمان اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ فرما تھی۔ قوس قزح کے مناظر ہم نے زندگی میں اور بھی کئی دیکھے مگر یہ ایسا نظارہ تھا کہ آنکھوں اور دل و دماغ کی روح پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو کر رہ گیا۔ زندگی میں یوں تو ہر انسان بہت سے خوب صورت اور دلکش مناظر دیکھتا ہے۔ مگر ان میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ یہ بھی ایک ایسا ہی انمٹ اور لازوال منظر تھا۔ اس سے پہلے ایک بار ہم نے قاہرہ میں ابوالہول کے پس منظر میں شفق پھولی ہوئی دیکھی تھی جس کے بعد غروب آفتاب کا منظر بھی دیکھنے کا موقع مل گیا۔ وہ نظارہ بھی ساری زندگی بھلایا نہیں جا سکے گا۔ ہماری کشتی اس بھیگے ہوئے سفر کے بعد ایک بار پھر کنارے کی جانب رواں دواں تھی۔ آبشار کے پانی کی پھوار اب بھی ہمارے چہروں پر شبنم کی مانند پڑ رہی تھی۔ جب آبشار کافی فاصلے پر رہ گیا تو ہماری نگاہوں کے سامنے پھر وہی منظر تھا جو فلموں اور تصویروں میں نظر آتا ہے۔ اس دن ہمیں احساس ہوا کہ جن لوگوں نے صرف سامنے کے رخ سے ہی نیاگرا کا آبشار دیکھا ہے اور آبشار کے عقب سے سامنے والا منظر نہیں دیکھا نیاگرا فال کے بارے میں ان کا تاثر مکمل نہیں ہے۔

بچیوں نے اس سفر کو بہت انجوائے کیا تھا۔ انہیں ایک لمحے کے لئے بھی ڈر نہیں لگا بلکہ یہ انوکھا سفر ان کی یادوں کی البم میں ہمیشہ کے لئے تصویر بن کر چسپاں ہو گیا۔ نیاگرا کے مختصر سے خوب صورت شہر میں گھومنے پھرنے، سیر کرنے اور لطف اندوز ہونے کے لئے دنیا بھر کی دلچسپیاں ہیں۔ پراسرار اور خوفناک کھیل بھی ہیں۔ جھولے اور فن فیئر کے دیگر تمام لوازمات بھی موجود ہیں۔ آپ چاہیں تو گھوڑا گاڑی میں سیر کریں یا گھوڑے کی سواری کریں۔ چھوٹی پٹڑی کی ٹرین بھی نیاگرا کے سامنے والی بڑی سڑک پر شٹنگ کرتی رہتی ہے اور اس میں بچے، بڑے، بوڑھے ہر عمر کے لوگ سواری کرتے ہیں اور یکساں طور پر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کھانے پینے کے لئے ہر قسم کے ریستوران ہیں۔ مگر بچیوں کو ایک ایسا ریستوران پسند آیا جس کے باہر لکھا ہوا تھا کہ وہاں آنے والے والدین کے بچوں کے خورد نوش کا کوئی معاوضہ وصول نہیں کیا جائے گا۔ ریستوران بہت معقول اور خوبصورت تھا۔ کھانا بھی اچھا تھا۔ اس سے زیادہ سروس اچھی تھی۔ تین چار نو عمر اور خوش شکل ویٹریس لڑکیاں بڑی خوش مزاجی کے ساتھ مسکراتے ہوئے مہمانوں کی آؤ بھگت کرنے میں مصروف تھیں۔ ریستوران میں خوب رونق تھی اور ہمارا خیال ہے کہ ہر وقت رہتی ہو گی۔ والدین اپنے بچوں کے ہمراہ بیٹھے گپ شپ میں مصروف تھے۔ بچے بھی بات چیت اور کھیل کود میں لگے ہوئے تھے۔ ہر عمر کے بچے اپنی پسند اور استعداد کے مطابق سرگرمیوں میں مگن تھے۔ چھوٹے شیر خوار بچے فرش پر لڑھکتے پھر رہے تھے۔ ان سے ذرا بڑے بھاگ دوڑ اور اچھل کود میں مصروف تھے۔ ذرا سمجھ دار بچے میزوں پر بیٹھے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیالات کرنے میں مصروف تھے۔ چونکہ ہر عمر کے بچے یہاں موجود تھے اس لئے ہر عمر کے بچوں کے لئے رفاقت اور دوستی کا سامان موجود تھا۔ یہ صورت حال والدین کے لئے بہت خوش کن اور اطمینان بخش تھی کچھ دور پر ایک میز میں دو اور میزیں جوڑ کر ان کا سائز بڑھا دیا گیا تھا اور یہاں ایک عدد والدین (یعنی ماں باپ) اپنے گیارہ بچوں کے ساتھ تشریف فرما تھے۔

ہم نے لیلٰی سے کہا "اس ریستوران میں آنے کا اصل فائدہ تو ایسے خاندانوں کو ہے۔"

وہ بولیں "مگر یہ فائدہ صرف اسی ریستوران کی چار دیواری تک محدود ہے۔ اس کے باہر انہیں جو نقصان ہے اس کا بھی کچھ اندازہ ہے آپ کو۔"

ہمارے دیکھتے دیکھتے ایک امریکی جوڑا ریستوران میں داخل ہوا۔ ان کے ہمراہ دس بارہ سال کا ایک لڑکا بھی تھا لڑکے نے سامنے والی میز پر بیٹھے ہوئے گیارہ بچوں کو دیکھا تو حیران ہو کر ٹھٹک کر رہ گیا۔ پھر اس نے انگلی کی مدد سے ان کی گنتی شروع کر دی۔ گنتی پوری کرنے کے بعد وہ اس میز کی جانب بڑھا اور والدین کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سب لوگ اسے سامنے پا کر خاموش ہو گئے۔ اس نے خاندان کے سربراہ سے مخاطب ہو کر کہا "سر، مجھے آپ سے ایک شکایت ہے۔ آپ نے ان بچوں کے ساتھ بہت ناانصافی کی ہے۔"

وہ ایک صحت مند اور گول مٹول ہنس مکھ آدمی تھے۔ حیران ہو کر بولے "وہ کیسے؟"

بچے نے کہا۔ سر، آپ نے پوری ٹیم تو بنا دی مگر ایکسٹرا کھلاڑی کہاں ہیں؟"
اور کوئی ہوتا تو شاید ناراض ہو جاتا یا ان سنی کر کے ٹال دیتا مگر وہ صاحب مسکرا کر
بولے "فکر نہ کرو بیٹے! وہ عنقریب آنے والا ہے۔"
(HE IS ON HIS WAY)
ہم ان کی خوش مزاجی اور حاضر جوابی سے بہت مرعوب ہوئے۔

نیاگرا کا پہلا سفر تو محض سیرو تفریح کے لئے تھا۔ اس کے بعد ہم دو تین بار اور وہاں گئے۔ ایک بار چاندنی رات میں بھی گئے۔ واجد صاحب کا اصرار تھا کہ چاندنی رات میں نیاگراہ کا نظارہ انتہائی حسین اور دلکش ہوتا ہے۔ ان کے اصرار پر ایک رات وہاں پہنچے۔ رات تھی مگر رنگا رنگ روشنیوں کے باعث دن نکلا ہوا تھا اور رنگ برنگی روشنیاں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ آبشار کا پانی جس طرف سے آ کر نیچے گر رہا تھا اس کے اوپر چودھویں کا چاند جلوہ گر تھا۔ چاندنی بلند و پست پر ریشمی چادر کی مانند پھیلی ہوئی تھی۔ آبشار کا جھاگ اڑاتا ہوا پانی اس دودھیا روشنی کی آمیزش سے ایک ایسی خوب صورتی میں ڈھل گیا تھا جسے الفاظ میں بتانا ممکن نہیں ہے۔ اسے تو صرف دیکھ کر ہی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لوگ رات کے وقت بھی دور بینوں کی مدد سے آبشار اور آسمان پر ستارے دیکھنے میں مصروف تھے۔ یہ منظر واقعی بہت خوب تھا۔ چاندنی رات میں آگرہ کے تاج محل کو دیکھنے کا جو لطف اور کیف ہے یہ اس سے ملتا جلتا سا تجربہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تاج محل میں ایک نزاکت، لطافت اور حزنیہ رومان انگیز ماحول ہے جب کہ نیاگرا ذہنوں پر پر ہیبت شان و شکوہ کے ساتھ ایک عجیب سی فخر آمیز کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ اسے دیکھ کر ایک خیال یہ بھی آتا ہے کہ حضرت انسان کیسے کیسے زور آور قدرتی جناتوں کو قابو میں کر چکے ہیں۔ مثلاً نیاگرا ہی کو دیکھ لیجئے۔ اس بپھرے ہوئے، قیامت خیز اور منہ زور پانی کو انسانوں نے اپنی تفریح کا ذریعہ بنا لیا ہے۔

نیاگرا کا تیسرا دورہ ہم نے فلم "کامیابی" کی شوٹنگ کے سلسلے میں کیا تھا۔ دو سال بعد "کامیابی" کی فلم بندی کے لئے ہم لوگ کینیڈا پہنچے تو ہیڈ کوارٹر ٹورنٹو کو بنایا۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ کینیڈا میں فلم بنائی جائے اور نیاگرا کے آبشار کی فلم بندی نہ کی جائے؟

چنانچہ پرویز ملک اور عکاس ریاض شاہ بخاری' نیاگرا کا جائزہ لینے کے لئے گئے تو ہم بھی ان کے ساتھ تھے۔ ظاہر ہے' نیاگرا کے بارے میں ہماری معلومات ان سے زیادہ تھیں۔ مثلاً یہی کہ کون سا ریستوران کس قسم کا کھانا فراہم کرتا ہے' آئس کریم کس جگہ اچھی ملتی ہے۔ شاپنگ کے لئے کون سی جگہ زیادہ مناسب ہے وغیرہ وغیرہ اس بار شبنم اور روبن گھوش بھی ہم لوگوں کے ہمراہ تھے۔ ویسے تو شبنم کو ساتھ لے جانے کی ضرورت نہ تھی مگر آبشار اور اردگرد کے مقامات کو دیکھنے کی تمنا میں وہ ہمارے ساتھ چل پڑیں۔ پرویز صاحب اور ریاض بخاری مختلف زاویوں سے آبشار اور اردگرد کے مقامات کو دیکھتے رہے۔ ہم نے شبنم کو چھوٹی سی ٹرین' گھوڑا گاڑی اور ٹرالی کار وغیرہ کی سیر کرا دی۔ روبن گھوش اس کھوج میں لگے رہے کہ آس پاس کہیں پاکستانی کھانا بھی ملتا ہے یا نہیں۔ ان کی یہ ریسرچ کامیاب نہیں ہو سکی کیونکہ نیاگرا میں وہ دال بھات تیار کرنے والا ایک ریستوران بھی تلاش نہیں کر پائے۔ البتہ وہ عجیب و غریب کھلونے تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مثال کے طور پر ربر کے بنے ہوئے سانپ جو بالکل اصلی لگتے تھے مینڈک' مکڑے' چوہے وغیرہ۔ یہ چیزیں وہ لوگوں کو ڈرانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ پھر انہوں نے ایک دکان میں سے پلاسٹک کے بنے ہوئے خوفناک شکلوں والے ماسک بھی دریافت کر لئے۔ ان میں سے کچھ ہنستے ہوئے چہروں کے تھے' کچھ روتے ہوئے چہروں کے تھے اور بعض انتہائی ڈراؤنے بھی تھے۔ ایک ماسک تو اس قدر ڈراؤنا تھا کہ جب انہوں نے واپس جا کر اپنے کمرے میں ہم سب کو پہن کر دکھایا تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ محض ماسک ہے خواتین کی بے اختیار چیخیں نکل گئیں اور بڑے بڑے بہادر مردوں کا ڈر کے مارے برا حال ہو گیا۔ خود ہمارے رونگٹے بھی کھڑے ہو گئے۔

رونگٹے کھڑے ہونے کے ذکر پر ہمیں یاد آیا کہ ابراہیم جلیس مرحوم جو لاجواب افسانہ نگار اور کالم نویس تھے' انتہائی فقرے باز اور مسخرے بھی تھے۔ کسی جگہ کتنی بھی سنجیدہ گفتگو کیوں نہ ہو رہی ہو وہ ایک پل میں قہقہے بکھیر دیتے تھے مثلاً کسی جگہ کوئی مولوی صاحب بڑا دردناک اور ڈراؤنا قصہ سنا رہے ہیں۔ سننے والے اس کے تاثر میں کھوئے ہوئے ہیں کہ اتنے میں ابراہیم جلیس محفل میں آ گئے۔ وہ صاحب بیان کر رہے ہیں۔ کیا بتاؤں' کس قدر خوفناک منظر تھا۔ یقین جانئے میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

ابراہیم جلیس بڑی سنجیدگی سے پوچھنے لگے اچھا تو پھر آپ نے وہ رونگٹے کس طرح بٹھائے؟ سب لوگ بے اختیار ہنس پڑے اور محفل کا رنگ ہی بدل گیا۔

ماسک دیکھنے کے بعد ہمارے جسم کے جب رونگٹے کھڑے ہوئے تو ان کو بٹھانے کے لئے ہم کوئی بہانہ کر کے فوراً کمرے سے باہر چلے گئے۔ جسم کو تھوڑی سی ٹھنڈی ہوا لگی اور دماغ کو یقین آیا کہ وہ تو محض ماسک تھا تو رونگٹے خود بخود بیٹھ گئے۔ روبن گھوش نے ایک ایسا مختصر سا کشن بھی تلاش کیا تھا جسے اگر صوفے یا کرسی پر رکھ دیا جائے اور کوئی بے خیالی میں اس پر بیٹھ جائے تو اس کے اندر سے بہت زور کی ہوا خارج ہوتی تھی اور پھر ایک درد بھری آہ کمرے میں گونجنے لگتی تھی۔ ایک ماچس کی ڈبیہ کے سائز کا کھلونا تھا جس کا بٹن دبانے سے اس کے اندر سے نوزائیدہ بچے کے رونے کی آوازیں نکلنی شروع ہو جاتی تھیں۔ روبن یہ تمام چیزیں خریدنے کے بعد سب کو دکھاتے تھے اور ان کی خصوصیات کا مظاہرہ بھی کرتے تھے۔

نیاگرا میں گھومتے ہوئے رات ہو گئی۔ یہ چھوٹی سی جگہ ہے اصولاً تو ایک دو گھنٹے بعد ہی دل بھر جانا چاہئے مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ یہاں سے رخصت ہونے کو جی ہی نہیں چاہتا اور اگر چلے جائیں تو دوبارہ واپس جانے کی خواہش رہتی ہے۔ رات کے وقت نیاگرا ہم نے پہلے بھی دیکھا تھا مگر اس بار جب شہر میں گھومے پھرے تو ایک دو نئی چیزیں بھی نظر آئیں۔ ایک تو "ہاؤس آف ہارر" تھا۔ اس ہال کے اندر ٹکٹ خرید کر داخل ہوتے تھے۔ اور ہم حیران ہیں کہ لوگ اسے دیکھنے کے لئے ٹکٹ پر پیسے کیوں ضائع کرتے ہیں۔ اصولی طور پر تو منتظمین کو چاہئے کہ اندر جانے والوں کو پیسے دیا کریں۔ صاحب کیا بتائیں یہ کس قدر فضول ڈراؤنی اور واہیات جگہ ہے۔ جگہ جگہ ڈراؤنے مناظر ہیں۔ آپ کے سر کے پاس سے اچانک ایک چمگادڑ اڑتی ہوئی نکل جائے گی اور اس کی مکروہ آواز آپ کے جسم کے رونگٹے کھڑے کر دے گی۔ (پھر وہی رونگٹے کھڑے کرنے والی بات) عجیب عجیب شکلوں کی مخلوق قدم قدم پر ملے گی۔ ایسی بھیانک آوازیں گونجتی رہیں گی کہ آپ کے رونگٹے۔ خیر چھوڑیے۔ یہاں تو ہر قدم پر ہی رونگٹوں کی اٹھک بیٹھک جاری رہتی ہے بلکہ رونگٹے مستقلاً کھڑے رہتے ہیں۔ یورپ' امریکہ اور کینیڈا کے شہروں میں جن مقامات پر تفریح گاہیں اور سیاحوں کی دلچسپی کے مقامات ہیں وہاں اس قسم کی تفریحات

اور دلچسپیاں (اگر آپ انہیں تفریحات اور دلچسپیاں سمجھیں تو) موجود ہیں۔ دراصل یہاں لوگ محض تفریح اور گھومنے پھرنے کے موڈ میں آتے ہیں اور یہ تمام چیزیں انہیں پسند آتی ہیں۔ شبنم یوں تو خاصی بہادر ہیں (کم از کم ان کا بیان یہی ہے) مگر "ہاؤس آف ہارر" میں ان کی بہادری کا بھرم بھی کھل گیا۔ روبن گھوش ان کے ساتھ ساتھ تھے۔ اچانک انہیں کیا سوجھی کہ چپکے سے آگے چلے گئے۔ ہال کے اندر نیم تاریکی تھی۔ اس لئے شبنم کو پتا بھی نہیں چلا جب وہ ہاؤس آف ہارر کے آخر میں پہنچیں تو انہوں نے اطمینان کی لمبی سانس لی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس خوف ناک جگہ سے نجات ملی۔ اچانک ان کے کان کے پاس منہ لے جا کر روبن گھوش نے ہلکی سی آواز نکالی اور شبنم کی چیخ نکل گئی۔ (اور شاید رونگٹے بھی کھڑے ہو گئے اور ہمیں ایک بار پھر ابراہیم جلیس یاد آ گئے) جہاں تک انسانی جسم کے رونگٹوں کا تعلق ہے اس کے بارے میں ہم اکثر سوچتے رہتے ہیں کہ آخر خوف اور پریشانی کے عالم میں اچانک کھڑے ہو جانے کے سوا ان کا مقصد کیا ہے؟ یہ تو کوئی ڈاکٹر یا ماہر علوم انسانی ہی بتا سکتا ہے کہ ان کی کوئی افادیت بھی ہے یا نہیں مگر جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے ان رونگٹوں کا مقصد وجود ہی یہ ہے کہ دہشت اور خوف کے عالم میں کھڑے ہو جائیں۔ شاید اس طرح خوف کی شدت کم ہو جاتی ہے اور اس کا زیادہ زور جسم کے رونگٹوں کی طرف ہو جاتا ہے اگر یہی خوف کی لہر دل و دماغ کی جانب چل پڑے تو ذرا سوچئے کیا ہو؟ واقعی۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم میں کوئی چیز بھی بے مقصد اور بے ضرورت پیدا نہیں کی ہے۔

نیاگرا ہی میں ہم نے زندگی میں پہلی بار کمپیوٹر سے چلنے والے میوزیکل فوارے دیکھے۔ اب تو یہ عام ہو گئے ہیں مگر اس زمانے میں ایک انوکھی چیز تھے۔ ہاؤس آف ہارر کے سامنے والے باغ میں یہ فوارے نصب تھے۔ مختلف سائز کے فواروں کا پانی باری باری کھلتا تھا اور بند ہوتا تھا' مختلف رنگوں کی روشنیاں جلتی تھیں اور بجھ جاتی تھیں اور اس کے ساتھ ہی فوارے کی حرکت کے مطابق موسیقی بجتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے فوارے رقص کر رہے ہیں۔

جب ہم لوگ گاڑی میں سوار ہو کر واپس ہوئے تو روبن گھوش نے انتہائی سنجیدگی سے کیمرا مین ریاض بخاری کو مخاطب کیا اور کہا "شاہ جی! آپ نیاگرا فال دیکھ لئے ہیں؟"

شاہ جی نے کہا "ہاں' بڑی گریٹ چیز ہے۔ کیا بات ہے نیاگرا فال کی۔"

"آپ نے سارے اینگل دیکھ لئے ہیں کہ کہاں کیمرا رکھیں گے اور کہاں ایکٹر کھڑے کریں گے؟"

"اور کیا؟"

"مگر شاہ جی! آپ یہ سوچئے کہ نیاگرا فال کے اوپر سے شاٹ لینے کے لئے آپ کیمرا کیسے لے جائیں گے؟"

"لے جائیں گے' لے جائیں گے۔ ہم ہیلی کاپٹر لے لیں گے۔"

"یہ تو آپ ٹھیک بولے' مگر یہ بولیں کہ شبنم کو نیاگرا فال پر کیسے کھڑے کریں گے؟"

"کیا مطلب؟" شاہ جی نے پوچھا۔

"پرویز صاحب بول رہے تھے کہ انہیں گانے کا ایک شاٹ فال کے اوپر بھی لینا ہے۔ کیمرا تو آپ ہیلی کاپٹر میں لے جا سکتے ہیں مگر شبنم پانی پر کیسے کھڑی ہو گی۔ پانی کا اسپیڈ آپ نے دیکھا ہے۔ مائی گاڈ۔ ادھر تو کوئی چیز کھڑا نہیں رہ سکتا۔"

شاہ صاحب سچ مچ سوچ میں پڑ گئے۔ "روبن یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ پرویز صاحب آبشار کے اوپر شبنم کا گانا پکچرائز کریں گے؟"

"ہم کو تو وہ یہی بول رہے تھے۔ پر شاہ جی شبنم کو تو سوئمنگ بھی نہیں آتا۔ ادھر پانی میں گر گیا تو کیا کرے گا؟"

شاہ جی خاموش سوچ میں گم ہو گئے۔ "مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"شاہ جی آپ مارلین منرو کا فلم "نیاگرا" نہیں دیکھے۔ ادھر فال کے اوپر رسہ باندھ کے وہ کیسے لٹکتا ہے۔ بڑا بہادر عورت تھا وہ۔ پر یہ شبنم اتنا بہادر عورت نہیں ہے۔"

شاہ جی چند لمحے سوچتے رہے پھر زور سے ہنسے۔ کہنے لگے "روبن۔ باز آ جاؤ تم ان حرکتوں سے۔ تم نے تو ہم کو خواہ مخواہ پریشان کر دیا ارے وہ تو بیک پروجیکشن کا کمال تھا اور ہم کوئی سسپنس فلم تو نہیں بنا رہے ہیں۔ ہمیں آبشار کے اوپر کیمرا لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔"

شبنم جو بہت دیر سے خاموشی سے یہ باتیں سن رہی تھیں۔ کہنے لگیں "شاہ جی'

پرویز صاحب ہم کو بولا تھا کہ وہ اسٹوری میں چینج کرائے ہیں۔ فال کے اوپر ہیلی کاپٹر سے رسہ باندھ کر ہیرو ہیروئین کو لٹکائیں گے۔"

روبن نے کہا "ہیرو' ہیروئن کا کیا جائے گا۔ اس کے لئے تو ڈپلی کیٹ آ جائے گا۔ پر کیمرا مین کا ڈپلی کیٹ تو نہیں ہو گا۔ شاہ جی کو تو کیمرا لے کر خود لٹکنا پڑے گا۔"

شاہ جی مسکرا کر رہ گئے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ روبن ان کی کھنچائی کر رہا ہے۔

مونٹریال' نیاگرا' ٹورنٹو' ہم ہر جگہ ہو آئے تھے مگر فلم سازی کے بارے میں ملاقاتیں بار آور نہیں ہوئی تھیں۔ ہم نے جب یہ منصوبہ نواب صاحب کو بتایا تو انہوں نے بھی اسے پسند کیا۔ مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ اس میں حصے داروں کے طور پر تمام کے تمام پاکستانی حضرات ہوں گے تو وہ چپ ہو گئے۔ پھر بولے "یہ بات البتہ قابل غور ہے۔"

"کس اعتبار سے؟" ہم نے پوچھا۔

"ہمارے پاکستانی لوگ زیادہ بھروسے کے قابل نہیں ہوتے۔ ایک دو کا تو رسک لیا جا سکتا ہے مگر سب کے سب پاکستانی پارٹنر؟ اللہ خیر کرے۔"

ہمیں اس وقت یقین نہیں آیا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ نواب صاحب کیونکہ مستقل گوروں کی صحبت میں رہتے ہیں اس لئے بلا وجہ پاکستانیوں کے بارے میں بے اعتباری کا اظہار کرتے رہتے ہیں مگر بعد میں اندازہ ہوا کہ نواب صاحب کا اندازہ بالکل درست تھا۔ ہم نے بے شمار ڈنر اور لنچ پارٹیاں کھائیں' لاتعداد میٹنگوں میں شرکت کی۔ کار میں سینکڑوں ہزاروں میل سفر کر لیا۔ صرف اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے۔ بے چارے واجد صاحب ہم سے بھی زیادہ سرگرمی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ یہ تجویز ان ہی نے پیش کی تھی اور فلم بنانے کا یہ منصوبہ ان کے خوابوں کی تعبیر تھا۔ ہم سب کو یکجا کرنا اور پھر مختلف تجاویز مرتب کرنا' اعتراضات کے جواب سوچنا اور مشکلات کو حل کرنے کے سلسلے میں ترکیبیں بنانا' اختلاف رائے کی صورت میں مصالحتی فارمولے مرتب کرنا' یہ سب واجد صاحب کے ذمے تھا۔ ہم نے یہ محسوس کیا کہ فلم بنانے کا شوق واجد صاحب کو دیوانگی کی حد تک تھا۔ وہ دوسرے ذرائع سے روزی کماتے تھے اور اگر اپنا یہ وقت اور

صلاحیت اس کام میں صرف کرتے تو خدا جانے کتنی دولت کما لیتے مگر وہ تو "فنافی الفلم" تھے۔ ان کا سوچنا فلم تھا' اوڑھنا بچھونا فلم تھا' کھانا پینا فلم تھا، وہ جو کہتے ہیں کہ بعض لوگوں کو "فلمیریا" کا مرض ہو جاتا ہے۔ واجد صاحب کو دیکھ کر اس کی تصدیق ہو گئی۔
مختصر یہ کہ جب ہم کینیڈا میں ملاقاتوں اور بزنس میٹنگوں سے تنگ آ گئے تو سوچا کہ فی الحال واپس امریکا چلیں۔ ایک دو ماہ بعد یہ منصوبہ عملی شکل اختیار کرے گا تو واپس آ جائیں گے۔ دراصل مشکل یہ تھی کہ تین پاکستانی حصے داروں میں سے ایک صاحب ہیچر مچر کر رہے تھے اور اپنی مصروفیات کے باعث اکثر میٹنگوں سے غیر حاضر رہتے تھے۔ ہم نے تو واجد صاحب سے کہہ دیا تھا کہ یہ ہمیں کچھ سیریس نہیں لگتے مگر ان کا کہنا تھا کہ اس منصوبے کا آغاز ہی ان صاحب نے کیا تھا۔ وہ اس کو پایہ تکمیل تک پہنچائے بغیر نہیں رہیں گے۔ ہم نے ان کے سامنے امریکہ واپس جانے کی تجویز پیش کی جو انہیں بھی بہت معقول نظر آئی۔

کینیڈا سے امریکا واپس جانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ بس کار میں بیٹھیے اور آرام سے امریکا چلے جایئے جس طرح کہ ہم آئے تھے۔ ویزا ہمارے پاس تھا۔ کار ہماری اپنی تھی۔ یہ سفر ہمیں یوں لگتا تھا جیسے کراچی میں ڈیفنس سے چلے اور نارتھ ناظم آباد پہنچ گئے۔ مگر جب وقت آیا تو پتا چلا کہ مقدر اور آب ودانہ بھی کوئی چیز ہے۔ ہمارے مقدر میں تھا کہ کینیڈا میں کچھ اور دن قیام کریں اور ہمارے حصے میں اوٹاوا کا آب و دانہ بھی تھا اس لئے عین وقت پر ایک نئی "سچویشن" پیدا ہو گئی۔ فلموں میں جب اچانک ایسی غیر متوقع سچویشن پیدا ہو جاتی ہے تو فلم کی اصطلاح میں اسے "ٹوسٹ" کہتے ہیں اور فلم دیکھنے والے کہتے ہیں کہ دیکھئے ذرا کہانی نویس نے کیسے اچانک کہانی کو بڑھانے کے لئے ایک نیا بہانہ ڈھونڈ لیا ہے۔ فلم میں تو اسے کہانی نویس کی مہربانی تصور کیا جاتا ہے مگر حقیقی زندگی میں اگر ایسے واقعات رونما ہو جائیں تو اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟
ہوا یہ کہ ہمارا کینیڈا کا ویزا ختم ہونے والا تھا مگر ٹورنٹو کی مصروفیات اور سیرو تفریح سے نجات نہیں مل رہی تھی۔ ہر ایک کا یہی کہنا تھا کہ ویزا کی مدت میں اضافہ کرالو' ورنہ جلدی کیا ہے مدت ختم ہونے سے ایک دن پہلے چلے جانا اور یہ کچھ مشکل بھی نہ تھا۔ نیاگرا کے نزدیک بھی ایک ایگزٹ یعنی امریکا جانے کا راستہ تھا۔ امریکا جانے کے لئے

کینیڈا میں بہت سے راستے ہیں۔ آپ جس راستے سے چاہیں واپس چلے جائیں اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جہاں سے آئے ہیں وہیں سے جائیں۔ چنانچہ ہم نے نیاگرا والے راستے سے واپس جانے کا ارادہ کیا۔ سب لوگوں سے ملے ملائے۔ رخصت ہوئے۔ ہر ایک کو اطمینان تھا کہ چند ہفتے بعد نہیں تو چند ماہ بعد ہم واپس لوٹ آئیں گے۔ نواب صاحب کو حسب معمول اپنے "راؤنڈ دی ورلڈ" سفر پر جانا تھا۔ خوب گلے مل کر رخصت ہوئے۔ ان کے اپارٹمنٹ کی ایک چابی ہماری تحویل میں تھی۔ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ جب رخصت ہوں دفتر فون کر دیں۔ سیکریٹری چابی منگا لے گی۔ واجد صاحب اور دوسرے ہونے والے حصے داروں سے بھی الوداعی دعوتیں کھائیں۔ ان میں' ایک صاحب حسب معمول ٹورنٹو میں موجود نہیں تھے۔ مگر باقی دو حضرات کا کہنا تھا کہ آپ فکر نہ کریں۔ وہ تو فلم بنانے کے لئے ہم سے بھی زیادہ سنجیدہ ہیں۔ بس ذرا مصروفیات کے باعث مجبور ہیں۔ صورت حال یہ تھی کہ تفصیلی گفتگو کے بعد کمپنی کے بارے میں تمام کاغذات وکیل صاحب نے تیار کر دیے تھے۔ میگ سے ہماری ان ہی کے دفتر میں ایک ملاقات ہوئی تھی۔ فون پر بھی دو بار گفتگو ہوئی۔ اب صرف دیر اس بات کی تھی کہ سارے حصے دار کاغذات پر دستخط کر دیں تاکہ مزید قانونی کارروائی شروع کی جائے۔ ہم نے صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک تمام قانونی لوازمات پورے نہیں ہوں گے ہم فلم کے سلسلے میں کوئی کام شروع نہیں کریں گے حالانکہ دوسرے سب لوگوں کی خواہش تھی کہ جھٹ پٹ کہانی اور اسکرپٹ مکمل کر کے دوسرے اقدامات شروع کر دیے جائیں۔ جاوید ہاشمی نے رخصتی کھانا دیا۔ اور لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ چند ہفتے بعد تو آپ آنے ہی والے ہیں۔ اگلی دعوت آپ کے اپنے گھر پر ہو گی۔ انہوں نے اس سلسلے میں کھانے کا مینو بھی ہماری بیگم کو بتا دیا۔ جمیل مراد صاحب بہت بے تاب تھے اور ہمیں بار بار فون کر کے یاد دہانی کراتے تھے کہ مسز ہف کے بارے میں آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے اگر آپ چاہیں گے تو وہ شوٹنگ کے لئے اپنے محل کے کرائے میں کچھ اور کمی کر دیں گی۔ اور ہم انہیں بار بار یہی بتا رہے تھے کہ بندہ خدا جب تک کہانی نہ لکھی جائے لوکیشنز کے بارے میں فیصلہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟
اس درمیان میں ہم آپ کو رنگین ترین کردار کڈنی کے بارے میں بتانا ہی بھول

گئے۔ دراصل بات یہ ہے کہ وہاں وقت اتنا کم اور مصروفیات (کاروباری اور سوشل) اتنی زیادہ تھیں کہ کسی کو یاد رکھنا بھی مشکل تھا اور بقول یہ عالم تھا کہ ؎

کسے یاد رکھوں، کسے بھول جاؤں؟

ایک روز صبح سویرے منصور صاحب کا فون آیا۔ شکوہ شکایت کے بعد انہوں نے ہمیں بتایا کہ ایک شخص جسے آپ بھول گئے ہیں فون پر آپ سے بات کرنے کا خواہش مند ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے فون کسی اور کے حوالے کردیا۔ دوسری جانب سے ایک انتہائی شیریں اور ملائم آواز آئی۔ یہ مس کڈنی تھیں۔

کہنے لگیں "ہائی علی! کیا مجھے بھول گئے۔ میں کڈنی ہوں؟"

ہم نے کہا؟ آپ کو بھلا کوئی کیسے بھول سکتا ہے۔ کڈنی کے بغیر تو انسان کا زندہ رہنا ہی مشکل بلکہ ناممکن ہے۔"

ہنسنے لگیں۔ بولیں "اس کے بعد پھر تم نے خبر ہی نہیں لی۔ اگر آج شام خالی ہو تو کھانا میرے ساتھ کھاؤ" شام تو خالی تھی مگر ہم کو قدرے تکلف سا ہوا۔ ہماری ہچکچاہٹ ہی سے وہ بھانپ گئیں اور کہنے لگیں "بس تو آج شام کا کھانا پکا ہوگیا۔ میں چھ بجے تمہیں لینے آجاؤں گی۔" یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کردیا۔

جہاں تک مس کڈنی کی شخصیت کا تعلق ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ سراپا حسن و شباب تھیں اور صحیح معنوں میں کوئی چیز تھیں۔ ہمیں اچھی بھی بہت لگی تھیں مگر ان کے انداز و اطوار اور پھر ان کی شہرت کے بارے میں سنا تو ہم پریشان ہوگئے۔ ہم نے کسی بھی قسم کی خاتون سے ملنے اور کسی بھی جگہ جانے میں کبھی تامل نہیں کیا۔ ہوش سنبھالتے ہی ہم کیسے کیسے لوگوں سے ملے اور کہاں کہاں پہنچے یہ ایک علیحدہ داستان ہے۔ خوبصورت چہرے اور خوب صورت لوگ ہمیشہ سے ہماری کمزوری رہے ہیں۔ اچھی محفلیں ہمارے اندر مسرت کا احساس پیدا کردیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے تجربات اور مشاہدات کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ اس کے باوجود ہمارے ذہن نے جائز اور ناجائز کے مابین، شروع ہی سے ایک حد فاصل قائم کر رکھی ہے۔ خدا جانے یہ فطری عمل ہے یا ہماری ابتدائی تعلیم و تربیت اور گھریلو ماحول کا اعجاز ہے کہ ہم عین وقت پر بھٹکتے بھٹکتے رہ گئے حالانکہ بعض اوقات ہم یہ سوچ کر پشیمان بھی ہوئے کہ کیا حرج تھا اگر موقع سے فائدہ اٹھالیتے۔

اب بھی جب پرانے زمانوں کے واقعات کی طلسم ہو شربا کے اوراق ہمارے ذہن میں تیزی سے پلٹتے ہیں تو ہم اکثر سوچا کرتے ہیں کہ کہیں جائز و ناجائز کے خیال سے ایسے حسین مواقع چھوڑ کر ہم نے کوئی غلطی تو نہیں کی؟ اب آپ کو یہ بتائیں کہ مس کڈنی جیسی ہستی ہم نے غیر ملکی سیاحت کے دوران میں بھی بہت کم دیکھی اور ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ ایسی ہستیوں تک رسائی کتنی مشکل ہے۔ خود ٹورنٹو میں کتنے دولت مند اور با رسوخ لوگ ہوں گے جو ان کی ایک نگاہِ التفات کے محتاج و منتظر ہوں گے اور یہ سراپا جمال ہمارے لئے مجسم مہرو کرم بھی بنی ہوئی تھیں اور ہم انہیں نظرانداز کر رہے تھے۔ یہ ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ان سے ملنے اور انہیں دیکھنے کی خواہش بھی ہمارے دل میں تھی۔ اس لئے شام کو پونے چھ بجے جب ہم وہائٹ ٹاور بلڈنگ کے نیچے ان کے انتظار میں ٹہل رہے تھے تو ایک عجیب سی سرخوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ ٹہلتے ہوئے ہم اس سڑک کے آخری حصے تک چلے گئے۔ اس کارنر پر ایک پیزا کی دکان تھی جس میں ایک نوجوان اور خوش شکل اطالوی ہر وقت پیزا بنانے میں مصروف نظر آتا تھا۔ شاید پیزا بنانے سے زیادہ وہ تماشا دکھانے میں دلچسپی رکھتا تھا اور بہت سے راہ گیر فٹ پاتھ پر یہ تماشا دیکھنے کے لئے رک جاتے تھے۔ وہ پیزا کے پیڑے کو اٹھا کر اپنی انگلیوں میں پھیلاتا اور پھر اسے فضا میں اچھا کر اسی ہاتھ کی انگلیوں سے تھام لیتا تو اس کا سائز خود بخود پھیل کر بڑا ہو جاتا تھا۔ وہ اسے گھما کر ایک بار پھر فضا میں اچھالتا اور دونوں ہاتھوں سے کیچ کرلیتا۔ لیجئے فل سائز کا پیزا بن گیا۔ پھر وہ اس پر اور دوسری چیزیں سجاتا اور اسے بجلی کے تنور میں رکھ کر دوسرے پیڑے کو اٹھا لیتا۔ یہ تمام عمل اتنا دلچسپ اور انوکھا تھا کہ راستہ چلتے لوگ تماشا دیکھنے کو رک جاتے تھے۔ رکنے کی وجہ محض یہ تماشا نہیں تھا۔ ایک دوسرا اور ہمارے خیال میں زیادہ اہم سبب اس کی انتہائی خوب صورت بیوی بھی تھی۔ وہ اطالوی حسن و جمال اور تندرستی کا جیتا جاگتا نمونہ تھی۔ کم بخت لباس بھی ایسا پہنتی تھی کہ گئے زمانوں کی مشہور فلمی ہیروئنوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ وہ تمام وقت میدے کے پیڑے بنانے میں مصروف رہتی تھی یا پھر فریج میں سے اور دوسرا سامان نکال نکال کر اپنے شوہر کے سامنے رکھتی جاتی تھی مگر اس تمام عرصے میں اس کی نگاہیں باہر سڑک کی جانب لگی رہتی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر ایک شریر اور معنی خیز مسکراہٹ

کھیلتی رہتی تھی اور جب وقفے وقفے سے وہ باہر کھڑے لوگوں کی جانب ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر شوخی سے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر مسکراتی تو صوفیہ لورین' جینا لولو بریجیڈا وغیرہ اس کے آگے پانی بھرتی ہوئی نظر آتیں (چشم تصور میں) ہم حیران تھے کہ اس نے اپنے ملک میں فلمی دنیا کا رخ کیوں نہیں کیا؟ اس غریب نوجوان سے شادی کر کے اپنی سر زمین چھوڑ کر اتنی دور ٹورنٹو کی اس گلی کے نکڑ والے چھوٹے سے پیزا ہاؤس میں کیوں چلی آئی؟

یکایک ایک کار کے ہارن کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ ان ملکوں میں کار کا ہارن ایسی چیز ہے جس کی ہلکی سی آواز سن کر بھی سب کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دیکھا تو فٹ پاتھ کے ساتھ ہلکے نیلے رنگ کی کار میں مس کڈنی بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔ سب کی نگاہیں اس طرف اٹھ چکی تھیں اور وہاں جو کچھ نظر آیا تھا اسے دیکھ کر وہیں منجمد ہو کر رہ گئی تھیں۔ ہم تیزی سے ان کی جانب بڑھے اور کار کی اگلی نشست پر ان کے برابر بیٹھ گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید مسٹر منصور بھی ان کے ہمراہ ہوں گے مگر وہ کار میں تنہا تھیں۔ ہلکے نیلے رنگ کے لباس میں وہ جھیل کے نیلے پانی میں سے ابھرتی ہوئی ایک حسین جل پری لگ رہی تھیں۔ لباس بہت خوب صورت تھا۔ بازو اور گلے پر سے کافی کھلا ہوا تھا مگر پہلے دن والے ڈریس کے مقابلے میں بہت زیادہ معقول اور سوبر تھا۔

کڈنی نے کوئی سوال کئے بغیر کار چلا دی۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ اس نے کار کے اگلے حصے میں لگے ہوئے سنہری سگریٹ کیس میں سے ایک سگریٹ نکالی اور ہونٹوں میں دبا لی۔ پھر اس نے کار کا سگریٹ لائٹر انگلی سے دبا دیا اور چند لمحے بعد اسے نکال کر اپنی سگریٹ سلگا لی۔

"میں نے سنا ہے تم امریکا جا رہے ہو؟"

"ہوں۔"

"منصور نے مجھے بتایا تھا۔ واپس آ کر فلم بناؤ گے؟"

ہم نے پھر سر ہلا دیا۔

"ڈنر کے لئے کہاں جانا پسند کرو گے۔ ریستوران میں یا میرے اپارٹمنٹ پر؟"

ہم نے کہا "چائنیز بہتر رہے گا۔"

کہنے لگی "ٹھیک ہے پھر کافی کے لئے کہیں دور چلیں گے۔"

ہم نے کہا "مس کڈنی! دراصل ہمیں جانے سے پہلے بہت سے کام کرنے ہیں۔ وقت بہت کم ہے۔ اس لئے مجھے جلدی واپس جانا ہے۔"

"او کے۔" وہ ہنس پڑی۔

چائنیز ریستوران میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ وہاں کا اسٹاف کڈنی کو بہت اچھی طرح جانتا تھا اور اس کے آگے پیچھے پھر رہا تھا۔

کھانے کا آرڈر دینے کے بعد ویٹر نے ڈرنکس کے لئے پوچھا۔ ہمارے لئے کوک اور خود اپنے لئے شیمپین کا آرڈر دینے کے بعد کڈنی نے مطلب کی بات شروع کی اور براہ راست سوال کیا

"علی! کیا تم مجھے جانی لمبارڈی سے متعارف کرا دو گے؟"

ہماری سمجھ میں نہیں آیا' کیا کہیں۔ پھر ہم نے کہا "دیکھو کڈنی! جانی سے میری ذاتی جان پہچان نہیں ہے۔ وہ تو میرے ایک دوست کا ملاقاتی ہے ظاہر ہے کہ میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ۔"

"ٹھیک ہے' میں سمجھ گئی۔" وہ مسکرانے لگی۔ "مگر تم بھی تو اپنی فلم بناؤ گے۔ کیا اس میں مجھے کام کرنے کا موقع ملے گا؟"

ہم نے کہا "کڈنی! میری فلم تو اردو میں ہو گی۔ ہماری اپنی زبان میں اس کی نمائش بھی ہمارے ملک میں ہی ہو گی۔ تم تو اردو جانتی بھی نہیں ہو۔"

وہ کچھ دیر چپ رہی پھر کہنے لگی۔ "ٹھیک ہے میں سمجھ گئی۔"

ہم نے کہا "کڈنی! آخر تمہیں فلم میں کام کرنے کا اتنا شوق کیوں ہے؟ تمہارے پاس سب کچھ تو ہے۔"

کہنے لگی "علی شو بزنس کی بات ہی اور ہے۔ اس کا اپنا ہی نشہ ہے۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرے پاس سب کچھ ہے مگر شہرت تو نہیں ہے۔ کون جانتا ہے مجھے چند لوگوں کے سوا؟"

ہم نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

اس نے شیمپین کا جام اٹھا کر ایک ہی سانس میں ختم کر دیا اور پھر کسی کو مخاطب

کئے بغیر کہنے لگی "سب کچھ ہے میرے پاس مگر کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ ماں باپ' نہ شوہر' نہ اولاد' نہ سچے دوست' جو بھی دوست ہے بس کچھ دیر کا ہے اور اپنے مطلب کا ہے۔ تنہائی کے سوا میرا کون ساتھی ہے؟"

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟" ہم نے پوچھا۔

"شادی تو میرے لئے سب سے آسان کام ہے' مگر وہ میری پرابلمز کا حل تو نہیں ہے۔"

واقعی دنیا میں لوگوں کی کیسی کیسی پرابلمز ہوتی ہیں۔ ہم نے سوچا۔

کھانا ہم دونوں نے قریب قریب خاموشی میں کھایا اور جب کڈنی نے ہمیں اپارٹمنٹ کے باہر ڈراپ کیا اور کھڑکی سے سر باہر نکال کر "گڈ بائی" کہہ کر ہاتھ ہلایا تو وہ حقیقی معنوں میں الوداع تھا۔ کڈنی سے وہ ہماری آخری ملاقات تھی۔

ٹورنٹو سے ہم دس بجے کے قریب روانہ ہوئے۔ اس سے پہلے نواب صاحب کی سیکریٹری کا بھیجا ہوا ایک شخص ہم سے اپارٹمنٹ کی چابی لے گیا تھا۔ کار میں سامان رکھا جا چکا تھا۔ بچیوں نے پچھلی نشست کو بند کر کے اپنے لئے کشادہ جگہ بنا لی اور وہاں اپنے من پسند کھیل شروع کر دیے۔ ہم نے ایکسپریس وے کا رخ کیا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم نیاگرا فال کے ایگزٹ پر پہنچ گئے۔ ہم نے اپنا بریف کیس سنبھالا اور امیگریشن آفس میں داخل ہو گئے۔ کاؤنٹر پر ایک نوجوان لڑکے کے سوا دفتر میں اور کوئی نہیں تھا۔ ہم نے بریف کیس کھول کر اس میں سے پاسپورٹ نکال کر امیگریشن افسر کے سامنے رکھ دیے۔ اس نے پاسپورٹ اٹھانے سے پہلے بریف کیس میں رکھی ہوئی بینکوں کی چیک بکس پر ایک نگاہ ڈالی۔ پھر پاسپورٹ پر ثبت مہروں کو دیکھا اور ہم سے پوچھا "سر! آپ امریکا میں کب سے ہیں؟"

ہم نے بتا دیا۔

"وہاں آپ کیا کرتے ہیں؟"

ہم نے اس کا جواب بھی دے دیا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے پاسپورٹ پر دوسری نظر ڈالی اور پھر معذرت کر کے اندر چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک سانولی رنگت کے ادھیڑ عمر صاحب تھے۔ انہوں نے بھی ہم سے وہی سوالات کئے اور پھر کہا "مجھے افسوس ہے کہ آپ اس ویزا کے ذریعے امریکا میں داخل نہیں ہو سکتے۔ آپ وہاں غیر قانونی طور پر کام کرتے رہے ہیں۔ حالانکہ اس مقصد کے لئے آپ کے پاس دوسرا ویزا ہونا چاہئے تھا۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ہمارے پاس بزنس ویزا ہے اور پانچ سال کے عرصے کے لئے ہے مگر انہوں نے ہماری بات سننے سے انکار کر دیا۔ کافی جھگڑا بھی ہوا۔ دلیلیں

بھی دی گئیں مگر بے سود، انہیں بھی شاید ضد ہو گئی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم امریکا میں داخل نہیں ہو سکتے۔

ہم نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے، وہاں ہمارا گھر ہے، بزنس ہے بچیاں اسکول میں پڑھتی ہیں۔ ہم کچھ عرصے بعد امریکا سے چلے جائیں گے مگر اس سے پہلے ہمارا ایک بار امریکا جانا بہت ضروری ہے۔"

وہ صاحب جس ذہنیت کا اظہار کر رہے تھے اس کے پیش نظر ہمیں خیال ہوا کہ شاید وہ کوئی بھارتی ہیں اور جان بوجھ کر ہمیں پریشان کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا اصرار تھا کہ اگر ہمیں امریکا جانا ہے تو کینیڈا سے واپس پاکستان جائیں اور وہاں سے دوسرا ویزا لے کر آئیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ناقابل عمل مشورہ تھا۔ کافی جھک جھک کے باوجود کچھ حاصل نہ ہوا تو ہم نے اپنے پاسپورٹ سنبھالے اور دفتر سے باہر چلے گئے۔ یہ ایک عجیب و غریب صورت حال تھی۔ مشکل یہ تھی کہ ہمارا کینیڈا کا ویزا بھی دو دن کے بعد ختم ہو رہا تھا۔ ہم نہ تو امریکا جا سکتے تھے اور نہ ہی دو دن سے زیادہ کینیڈا میں رہ سکتے تھے۔

جب ہم نے کار میں واپس جا کر یہ صورت حال لبنیٰ کو بتائی تو وہ بھی پریشان ہو گئی۔ بچیوں کو البتہ کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ یہ سن کر خوش ہو گئی تھیں کہ ہم ابھی چند دن ٹورنٹو میں ہی رہیں گے۔ ابھی ہم کار میں بیٹھے اس مسئلے کے بارے میں غور ہی کر رہے تھے کہ امیگریشن آفس سے نوجوان لڑکا نکل کر آیا اور ہمارے ساتھ اظہار ہمدردی کرنے کے بعد کہنے لگا "میری مانئے تو آپ امریکی ویزا کے بدلے سب سے پہلے کینیڈا کے ویزا میں توسیع کرائیے ورنہ پریشانی میں پھنس جائیں گے۔"

ہم نے کہا "پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم ہمارے پاسپورٹ لے کر اندر کیوں گئے تھے؟"

کہنے لگا "وہ میرا باس ہے اور اس کا آرڈر ہے کہ پاکستانی پاسپورٹ ہولڈر کے بارے میں اسے ضرور مطلع کروں۔"

ہم نے پوچھا "کیا یہ انڈین ہے؟"

کہنے لگا "جی نہیں۔ ہے تو گوئٹے مالا کا مگر نسل کے اعتبار سے انڈین ہے۔"

ہم نے غصے میں اس کی شان میں کچھ گستاخیاں کر ڈالیں۔

لڑکا کہنے لگا "آپ کے پاس ایک اور ذریعہ یہ بھی ہے کہ اس فیصلے کے خلاف اپیل کر دیجئے۔ حکومت ایک کمیشن مقرر کر دے گی جو اسی مقام پر اس بارے میں تمام کوائف سن کر فیصلہ کر دے گا لیکن اگر فیصلہ آپ کے خلاف ہوا تو پھر آپ کو پاکستان جا کر ہی نیا ویزا لانا ہو گا، مگر سب سے پہلے آپ کینیڈا کے ویزے میں توسیع کرائیے۔"

ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ کافی ہمدرد شخص تھا۔ مگر اس نے ہمیں وہ مشورہ نہیں دیا جو کہ دینا چاہئے تھا۔ وہ یہ کہ ہم اگر کسی اور ایگزٹ سے امریکا جانا چاہیں تو قسمت آزمائی کر سکتے ہیں کیونکہ ہمارے پاسپورٹ پر ان لوگوں نے کوئی نشان نہیں لگایا تھا اور یہ چانس لے کر شاید ہم آسانی سے امریکا جا سکتے تھے۔ مگر جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں ابھی ہمارا کینیڈا کا آب و دانہ ختم نہیں ہوا تھا۔ ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور واپس ٹورنٹو روانہ ہو گئے۔

سب سے پہلے ہم کینیڈا کا ویزا بڑھوانے کے لئے متعلقہ دفتر میں پہنچے۔ وہاں ایک ہمدرد اور خلیق قسم کی خاتون نے اطلاع دی کہ ویزا میں توسیع کے لئے آپ کو اوٹاوا جانا پڑے گا کیونکہ وہی حکومت کینیڈا کا دارالحکومت ہے۔ امریکی ویزا آفس گئے تو وہاں ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ ہماری باری آئی تو کھڑکی پر موجود بلیک خاتون نے ہمارے پاسپورٹوں پر ایک نظر ڈالی اور بولیں "کیا خرابی ہے؟ ویزا لگا ہوا تو ہے۔ آپ اور کیا چاہتے ہیں؟" ہم نے جب انہیں صورت حال سمجھائی تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ میز کی دراز میں سے ایک چیونگ نکال کر کھائی۔ ایک ہمیں پیش کی۔ پھر پاسپورٹ پر نظر ڈال کر بولی "آپ کے ساتھ تو دو بچیاں بھی ہیں؟"

ہم نے کہا "جی ہاں۔"

کہنے لگیں "یہ دو چیونگ گم آپ میری طرف سے انہیں دے دیجئے گا۔"

ہم نے شکریہ ادا کیا اور کہا "مگر ہماری مسز بھی ہمارے ساتھ ہیں باہر کار میں بیٹھی ہیں۔"

سوری کہہ کر انہوں نے ایک اور چیونگم ہمارے حوالے کر دی پھر کہنے لگیں "سنئے میرا خیال ہے کہ آپ کے تمام مسائل کا حل اوٹاوہ میں ہے۔ وہیں سے آپ کا نیا ویزا بنے گا۔ اور وہیں سے آپ کے ویزا میں توسیع ہو گی۔ اس لئے اپنی کار کا رخ اوٹاوہ کی جانب کر لیجئے۔"

ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ پھر پوچھا "ہم آپ کا نام جان سکتے ہیں؟"

بولیں "نام جان کر کیا کریں گے؟"

ہم نے کہا "یاد رکھیں گے کہ مشکل کے وقت کسی نے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔"

مسکرا کر بولیں "میرا نام جوئز ہے۔ بشرطیکہ آپ سچ مچ یاد رکھ سکیں۔"

ہم نے اس کے بعد کسی اور سے مشورہ لینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ کینیڈا کا نقشہ نکالا اوٹاوہ کے راستوں کو یاد کیا اور ٹورنٹو سے اوٹاوہ روانہ ہو گئے۔

موسم گرما اختتام پر تھا مگر درختوں پر پوری بہار تھی۔ اوٹاوہ سے ٹورنٹو کا راستہ زیادہ پیچیدہ نہیں ہے اور بے حد خوب صورت ہے۔ سبزہ' درخت جن پر مختلف رنگوں کے پتوں نے ایک عجیب سا نکھار پیدا کر دیا تھا۔

ٹورنٹو سے روانہ ہونے سے پہلے ہم نے اوٹاوہ میں فلم ساز و تقسیم کار چوہدری ثنا اللہ کے داماد جاوید کو ٹیلی فون کر دیا تھا۔ اس سے پہلے' الٹی گنگا بہتی رہی تھی۔ اوٹاوہ سے جاوید اور ان کی بیگم شاہین فون پر یہ فرمائش کر رہے تھے کہ ہم سے ملے بغیر امریکا جائیں گے تو ہم سے برا کوئی نہ ہو گا مگر ہم اپنی فلمی سرگرمیوں میں مصروف رہنے کے باعث ان کے پاس جانے کے لئے وقت نہیں نکال سکے تھے مگر اب اس ناگہانی آفت کی وجہ سے اوٹاوہ جانا پڑ گیا تھا وہ بہت بے چینی سے منتظر تھے۔ راستے کے بارے میں کچھ تفصیلات جاوید چوہدری نے بھی بتا دی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ راستہ بے حد حسین تھا۔ خوب صورت اور رنگین لینڈ اسکیپ حد نگاہ تک پھیلے ہوئے سبزہ زار' اور ان سب سے بڑھ کر مختلف رنگوں میں ملبوس قد آور درخت جو ٹیکنی کلر جنگلوں کے مانند بہت دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ مگر ہماری توجہ اپنے فوری مسائل پر مرکوز تھی۔ اس لئے ان نظاروں سے صحیح معنوں میں لطف اندوز نہیں ہو سکے۔ راستے میں کئی جگہ اوور اسپیڈنگ بھی کی مگر شکر ہے کہ کسی پولیس والے سے ملاقات نہ ہوئی ورنہ چالیس پچاس ڈالر جرمانہ بھی ہو جاتا۔

دو گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد جان سنز کے سر راہ ہوٹل میں کافی پینے کے لئے ٹھہرے تو وہاں ایک ہندوستانی خاندان سے ملاقات ہو گئی۔ ہوا یہ کہ وہ ہمیں ہندوستانی سمجھے اور ہم انہیں پاکستانی سمجھ کر ان کے پاس چلے گئے۔ اصلیت کا پتا چلا تو پہلے تو اخلاقاً

بات چیت ہوتی رہی پھر سچ مچ بہت اچھی گفتگو رہی۔ یہ لوگ لدھیانے کے تھے اور سیاحت کے لئے کینیڈا آئے ہوئے تھے۔ مگر راولپنڈی کے شرنارتھی بھی تھے اس لئے تمام وقت پنڈی اسلام آباد کے بارے میں ہی پوچھتے رہے۔ سیلف سروس ریستوران میں ہم نے جو کھانے پینے کی چیزیں خریدیں ان کا بل بہت اصرار کر کے انہوں نے ادا کیا۔ اس پر بھی بس نہیں کیا ہماری بچیوں کو تحائف بھی خرید کر دیے اور یہ فرمائش کی کہ آئندہ جب کبھی راولپنڈی جانا تو لال کرتی میں ہمارے آبائی گھر کی خبر ضرور لے لینا اور پھر ہمیں اس پتے پر خط لکھنا۔ ان کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ پاکستان واپسی پر ہم نے بڑے اہتمام کے ساتھ ان کی فرمائش بھی پوری کر دی بلکہ ان کے گھر کی تصویریں بھی انہیں ارسال کر دیں۔ گھر کے موجودہ مکین کی تصویر اور نیک خواہشات کا پیغام بھی اس خط کے ہمراہ تھا۔ جواب میں ان کا بہت لمبا چوڑا شکریے کا خط آیا اور یہ دعوت نامہ بھی انہوں نے بھیجا کہ جب بھی انڈیا آئیں تو ہمارے پاس ضرور چند روز قیام کریں۔

وہ لوگ ٹورنٹو جا رہے تھے اس لئے پارکنگ پر الوداع کہہ کر ہم اپنے اپنے راستوں پر چل پڑے۔ اوٹاوہ کے راستے میں کئی مقامات پر سڑک کافی تنگ ہو جاتی ہے مگر ٹریفک میں کہیں رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ ہم اوٹاوہ سے تیس چالیس کلو میٹر کے فاصلے پر تھے کہ گہرے بادلوں اور ٹھنڈی ہواؤں نے گھیر لیا اور پھر موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ ایک دم اتنی زیادہ سردی ہو گئی کہ ہمیں کار کا ہیٹر آن کرنا پڑا۔

شام کو سات بجے کے قریب جب ہم اوٹاوہ کی ایک نواحی بستی میں سیدھے جاوید چوہدری کے مکان پر پہنچے تو وہاں بھی بارش کا سلسلہ جاری تھا اور سب گھر والے گرم کپڑوں میں ملبوس تھے۔

علیک سلیک کے بعد فوراً کافی پی گئی اور ہم نے تمام صورت حال جاوید چوہدری صاحب کے گوش گزار کر دی اور اگلے روز کے لئے تمام پروگرام تفصیلی طور پر بنا لیا گیا۔ جاوید صاحب نے اس اثنا میں چند پاکستانی دوستوں اور پاکستانی سفارت خانے میں بھی ٹیلی فون کر دیے تھے۔ انہوں نے ہمیں اس قدر تفصیل کے ساتھ تسلی دی کہ ہماری پریشانی وقتی طور پر دور ہو گئی۔ چنانچہ رات کو کھانے کے بعد تہہ خانے میں جاوید چوہدری صاحب کی گلوکاری سے لطف اندوز ہوئے۔ اس کے بعد لطیفہ بازی کی محفل بجی جو دو بجے تک

جاری رہی۔ دوسرے دن صبح اٹھے تو شدید بارش ہو رہی تھی اور سردی بھی کڑاکے کی تھی۔ یوں سمجھئے کہ لاہور میں سردی کے موسم میں جتنی سردی پڑتی ہے اوٹاوہ میں گرمی کے موسم میں اس سے کہیں زیادہ تھی۔ جاوید صاحب نے فوراً اپنا ایک اوور کوٹ، مفلر اور برساتی ہماری نذر کی۔ ہمارا سب سے پہلا ہدف کینیڈین امیگریشن آفس تھا۔ پارکنگ میں کار کھڑی کی تو بارش نے کچھ زیادہ ہی شرارت شروع کر دی۔ بھیگتے اور سردی پر ٹھٹھرتے ہوئے دفتر کی چوتھی منزل پر پہنچے۔ وہاں ایک لمبی تڑنگی خاتون کاؤنٹر پر موجود تھیں۔ ہم نے فارم پُر کر کے ان کی خدمت میں پیش کیا۔ انہوں نے پاسپورٹ پر ایک نظر ڈالی۔ پھر پوچھا "آپ کتنے دن ٹھہرنا چاہتے ہیں؟"

ہم نے کہا ایک ہفتہ کافی ہو گا۔"

وہ مسکرائیں۔ کہنے لگیں "کینیڈا بہت بڑا ملک ہے۔ اسے دیکھنے کے لئے وقت بھی بہت زیادہ ہونا چاہیئے۔" یہ کہہ کر انہوں نے دو ماہ کا ویزا لگا کر پاسپورٹ ،ہمارے سپرد کیا۔ پھر پوچھا "اوٹاوہ کیسا لگا؟"

ہم نے کہا "ابھی دیکھا ہی کہاں ہے۔ رات ہی کو آئے ہیں۔ باہر اتنی تیز بارش ہو رہی ہے۔ سردی بھی بہت زیادہ ہے۔"

کہنے لگیں "اگر کبھی سردیوں میں آئیں گے تو آپ کی کیا حالت ہو گی۔ یہ تو ہمارا موسم گرما ہے۔"

چلئے ایک مرحلہ تو طے ہوا۔ اب امریکی ویزا آفس کی باری تھی۔ جاوید چوہدری صاحب خالص پاکستانی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں پاکستانی سفارت خانے میں لے گئے۔ سب سے گرم جوشی سے ملاقات ہوئی۔ ہماری بپتا سن کر سفارت خانے والوں نے امریکی ویزا آفیسر کو ایک سفارشی ٹیلی فون داغ دیا اور ہمیں نیک خواہشات کے ساتھ رخصت کیا۔

امریکی ویزا آفس کے باہر بھی بارش ہو رہی تھی۔ ہم نے عمارت کے سامنے والی دکان سے احتیاطاً تصویریں بنوائیں اور اوپر پہنچ گئے۔ سیکورٹی پر مامور ایک صاحب سے مس لیک نامرا کا پتا پوچھا جن سے ہمیں رابطہ قائم کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ وہ ہمیں ایک کھڑکی پر لے گئے۔ وہاں ایک نہایت اسمارٹ، انتہائی خوب صورت، بہت ہی پر کشش ایک بلیک خاتون اس طرح کھڑی تھیں جیسے کسی مقابلہ حسن میں شریک ہونے کے لئے آئی ہیں۔ ہم نے ان کے سامنے اپنا فارم اور پاسپورٹ رکھ دیا۔

انہوں نے ایک نظر ڈالی اور مسکرائیں۔ "اوہ علی، مجھے خبر مل چکی ہے۔ کیا پرابلم ہے؟"

ہم نے مختصراً پرابلم بتائی تو وہ سوچ میں گھر گئیں۔ بولیں "ایک پانچ سال کا ویزا تو آپ کے پاسپورٹ پر لگا ہوا ہے۔ دوسرا ویزا کیسے دیا جائے؟"

ہم نے کہا "دیکھو مس میک نامرا۔ ہمیں ہر صورت میں ویزا چاہئے۔"

وہ ہمارے کاغذات لے کر اندر غائب ہو گئیں۔ چند منٹ بعد واپس آئیں کہنے لگیں "دیکھو علی میں تمہیں ایک مہینہ کا ویزا دے رہی ہوں اگر تم امریکا پہنچ گئے تو تمہاری قسمت اگر کوئی رکاوٹ پیدا ہو گئی تو پھر تمہیں اولڈ مین کے سوا کوئی اور امریکا جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

ہم نے کہا "کون اولڈ مین؟"

بولیں "تمہاری برادری کا آدمی ہے۔ واشنگٹن میں رہتا ہے۔ گھر کا پتا ہے وائٹ ہاؤس۔" یہ کہہ کر انہوں نے آسمان کی جانب دیکھ کر اپنی آنکھیں گھمائیں اور ایک مہینے کا ویزا ہمارے پاسپورٹ پر ٹھونک دیا۔ پھر ایک سرد آہ بھر کر اپنے کاندھے اچکائے اور کہا "میں تمہارے لئے دعا کرتی ہوں۔ تم میرے لئے کرنا۔ اوکے۔"

ہم نے کہا "اوکے۔" پھر چلتے چلتے ہم نے کہا "اگر اعتراض نہ ہو تو کچھ عرض کریں۔"

بولیں "تمہارا کام تو ہو گیا ہے۔ اب جو تمہاری مرضی۔"

ہم نے کہا "آپ مس ہیں یا مسز؟"

مسکرا کر بولیں "ایسے ذاتی سوالات لڑکیوں سے نہیں پوچھتے اور پھر تم تو شادی شدہ ہو۔"

ہم نے کہا "پھر بھی بتانے میں کیا حرج ہے؟"

شوخی سے کہنے لگیں "ابھی شادی نہیں کی۔ تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

ہم نے کہا "ہمیں اس شخص پر رشک آ رہا ہے جو اتنی خوب صورت اور خوش

مزاج لڑکی کا شوہر ہو گا۔"

وہ ہنس پڑی کہنے لگی "شکریہ' تم سے ذرا دیر میں ملاقات ہوئی۔ خیر' اگلی بار آؤ گے تو دیکھا جائے گا۔ آخر امید پر دنیا قائم ہے۔"

ہمارے سینے پر سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ اس کے بعد اوٹاوہ میں دو دن اور گزارے۔ فلم کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ جاوید چوہدری محکمہ خزانہ میں کام کرتے تھے مگر موسیقی اور فلموں کے شوقین تھے۔ کہنے لگے "آفاقی صاحب آپ کی فلم اگر بنے تو مجھے بھی ساتھ رکھیں گے نا؟"

ہم نے کہا "کیوں نہیں۔ اتنا بڑا کام کرانے کے بعد رشوت تو دینی ہی پڑے گی نا۔"

دو دن بعد ہم اوٹاوہ سے چلے تو ہمارا رخ ٹورنٹو کی جانب نہیں تھا۔ اوٹاوہ کے ایک نزدیکی ایگزٹ سے ہم نے سرحد عبور کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ امیگریشن پوسٹ پر پہنچے تو ہمارے ہاتھ پیر پھولے ہوئے تھے۔ اندیشہ یہ تھا کہ اگر کسی نے پاسپورٹ کو بغور دیکھا اور بیک وقت دو ویزا نظر آ گئے تو ہم کیا جواب دیں گے؟

دوپہر کا وقت تھا اور امیگریشن آفس میں صرف ایک لمبے چوڑے صاحب موجود تھے۔ ہمیں دیکھا تو خالص امریکی انداز میں بولے "اوہ موت اور ٹورسٹ کا کوئی پتا نہیں ہوتا۔"

ہم نے پاسپورٹ ان کے سامنے رکھ دیئے۔ برابر والے کمرے سے ایک نہایت خوبرو لڑکی باہر آئی اور ان سے مخاطب ہو کر بولی "میں فاقے سے مری جا رہی ہوں۔"

انہوں نے کہا "ہنی ان کو ٹھکانے لگا لوں۔ پھر لنچ کو چلتے ہیں۔"

ہم نے ان کے سامنے پاسپورٹ کے وہ صفحات رکھ دیئے جن پر ایک ماہ کا ویزا لگا ہوا تھا۔

انہوں نے ایک نظر ڈالی اور مہر لگا دی۔ بولے "گڈ لک ٹو یو۔ اب چلتے بنو ورنہ میری ڈیٹ خراب ہو جائے گی۔"

ہم نے پاسپورٹ سمیٹے اور باہر نکل گئے۔ ہمارا رخ تو امریکا کی جانب تھا اور ہم نے فلم سازی کا منصوبہ بھی امریکا ہی میں بنایا تھا مگر تقدیر ہماری کار کے ونڈ اسکرین پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ کینیڈا میں ہمارا آب و دانہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ہمیں خود پتا نہیں تھا

کہ بہت جلد ہمیں دوبارہ کینیڈا آنا ہے اور وہ بھی ایک فلم کے سلسلے میں۔ جس میں شبنم' ندیم' ننھا اور کمسن اداکار خرم بھی ہمارے ہم سفر ہوں گے۔

وہ ایک علیحدہ داستان ہے اور انتہائی سنسنی خیز۔

اوٹاوہ کے نزدیکی ایگزٹ (اخراج) سے ہم بخیرو عافیت باہر نکل گئے اور امریکی سر زمین میں پہنچ کر اطمینان کی سانس لی۔ جب کار نے سو ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ طے کر کے ہمیں چچا سام کے ملک میں پہنچا دیا تو یوں لگا جیسے دنیا میں اس سے زیادہ آسان اور کوئی کام ہی نہیں ہے مگر اس سے پہلے ہم نے جو چند روز کینیڈا کا ویزا بڑھوانے اور امریکی ویزا حاصل کرنے میں صرف کئے تھے اور ایک امیگریشن افسر کی نادر شاہی نے ہمیں جس مشکل سے دو چار کر دیا تھا وہ بھی کوئی معمولی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے' وہی معاملہ ہمارے ساتھ بھی پیش آیا اور اپنے پاسپورٹ سنبھال کر واپس کار میں بیٹھ کر امریکی سرحد کے اندر پہنچنے تک ہمیں مسلسل یہی ڈر رہا کہ کہیں امیگریشن والے ہمیں دوبارہ چیکنگ کے لئے روک ہی نہ لیں۔ ہم خود آج تک یہی سوچ رہے ہیں کہ ایک ملک کے اندر داخل ہونے کے لئے بیک وقت دو ویزا حاصل کرنے کا اتفاق شاید ہی کسی سیاح کو ہوا ہو گا مگر ہم نے آپ کو بتایا تو ہے کہ امریکی بھی عجیب د غریب قوم ہیں۔ اگر اصول پر ڈٹ جائیں تو پھر وہیں منجمد ہو کر رہ جائیں' لیکن اگر بے اصولی پر اتریں تو پھر اللہ دے اور بندہ لے۔

اوٹاوہ کے امریکی ویزا آفس میں خاتون نے ہمیں بڑی فراخدلی سے دوسرا ویزا جاری کر دیا تھا حالانکہ ہم کہتے ہی رہے کہ پہلے ویزا کو منسوخ کئے بغیر دوسرا ویزا جاری کرنا کہاں تک درست ہو گا مگر انہوں نے مسکرا کر بات ٹال دی اور کہا "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب وہ مشکل پیش آئے گی تو دیکھا جائے گا اور یہ نہ بھولئے کہ اگر یہ بے قاعدگی ہے تو اس میں' میں بھی برابر کی شریک ہوں۔ اسلئے اللہ مالک ہے۔" پھر دوسرا مرحلہ اس وقت آسان ہو گیا جب امیگریشن افسر نے لنچ کے لئے اپنی خوب صورت گرل فرینڈ کے ہمراہ جانے کی جلدی اور خوشی میں ہمارے پاسپورٹ کا بغور جائزہ لینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اس طرح ہم ایک بار پھر ریاست ہائے متحدہ امریکا کی تضادات سے بھرپور نگری میں پہنچ گئے۔ اوٹاوہ سے ورجینیا میں اپنے گھر پہنچنے میں ہمیں دس گھنٹے لگے۔ اس عرصے میں ہم نے دو تین جگہ رک کر کھانے پینے میں کچھ وقت گزارا۔ ایک جگہ سڑک کے کنارے شولڈر پر کار کھڑی کر کے کچھ دیر قیلولہ بھی فرمایا۔ اتفاق دیکھئے کہ یہ بھی ریاست میری لینڈ کی حدود تھی۔ ہم تو خیر نیند سے مدہوش ہو ہی رہے تھے مگر ہماری دیکھا دیکھی لبنیٰ نے بھی جھپکی لینے کا فیصلہ کر لیا۔ بچیوں کے پاس گڑیاں تھیں اور کار کا پچھلا حصہ ان کے لئے بہت کافی تھا اس لئے انہیں کسی اور چیز کی ضرورت تھی نہ پروا اس کے کچھ دیر بعد جب ایک پولیس کار ہماری کار کے پاس آ کر رکی اور پولیس والے نے ہماری کار کا شیشہ بجایا تو لڑکیوں نے بڑی بے نیازی سے پولیس افسر کو دیکھا۔

امریکا میں تھوڑے سے قیام کے بعد انسان ایک عجیب سی کیفیت سے دو چار ہو جاتا ہے۔ شہری آزادی اور فرد کی آزادی ہمارے ہاں بے معنی اور فضول سے الفاظ سمجھے جاتے ہیں۔ حالانکہ بڑی فراخ دلی اور کثرت سے استعمال بھی ہوتے ہیں۔ مگر مغربی ملکوں میں پہنچ کر آزادی اور آسمان کی بیکراں وسعت کا احساس اس قدر شدید ہوتا ہے کہ بڑے تو بڑے بچے بھی اس کے جراثیم سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ مثال کے طور پر پولیس ہی کو دیکھ لیجئے ہمارے ملک میں بچے یا تو پولیس کو غیر ضروری' بے مصرف اور بے مقصد چیز سمجھتے ہیں یا پھر اس سے خوف کھاتے ہیں۔ مگر یورپ اور امریکا میں نہ جانے کیوں وہ پولیس کو اپنا محافظ' ہمدرد اور مددگار سمجھنے لگتے ہیں۔ پولیس سے وہ بالکل خوف نہیں کھاتے۔ جب ہمیں کوئی جگہ تلاش کرنے میں دیر لگ جاتی تھی تو نادیہ اور پارو فوراً یہ تجویز پیش کرتی تھیں کہ پاپا! آپ پولیس افسر سے کیوں نہیں پوچھ لیتے۔ اور واقعی پولیس والا دریافت کرنے پر فوراً مطلوبہ پتا سمجھا دیتا تھا۔

ایک دن تو انتہا ہو گئی۔ ہم شاپنگ کے لئے گئے اور حسب معمول سارے پیسے ختم کر دیئے۔ پارو کو ایک اور باربی ڈول کی ضرورت تھی اور اس کا لباس بھی درکار تھا۔

ہم نے کہا "بیٹے پھر کبھی آ کر خرید لیں گے۔ اس وقت ہمارے پاس پیسے نہیں

ہیں۔"

پارو نے فوراً مشورہ پیش کیا "تو پھر کیا ہوا آپ پولیس افسر سے ادھار لے لیجئے۔"

یہ معصومانہ فقرہ سن کر ہم اداس ہو گئے۔ اس لئے نہیں کہ پارو نے ہمیں پولیس والے سے قرض مانگنے کا مشورہ کیوں دیا تھا بلکہ اس لئے کہ آخر ہمارے اپنے ملک میں لوگوں کو پولیس والوں پر اتنا اعتماد کب ہو گا۔ وہ وقت کب آئے گا جب وہ پولیس کو اپنا دوست محافظ اور ہمدرد سمجھیں گے؟

امریکا سے پاکستان پہنچ کر چند روز تک تو بچیوں نے ذہنی طور پر امریکا ہی میں رہائش رکھی۔ سڑکوں' گلیوں اور دکانوں میں گندگی دیکھ کر وہ حیران رہ جاتی تھیں۔ کاروں کے ہارنوں کا شور اور ٹریفک کی افراتفری انہیں پریشان کر دیا کرتی تھی۔ ایک روز ہماری کار کے سامنے جانے والی کار میں سے کسی نے سگریٹ کا پیکٹ اور کیلے کا چھلکا کھڑکی سے باہر سڑک پر پھینکا تو بچیوں کو بہت حیرانی ہوئی۔

نادیہ کا اوور کوٹ سینے کے لئے ہم نے گلبرگ میں لبرٹی مارکیٹ کے ایک فیشن ایبل درزی کو آرڈر دیا تھا۔ درزی صاحب نے ہمیں دو پھیرے لگوا دیے۔ تیسری بار گئے تو وہ پھر گھگیانے لگے "سر! بس کیا عرض کروں۔ بہت پرابلم پیدا ہو گئی تھی۔ آپ یقین رکھیں۔ پرسوں بے بی کے کپڑے آپ کو ضرور مل جائیں گے۔"

نادیہ نے ان سے کہا "ماسٹر صاحب آپ اتنا جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟"

ماسٹر صاحب' تو خیر اس اچانک فقرے سے ہکا بکا رہ ہی گئے تھے مگر خود ہم بھی کافی پریشان ہو گئے۔

ماسٹر صاحب نے کہا "بے بی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں!"

بے بی نے جواب دیا "ہم ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں۔ آپ کتنے دن سے جھوٹے وعدے کر رہے ہیں۔"

وہ ہنس پڑے۔ ویسے تو لاجواب ہو گئے تھے مگر بولے "بس کل آپ کو کپڑے ضرور مل جائیں گے۔"

ہم نے کہا "ٹھیک ہے ہم کل آ جائیں گے۔"

نادیہ بولی "پاپا اگر کل بھی انہوں نے کپڑے نہیں دیے تو آپ کیا کریں گے؟"

ہم نے کہا "ارے کیوں نہیں دیں گے۔ اس بار انہوں نے بالکل پکا وعدہ کیا ہے۔"

دوسرے دن ہم پھر ماسٹر صاحب کی ٹیلرنگ شاپ پر چلے گئے۔ اس بار ماسٹر صاحب سرے سے موجود ہی نہیں تھے۔ ان کے صاحب زادے نے کہا "سر! وہ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے کاریگروں نے چھٹی کر لی تھی۔ اس لئے کام تیار نہیں ہو سکا۔ کل آپ کو ضرور مل جائیں گے۔"

نادیہ نے رونکھی ہو کر ہماری جانب دیکھا۔ پھر باہر سڑک پر نظر دوڑائی۔ فٹ پاتھ پر ایک ٹریفک کانسٹیبل صاحب جوس کی دکان پر کھڑے پھل کھانے میں مصروف تھے۔ نادیہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ بھاگ کر پولیس والے کے پاس گئی اور کہا "پولیس! آپ ان ماسٹر صاحب کو پکڑ لیجئے۔"

پولیس والا پہلے تو حیران رہ گیا۔ پھر پوچھا "بے بی اس نے کیا جرم کیا ہے؟"

"یہ ہم سے روز جھوٹے وعدے کرتے ہیں۔ ہمارے کپڑے سی کر نہیں دیتے۔"

کانسٹیبل ہنس پڑا "کوئی بات نہیں۔ دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔"

نادیہ کو پولیس والے سے فوری امداد اور کارروائی کی توقع تھی۔ اس نے بہت مایوس ہو کر پولیس والے کو دیکھا اور خاموشی سے سر جھکا کر واپس دکان میں آ گئی۔

یہ واقعہ دراصل ہم نے آپ کو پہلے سنا دیا حالانکہ یہ بعد میں پیش آیا تھا۔ اب پہلے والا واقعہ سنئے۔ پولیس افسر نے کار کا شیشہ انگلی سے بجایا اور مسکرا کر شیشہ اتارنے کا اشارہ کیا۔ نادیہ نے ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا کہ پاپا اور ماما سو رہے ہیں۔ اس وقت آپ جائیں۔

پولیس افسر نے دوبارہ وہی اشارہ کیا اور شیشہ پر دستک دی۔ ہم نے آنکھ کھول کر دیکھا اور ہوشیار ہو گئے۔ نادیہ نے کار کی کھڑکی کا شیشہ اتارا اور بہت ناراضگی سے پولیس افسر کو مخاطب کیا "آپ کیسے پولیس افسر ہیں۔ کسی کو سونے بھی نہیں دیتے؟"

ہم نے بھی کھڑکی سے باہر سر نکالا۔ پولیس والے نے اپنی ٹوپی کو چھو کر معذرت کی اور کہا "سر معافی چاہتا ہوں دراصل میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آپ لوگوں کو کسی قسم

ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اتنی دیر میں دوسرا پولیس افسر بھی موٹر سائیکل سے اتر کر ہماری کار کی جانب آیا اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ یہ وہی صاحب تھے جنہوں نے کینیڈا جاتے ہوئے ہمیں پچاس ڈالر کا ٹکٹ دے دیا تھا۔

"اوہ سر! کیسے ہیں آپ؟" اس نے مسکرا کر کہا۔

"بالکل ٹھیک۔"

"کینیڈا سے اب واپسی ہوئی ہے آپ کی؟"

ہم نے سرہلا کر اقرار کیا۔ پھر پوچھا "مگر آفیسر آپ کا حافظہ بہت تیز ہے۔ آپ نے ہمیں کیسے پہچان لیا؟"

وہ ہنسا اور بولا "آپ کی کار کے نمبر سے اور آپ کی دونوں بچیوں سے۔ یہ دونوں چیزیں میری کمزوری ہیں۔ ایک بار دیکھنے کے بعد میں نہ تو کار کا نمبر بھولتا ہوں اور نہ ہی بچیوں کے چہرے۔"

پارو نے بھی پولیس افسر کو پہچان لیا تھا۔ پوچھنے لگی "آپ کی موٹی والی گرل فرینڈ کہاں ہیں؟"

ہم نے پارو کو گھور کر منع کرنا چاہا مگر پولیس والا زور سے قہقہ لگا کر ہنسا اور کہنے لگا "دیکھا آپ نے آپ کی بچی کا حافظہ مجھ سے بھی زیادہ تیز ہے۔"

ہم نے ان دونوں کا شکریہ ادا کیا اور انہیں بتایا کہ ہم تو بس یوں ہی ذرا ستانے کے لئے رک گئے تھے۔ وہ دونوں "بائی" کہہ کر رخصت ہو گئے۔

ان ملکوں میں تعلیم بہت زیادہ ہے۔ علم بھی ہے مگر معلومات صفر ہیں۔ ہم نے تو یہ محسوس کیا ایک عام راہ گیر یا تانگے والے کی جنرل نالج بھی امریکا کے عام لوگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ ہمارے گامے ماجھے بھی دنیا بھر کے سربراہان مملکت کے ناموں سے واقف ہیں اور انگلستان کے شاہی خاندان سے تو انہیں خاص دلچسپی ہے لیکن اب ذرا امریکا والوں کی بھی سن لیجئے۔

اوٹاوہ کے ایگزٹ سے امریکا میں داخل ہوئے تو بیس پچیس میل کے بعد ایک موٹیل نظر آیا جسے دیکھتے ہی بچیوں کو آئس کریم، چاکلیٹ اور برگر یاد آ گئے۔ موٹیل کے باہر کافی رونق تھی۔ بہت سی کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ کچھ لوگ آ رہے تھے کچھ جا رہے

تھے، بچے کھیلتے پھر رہے تھے یا اسکیٹنگ میں مصروف تھے۔ موٹیل کے اندر داخل ہونے والے دروازے کے باہر ایک پادری صاحب ایک انتہائی معصوم شکل اور خوبصورت راہبہ کے ہمراہ کھڑے ہوئے چندہ مانگ رہے تھے۔ ایک بڑا سا ٹین کا ڈبا ان کے ہاتھ میں تھا اور برابر میں ایک سائن بورڈ پر ان کے چرچ کا نام لکھا ہوا تھا۔ ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ ننوں کا لباس بے حد سادہ مگر دلکش ہوتا ہے۔ ایک تو سر سے پیر تک سیاہ ہوتا ہے پھر سر پر سیاہ اور سفید پٹی اس کی دلکشی کو مزید بڑھا دیتی ہے اور اگر کہیں نن اتفاق سے گوری میم بھی ہو تو پھر اس سیاہ لباس میں اس کی خوب صورت اور معصومیت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ ابراہیم جلیس کہا کرتے تھے کہ ننوں کو دیکھ کر مجھے جنت کی حوریں یاد آ جاتی ہیں۔

ہم نے کہا "ایسی باتیں مت کرو۔ گناہ ہوتا ہے۔"

بولے "گناہ کی کیا بات ہے۔ ارے بھئی جنت کوئی چھوٹی موٹی جگہ تو نہیں ہوگی۔ وہاں تو لاکھوں کروڑوں حوریں ہوں گی۔ ظاہر ہے وہ سب کی سب ہمارے ہی ملکوں سے تعلق رکھنے والی تو نہیں ہوں گی۔ یورپ کی کروڑوں گوری میمیں آخر کہاں جائیں گی؟"

ابراہیم جلیس کا کہنا یہ بھی تھا کہ دیکھ لینا بہت سے نیک پادری اور پارسائنیں بھی جنت میں ضرور جائیں گی۔

ہم جب بھی کسی نورانی شکل پادری یا معصوم صورت حسین نن کو دیکھتے ہیں تو ہمیں بے اختیار ابراہیم جلیس یاد آ جاتے ہیں۔ چنانچہ موٹیل کے دروازے کے باہر ان دونوں کو دیکھ کر بھی ہمیں ابراہیم جلیس کی یاد آ گئی۔ پادری صاحب نے اپنے نزدیک ایک چھوٹا سا حضرت عیسیٰ کا مجسمہ بھی ایک اسٹول پر رکھ چھوڑا تھا۔ ہماری بچیوں کو خدا جانے امریکا پہنچتے ہی یہ بات کس نے سمجھا دی تھی کہ پادری لوگ بہت نیک ہوتے ہیں اور یہ ساری دنیا کے مصیبت زدہ لوگوں کی امداد کے لئے چندہ اکٹھا کرتے ہیں۔ بلکہ نادیہ کی معلومات تو بہت زیادہ تھیں۔ اس نے کہا "پاپا پتا ہے لاہور کے لنڈے بازار میں جو گرم کپڑے بکتے ہیں وہ مردہ گوروں اور مری ہوئی میموں کے نہیں ہوتے۔"

"اچھا" ہم نے کہا "پھر کس کے ہوتے ہیں؟"

"لوگ اپنے فالتو کپڑے پادریوں کو دے دیتے ہیں۔ وہ انہیں چندہ اکٹھا کرنے کے

لئے بیچ دیتے ہیں۔ اس طرح وہ کپڑے ہمارے لنڈے بازار میں پہنچ جاتے ہیں۔"

نادیہ نے پادری صاحب کے پاس پہنچ کر پہلے تو بہت زور دار "ہائی فادر" کہا۔ پھر پارو کو اشارہ کیا کہ تم بھی کہو۔ اس کے بعد پچاس پچاس سینٹ کے دو سکے ان کے ڈبے میں ڈال دیئے۔

پادری صاحب نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔ نن صاحبہ نے پیار سے ان کا رخسار تھپ تھپایا اور ایک تبلیغی کتابچہ تحفے کے طور پر نادیہ کو پیش کیا۔

نادیہ نے کہا "شکریہ مدر' یہ اپنے پاس ہی رکھ لیجئے۔"

نن نے حیران ہو کر دیکھا اور پوچھا "کیوں بات کیا ہے؟"

اس نے بڑی نرمی سے کہا "مدر ہم مسلمان ہیں۔"

پادری صاحب اور نن صاحبہ کو حیران چھوڑ کر ہم موٹیل کے اندر داخل ہو گئے۔

ڈائننگ ہال بہت خوب صورت تھا۔ نو عمر اور خوش شکل لڑکیاں ویٹریس کے طور پر خدمات سرانجام دے رہی تھیں۔ ایک ہری آنکھوں اور شربتی بالوں والی لڑکی ہمارے پاس بھی آرڈر لینے آ گئی۔ پتلون اور جیکٹ کے یونیفارم میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ بالوں پر ایک چھوٹا سا ہیٹ بھی کڑھا ہوا تھا۔ ہماری فرمائش نوٹ کرنے کے بعد اس نے پنسل اپنی ٹوپی میں گھسائی اور مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ دوبارہ کھانے پینے کا سامان لے کر آئی تو اس نے باتیں شروع کر دیں۔ مغرب میں عام طور پر لڑکیاں اتنی باتونی نہیں ہوتیں۔ خاص طور پر یہ سیاحوں اور غیر ملکیوں کے ساتھ اس قدر زیادہ باتیں نہیں کرتیں۔ مگر یہ ان سے قدرے مختلف تھی۔ میز پر سامان سجاتے ہوئے اس نے پوچھا "آپ لوگ کینیڈا سے آئے ہیں؟"

ہم نے اثبات میں سر ہلایا۔

پوچھا "آپ کینیڈین ہیں یا امریکن؟"

ہم نے کہا "دونوں میں سے کچھ بھی نہیں۔"

اس نے اپنی ہری ہری خوبصورت آنکھوں سے ہمیں دیکھا۔ اور کہا "واقعی؟"

ہم نے کہا "اور کیا۔"

"تو پھر آپ سیاح ہیں؟"

ہم نے کہا "خوب پہچانا۔"

کہنے لگی "صورت سے تو لٹین امریکا کے لگتے ہیں۔"

ہم نے کہا "جی نہیں ہم پاکستان سے آئے ہیں۔"

"پاکستان؟" اس نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا "وہ کہاں ہے؟" ہم نے کہا "انڈیا کے پاس ہے۔"

"او اچھا اچھا آپ انڈین ہیں۔"

ہم نے کہا "تم نے اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے؟"

بولی "میں ہائی اسکول کی اسٹوڈنٹ ہوں۔"

"تعجب ہے۔ پھر بھی انڈیا اور پاکستان کا فرق نہیں جانتیں۔ یہ دونوں الگ الگ ملک ہیں۔"

شرمندہ ہونے کی بجائے وہ مسکرائی اور دونوں شانے اچکا کر بولی "نو ہارڈ فیلنگ اٹ از او کے ودمی (برا ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے بھی کوئی شکایت نہیں ہے۔)

ساتھ والی میز پر کچھ لوگ آ گئے تھے۔ وہ معذرت کر کے اس طرف چلی گئی۔

نادیہ نے ہم سے پوچھا "پاپا! کیا اس نے جغرافیہ نہیں پڑھا؟"

ہم نے کہا "پڑھا ہو گا بہت سے بچے بہت سے مضمونوں میں کمزور ہوتے ہیں۔"

مگر زیادہ زور دار لطیفہ اس وقت ہوا جب ہم نے بل ادا کرنے کے لئے اپنا پرس نکالا اور ویٹریس سے پوچھا "سنو تم کینیڈین کرنسی لے لو گی؟"

اس نے کہا "ٹھہرو میں پوچھ کر آتی ہوں۔"

واپس آ کر اس نے بتایا کہ کینیڈا کی کرنسی بھی قبول کی جائے گی۔ ہم نے کینیڈا کے دس دس ڈالر والے نوٹ نکال کر اس کے حوالے کئے۔

اس نے نوٹوں کو بہت غور سے دیکھا اور پھر اس پر چھپی ہوئی ملکہ ایلزبتھ کی تصویر کو دیکھ کر مسکرائی "کتنی چارمنگ ہے۔ کیا یہ کینیڈا کی ملکہ ہے؟"

ہم نے کہا "یہ برائے نام ملکہ ہے کیونکہ کینیڈا ابھی تک برطانیہ کی نو آبادی ہے۔"

اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی پوچھنے لگی "پھر کینیڈا کی ملکہ کون ہے؟"

ہم نے اسے بتایا کہ کینیڈا میں ملکہ نہیں ہوتی۔ وزیراعظم ہوتا ہے۔ یہ تو برطانیہ کی ملکہ ہے۔

اس نے چند لمحے غور کیا پھر اپنی سر کے بالوں کو جھٹکا اور کاندھے اچکا کر چلی گئی۔ جیسے کہہ رہی ہو "میری بلا سے۔"

مگر امریکیوں کی جنرل نالج کا اندازہ لگانے کے لئے یہ ایک ہی واقعہ بہت کافی ہے اگر کوئی یہ واقعہ ہمیں سناتا تو ہمیں ہرگز یقین نہیں آتا کہ کینیڈا کی سرحد سے پچیس میل کے فاصلے پر واقع ایک آبادی میں رہنے والی ہائی اسکول کی طالبہ کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ کینیڈا میں طرز حکومت کیا ہے اور ملکہ ایلزبتھ کہاں کی ملکہ ہیں؟ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ امریکا اپنے اندر مگن رہنے والی قوم ہے۔ نہ ان کا بیرونی دنیا کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے اور نہ ہی انہیں ان کے متعلق جاننے کی ضرورت ہے۔ وہ تو بس کنوئیں کے مینڈک کے مانند اپنی دنیا میں مست اور کھوئے ہوئے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کے کنوئیں کا رقبہ بہت زیادہ ہے۔ یوں بھی کیونکہ ہر معاملے میں خود کفیل ہیں اس لئے انہیں دوسروں کی جانب دیکھنے یا ان کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ یورپ والوں کا حال بھی اس سے زیادہ نہیں ہے۔

ہم موٹیل سے باہر نکلے تو دروازے کے نزدیک کھڑے ہوئے پادری صاحب اور ان کی معاون راہبہ کے پاس سے گزرے۔ خاتون نے ہمیں مسکرا کر دیکھا اور پادری صاحب سے کچھ سرگوشی کی۔ انہوں نے فوراً ہماری جانب ایک بھرپور مسکراہٹ ارسال فرمائی اور پھر دو قدم آگے بڑھا کر ہمارے نزدیک آ گئے اور امریکی دستور کے مطابق "ہائی" یعنی علیک سلیک کے بعد فرمانے لگے "اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو آپ سے ایک ذاتی سوال پوچھ سکتا ہوں؟"

ہم نے حیرانی سے انہیں دیکھا اور سوچا کہ شمالی امریکا کے اس دور دراز علاقے میں، جہاں اس سے پہلے ہم نے کبھی قدم نہیں رکھا اور نہ ہی کبھی دوبارہ اس خطہ زمین کی جانب سفر کرنے کا کوئی امکان ہے، بھلا ایک پادری صاحب کو ہم سے کون سا ذاتی سوال پوچھنے کی ضرورت پیش آ گئی۔ پھر بھی ہم نے کہا "جی ضرور۔"

کہنے لگے "کیا اس بچی کو ہمارا پمفلٹ لینے سے آپ نے روکا ہے؟"

ہم نے کہا "بالکل نہیں۔"

کہنے لگے "مگر اس نے تو یہ پمفلٹ لینے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ مسلمان ہے۔"

ہم نے کہا "اس کا کہنا بھی درست ہے۔"

بولے "لیکن ایک معصوم اور ناسمجھ بچی کو کسی دوسرے مذہب کے بارے میں پڑھنے سے روک دینا مناسب نہیں ہے۔ نہ یہ آزادی ہے اور نہ ہی جمہوریت۔"

ہم نے بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی۔ عیسائیت کا پرچار کرنے والے پادریوں اور ننوں کے طریقہ کار سے ہم پوری طرح واقف ہیں۔ ان کا یہ دخل در معقولات بھی پسند نہیں آیا۔ ہم نے کہا "ہولی فادر! آپ جانتے ہیں کہ یہ ایک معصوم اور ناسمجھ بچی ہے۔ ایک مسلمان گھرانے سے اس کا تعلق ہے۔ پھر آپ اس سے یہ توقع کیوں رکھتے ہیں کہ وہ دوسرے مذہب کے بارے میں کتابیں پڑھے گی۔ جیسا کہ آپ نے فرمایا فی الحال تو وہ ناسمجھ اور معصوم ہے۔ جب سمجھ دار ہو گی تو خود ہی دنیا کے ہر مذہب کے بارے میں پڑھے گی اور اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق فیصلہ کرے گی۔"

کہنے لگے "پھر بھی معصوم بچوں کو دوسرے مذہب کے بارے میں جاننا چاہیئے۔ یہ ان کی معلومات کے لئے بھی ضروری ہے۔"

ہم نے کہا "آپ بجا فرماتے ہیں۔ مگر کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ خود اپنے معصوم بچوں کو آپ مذہب اسلام کے بارے میں کیا معلومات فراہم کرتے ہیں؟ کیا آپ صاحب اولاد ہیں؟"

"خدا کے فضل سے میں چار بچوں کا باپ ہوں۔"

"بہت خوب۔ آپ نے ان بچوں کو اسلام کے بارے میں کتنی کتابیں پڑھائی ہیں؟" ان کے چہرے پر ناگواری دیکھ کر ہم نے کہا "معاف کیجئے گا ذرا ذاتی سا سوال پوچھ لیا آپ سے۔ امید ہے کہ آپ کو اعتراض نہ ہو گا۔"

وہ ایک لمحہ خاموش رہے۔ شاید اپنی ناراضی پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے مسکرا کر اپنا ہاتھ ہماری جانب بڑھایا اور بولے "نو ہارڈ فیلنگ" (برا ماننے کی ضرورت نہیں ہے)

ہم نے ان سے ہاتھ ملایا تو ان کے برابر کھڑی ہوئی راہبہ نے بھی مسکراتے ہوئے ہماری جانب دیکھا اور کہا "مجھے امید ہے کہ آپ کا سفر اچھا گزرے گا۔"

اتنی دیر میں لبنیٰ اور بچیاں پارکنگ لاٹ میں جا کر کار میں بیٹھ چکے تھے۔ ہم ان کے پاس گئے تو لبنیٰ نے پوچھا "پادری صاحب سے اس قدر گھل مل کر کیا باتیں ہو رہی تھیں؟"

ہم نے کہا "ان کے خیال میں ہم ایک اچھے کرسچئین بن سکتے ہیں اس لئے وہ ہمارا انٹرویو لے رہے تھے۔"

واپسی کا سفر بھی اتنا ہی دلکش اور دل فریب تھا جتنا کہ جاتے ہوئے تھا۔ خوب صورت نظارے، کشادہ اور ہموار سڑکیں، دونوں جانب درخت اور سبزہ زار، ہم اکمل علیمی کی معلومات کے مطابق نقشہ دیکھتے ہوئے بڑی آسانی سے رات تک اپنے گھر پہنچ گئے۔ یوں کینیڈا کا پہلا سفر تمام ہوا۔

• •

امریکا میں چند ہفتے قیام کرنے کے بعد ہم نے انگلستان کا رخ کیا۔ واجد صاحب سے ٹیلی فون پر مسلسل رابطہ قائم تھا اور وہ ہمیں یہی تسلیاں دے رہے تھے کہ بس عنقریب ہماری کمپنی رجسٹر ہو جائے گی اور آپ کو فلم کی تیاریوں کے سلسلے میں ٹورنٹو آنا پڑے گا۔ مگر امریکا میں کہاں تک انتظار کرتے۔ ہم نے اپنا مکان فروخت کر دیا تھا۔ ریستوران پہلے ہی فروخت کر چکے تھے۔ باقی رہا سہا سامان اور فرنیچر بھی آہستہ آہستہ فروخت ہو چکا تھا اور ہم اپنے پاکستانی ہمسائے اور دوست عارف لطیف صاحب سے مستعار لئے ہوئے سامان کے سہارے زندگی گزار رہے تھے۔ کچھ دن تو بہت مزے میں گزرے کوئی اور مصروفیت تو تھی نہیں اس لئے بے فکری سے گھومنے پھرنے اور سیرو تفریح کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ دوستوں سے بھی خوب دل بھر کر ملاقاتیں کیں مگر شاید امریکا سے ہمارا آب و دانہ اٹھ چکا تھا شاید اسی لئے اب ہمیں وہاں بے چینی اور گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی ادھر واجد صاحب تھے کہ یہی یقین دلا رہے تھے کہ بس چند روز میں کاغذات پراسیس ہو جائیں گے۔ انسانی فطرت اور ذہن بھی ایک عجیب چیز ہے انسان جب کسی چیز کے بارے میں کوئی فیصلہ کر لیتا ہے تو پھر اسے قرار نہیں آتا۔ ہمارا بھی کم و بیش یہی عالم تھا۔ ہم نے امریکا سے ذہنی طور پر اپنا رشتہ ناتا توڑ لیا تھا اس لئے اب ہم وہاں سے رخصت ہونے کے لئے بے چین تھے۔ سوچا کہ کیوں نہ وقت گزاری کے لئے انگلستان چلے جائیں؟ واجد صاحب کو فون پر یہ تجویز پیش کی تو انہیں بھی بہت پسند آئی۔ لہٰذا ہم نے امریکا سے انگلستان کا رخ کیا۔ لندن میں سردیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ بارش بھی ہو رہی تھی۔ ہر وقت اندھیرا، بارش، سردی اور عجیب قسم کی اداسی طاری رہتی تھی۔ لندن ہمارے لئے ہمیشہ دلکشی اور دلچسپی کا مرکز رہا ہے مگر کچھ تو موسم کی خرابی اور کچھ یہ

کہ ہمارے اکثر جاننے والے وہاں موجود نہ تھے اس لئے وقت گزارنا مشکل ہو گیا۔ ادھر لندن کا قیام بہت زیاہ مہنگا بھی پڑ رہا تھا۔ موسم اتنا خراب تھا کہ بچیوں کو بھی اکتاہٹ سی ہونے لگی۔ ان کی بیزاری کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ امریکا اور کینیڈا کے روشن' کشادہ اور بڑے بڑے شہروں کو دیکھنے کے بعد لندن انہیں تنگ و تاریک اور پسماندہ سا لگ رہا تھا۔ موسم بھی زیادہ خراب تھا اس لئے زیادہ سیرو تفریح بھی ممکن نہ تھی۔ آخر اللہ نے ہمارے دل میں یہ بات ڈال دی کہ بندہ خدا کیوں بلا وجہ اپنا پیسہ اور وقت برباد کر رہے ہو اور لطف بھی نہیں اٹھا رہے۔ اس گناہِ بے لذت سے تو اچھا ہے کہ تم پاکستان چلے جاؤ۔ ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتے ہی ہم نے واجد صاحب سے ٹیلی فون پر گفتگو کی اور یہ تجویز پیش کی۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا اور اس کے ساتھ ہی یہ اطلاع بھی دی کہ کاغذات کی تیاری آخری مراحل میں ہے۔ اس طرح چند روز کے اندر ہم برٹش ائر کے طیارے پر سوار ہو کر کراچی اور پھر وہاں سے لاہور پہنچ گئے۔ لاہور میں ہمیں جس نے بھی دیکھا حیران و پریشان رہ گیا۔ ہم نے اپنی آمد کے بارے میں کسی کو با خبر نہیں کیا تھا۔ ہمارا اس طرح اچانک لاہور میں نمودار ہو جانا سبھی کے لئے خوشی اور حیرانی کا باعث تھا۔ عزیزوں اور دوستوں سے ملاقاتوں کے بعد ہم نے سیدھا اسٹوڈیو کا رخ کیا اور سب سے یوں ملے جیسے کوئی اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں سے ملتا ہے۔ ہماری غیر موجودگی میں جو کچھ ہو چکا تھا اس کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ حالات حوصلہ افزا نہیں تھے مگر فلم والے اپنی عادت کے مطابق بہت بلند حوصلہ تھے۔ لاہور پہنچ کر ہم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ٹورنٹو میں واجد صاحب سے فون پر رابطہ قائم کیا اور ہمیں فوراً لاہور اور بیرونی ممالک کا فرق محسوس ہو گیا۔ ہم تو اس بات کے عادی ہو گئے تھے کہ دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی فون پر بات کرنی ہو ریسیور اٹھا کر ڈائیل گھمائیں اور فوراً بات کر لیں مگر لاہور پہنچتے تو احساس ہوا کہ یہ معمولی سی بات جسے ہم نے امریکا' کینیڈا اور لندن میں ذرا سی بھی اہمیت نہیں دی تھی کس قدر مشکل مرحلہ ہے۔ ٹیلی فون پر رابطہ آسان نہیں تھا۔ ڈاک کا یہ حال ہے کہ بارہ پندرہ دن سے پہلے خط ملتا نہیں تھا۔ ایک دوبار ٹورنٹو کے لئے فون مل گیا تو دوسری جانب واجد صاحب نہیں ملے۔

عجیب بیزاری کا عالم تھا کہ ایک دن ہمیں واجد صاحب کی جانب سے ایک موٹا تازہ لفافہ موصول ہوا۔ اس کے اندر بہت سے کاغذات تھے جن پر ہمیں دستخط کرنے تھے۔ ہمراہ ایک تفصیلی خط بھی تھا جس میں انہوں نے ہمیں اصل صورت حال سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ حضرات جنہوں نے ہمیں زبردستی ٹورنٹو میں روکا تھا اور فلم بنانے کے لئے سب سے زیادہ بے تاب تھے۔ اب ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔ اپنے حصے کی رقم دینا تو ایک طرف ان سے شرف ملاقات حاصل کرنا بھی قریب قریب ناممکن ہو گیا تھا۔ واجد صاحب نے پوری تفصیل کے ساتھ یہ روداد لکھی تھی کہ وہ کس طرح اپنا وقت ضائع کر کے انہیں تلاش کرنے میں مصروف رہتے ہیں مگر ان سے ملاقات نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی بھی ہے تو وہ یہی دلاسہ دیتے ہیں کہ بس ذرا مصروفیت سے وقت ملے گا تو بیٹھیں گے۔ واجد صاحب نے آخر میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ان کے خیال میں یہ حضرات اس کام کے لئے سیریس نہیں ہیں۔ اس لئے ان پر مزید وقت ضائع کرنا حماقت ہو گی۔

تین چار ماہ کی بھاگ دوڑ اور مصروفیات کا یہ نتیجہ نکلا تھا۔ اس سلسلے میں ہمیں جو ذہنی کوفت اور جسمانی تکلیف ہوئی وہ اس کے علاوہ اور پھر اخراجات کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہمارے کانوں میں نواب عبدالخالق کی آواز گونجنے لگی جنہوں نے آغاز ہی میں دبی زبان میں ہمیں اشارہ دیا تھا کہ اگر آپ کے مجوزہ منصوبے میں پاکستانی بھی شامل ہیں تو اسے زیادہ اہمیت نہ دیجئے۔ وہ ٹورنٹو میں رہتے ہوئے بھی اپنے ہم وطنوں سے میل ملاپ نہیں رکھتے۔ ان کے ساتھ گھلنا ملنا پسند نہیں کرتے وہ ان کے باہمی جھگڑوں' گندی سیاست اور خود غرضیوں سے نالاں رہتے ہیں۔ افسوس کہ ہم ان کے اشارے نہ سمجھ پائے اور ہمارے حصے میں سوائے مالی نقصان اور وقت کے زیاں کے کچھ نہ آیا مگر خیر۔ ذہنی طور پر تو ہم امریکا سے واپس آنے کا فیصلہ کر ہی چکے تھے۔ فلم سازی کی تجویز تو چلتے چلتے ہمیں دی گئی تھی۔ اس لئے کوئی صدمہ بھی نہیں ہوا۔ مگر کینیڈا میں ہم نے فلم سازی کے امکانات کا جو جائزہ لیا تھا اور کار آمد معلومات حاصل کی تھیں ان سے ہم نے اپنے فلمی دوستوں کو آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔

ایک کہاوت ہے کہ بات کو بنتے یا بگڑتے دیر نہیں لگتی۔ ان ہی دنوں پرویز ملک صاحب بھی بیرون ملک ایک فلم بنانے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ فلم ساز

ثناء اللہ بھی ان کے ہم خیال تھے۔ یہ دونوں ہماری غیر موجودگی میں "قربانی" بنا چکے تھے جو بہت کامیاب فلم ثابت ہوئی تھی اوٹاوہ میں مقیم چوہدری ثناء اللہ کے داماد جاوید بھی انہیں کینیڈا میں فلم بنانے کے حق میں مشورے دے رہے تھے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ کینیڈا کا آب و دانہ منتظر تھا۔ چنانچہ کینیڈا میں فلم سازی کا منصوبہ تیار کرلیا گیا اور کہانی لکھنے کے لئے ہماری خدمات حاصل کر لی گئیں۔ "کامیابی" ایک ایسی فلم ہے جس میں کینیڈا میں رہنے والے پاکستانیوں کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کی خوشیاں' ان کے غم والم' ان کے فائدے' ان کے نقصان ان کی خوشیاں' اور آسائشیں اور ان کے مسائل و آلام۔ یہی سب کچھ فلم "کامیابی" کا موضوع تھا۔

اس فلم میں پاکستانیوں کو یہ پیغام دینے کی کوشش کی گئی تھی کہ ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی۔ مغربی معاشرے کی چکا چوند سے آنکھوں میں چمک ضرور آ جاتی ہے مگر اس کے پیچھے جو تاریکی ہے اس کے بارے میں جاننا بھی ضروری ہے۔ مغربی معاشرہ بظاہر عیش و آرام فراہم کرنے والا معاشرہ ہے مگر ان خوشیوں کے پیچھے بے شمار دکھ چھپے ہوئے ہیں۔ انسانی رشتوں کی اہمیت باقی نہیں رہی۔ روحانیت کا دور دور تک پتہ نہیں ہے۔ محض مادی آسائشوں کے پیچھے ہر کوئی بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ کسی کا کسی سے تعلق ہے نہ واسطہ۔ ہر فرد اپنی ذات میں تنہا ہے۔ پھر بڑھاپے کا آزار کس قدر روح فرسا ہے۔ اولاد اپنے والدین کی کفیل نہیں ہے۔ بڑھاپے میں ان کے حصے میں تنہائی کا زہر ہے یا پھر "اولڈ ایج ہوم" کی سرد و بے کیف تنہائی۔ مغرب کی جانب سفر کرنے کی دیوانگی آخر کار پشیمانی کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ جسمانی عیش و آرام کے لئے بھی انہیں ذہنی سکون اور اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔ دنیا بھر میں اپنے وطن کی آغوش سے بڑھ کر کوئی پناہ گاہ اور جائے آسائش و سکون میسر نہیں آ سکتی۔

پہلے اس کہانی کا خلاصہ تیار کیا گیا۔ پھر طویل بحث و مباحثہ کے بعد اسکرپٹ کی تیاری شروع ہوئی۔ پرویز ملک صاحب بذات خود تعلیم کے سلسلے میں طویل عرصے امریکا میں قیام کر چکے ہیں۔ اس معاشرے اور طرز زندگی کے بارے میں ان کے ذاتی تجربات' مشاہدات اور تاثرات بھی ہیں۔ پھر ہم نے مغرب کے دوران قیام میں جو کچھ دیکھا اور

معنی بنانے کی بھی کوشش کی گئی۔ کہانی کی نوک پلک سنوارنے کے بعد موسیقی مرتب کی گئی' نغمات لکھے گئے' اداکاروں اور ہنرمندوں کا انتخاب ہوا اس اثنا میں پرویز ملک جو اس فلم کے ہدایت کار ہونے کے ساتھ ساتھ شریک فلمساز بھی تھے اسلام آباد اور پھر ٹورنٹو کے چکر لگانے میں مصروف رہے۔ کینیڈا کی حکومت کے ساتھ رابطہ قائم کر کے تمام ضروری معلومات اور اجازت نامے حاصل کر لئے گئے تھے۔ پاکستان میں جن اداکاروں کا انتخاب کیا گیا ان میں ندیم' شبنم' صبیحہ خانم' طلعت حسین' نمایاں تھے۔ مگر سب سے اہم مسئلہ ایک نو عمر لڑکے کا انتخاب تھا۔ جسے اس فلم کی کہانی میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ مختصر طور پر کہانی یہ ہے کہ ایک بچے (خرم) کا باپ اپنی بیوی کی اچانک موت کے بعد تعلیم کے حصول کے لئے کینیڈا چلا گیا ہے پاکستان میں اس کے بچے کی پرورش دادا' دادی کے سپرد ہے۔ کینیڈا میں اس کا دل ایسا لگا کہ پھر اس نے نہ وطن کا خیال کیا نہ بوڑھے ماں باپ کی یاد آئی اور نہ ہی اس بچے کی محبت نے ستایا جسے وہ بہت چھوٹا سا چھوڑ آیا تھا۔ بچے نے ہوش سنبھالا تو اپنے باپ کی تصویر ہی دیکھی یا پھر اس کی باتیں اس کے کانوں میں پڑیں۔ کینیڈا سے آنے والے خطوط کے بارے میں بھی دادا' دادی سے معلومات حاصل ہوتی رہیں مگر اس کے باوجود نادیدہ باپ سے ملاقات کی خواہش اس کی زندگی کا مقصد بن کر رہ گئی۔ جب دادا اور دادی نے دیکھا کہ وہ اپنے باپ سے ملے بغیر نہیں رہ سکتا تو پوتے کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اور چھٹیوں میں چند روز کے لئے اسے باپ کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کرلیا۔ باپ (ندیم) کو بذریعہ تار بچے کی آمد کی اطلاع دے دی گئی اور پھر خرم نے بھی رخت سفر باندھا اور ٹورنٹو کا رخ کیا۔ وہاں جا کر اس نے کیا دیکھا اور کیا حالات پیش آئے یہ ایک علیحدہ موضوع ہے۔ فی الحال ہمارے کینیڈا کے دوسرے سفر کا احوال سنئے:

پاکستان سے ندیم' شبنم' نشا اور خرم کو شوٹنگ کے سلسلے میں ٹورنٹو جانا تھا۔ یونٹ کے ارکان میں کیمرا مین ریاض بخاری' فلم ایڈیٹر زلفی اور ان کے معاون وغیرہ بھی شامل تھے اور ہمارے ساتھ وہی داستان دہرائی جا رہی تھی جس سے "دوست" کی بیرون ملک شوٹنگ کے سلسلے میں دو چار ہوئے تھے۔ یعنی فلم ساز ہدایت کار' پرویز ملک ضروری انتظامات کی غرض سے پہلے ہی کینیڈا جا چکے تھے۔ ان کی بیگم اور پانچ چھ سال کے بچے بھی

ان کے ساتھ چلی گئی تھیں۔ شبنم' ندیم اور ننھا کو کچھ دن کے بعد ٹورنٹو پہنچنا تھا۔ باقی رہ گئے یونٹ کے ہنرمند اور کمسن اداکار خرم تو ان سب کو اپنے ساتھ ٹورنٹو لے جانے کے سلسلے میں قرعہ فال ہمارے نام نکلا۔ پرویز صاحب نے ٹورنٹو سے فون کر کے سمجھایا۔ ادھر چوہدری ثناء اللہ صاحب نے صورت حال بتائی اور ان سب کو اپنے ہمراہ لے کر ہم کراچی سے برٹش ایئر کے طیارے میں سوار ہو گئے۔

ہماری بیگم للّی اور پانچ چھ سال کی بچی پارو بھی ہمراہ تھیں۔ پارو کا اصلی نام سارہ ہے۔ مگر وہ پارو ہی کے نام سے جانی اور پہچانی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ ابتدا ہی سے اپنا تعارف یوں کراتی ہیں۔ میرا نام سارہ ہے۔ پیار سے سب پارو کہتے ہیں۔

جب پارو نے یہی فقرہ پہلی ملاقات کے موقع پر اداکار ننھا کے سامنے دہرایا تو وہ شرارت سے مخصوص انداز میں مسکرائے اور پوچھا "بے بی پارو تو آپ کو پیار میں کہتے ہیں لیکن جسے آپ پر پیار ہی نہ آئے وہ آپ کو کیا کہتا ہے؟"

پارو سوچ میں پڑ گئیں۔ اس پہلو کے متعلق انہوں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا چند لمحے غور کیا اور پھر قیمتی مشورہ حاصل کرنے کے لئے بھاگی بھاگی للّی کے پاس گئیں۔ "ماما یہ آپ نے ہمارا کیا نام رکھ دیا ہے کہ پیار میں سب پارو کہتے ہیں۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"ننھا انکل کہتے ہیں کہ جو ہم سے پیار ہی نہیں کرتا وہ تو ہمیں پارو نہیں کہے گا۔ تو پھر ہمارا کیا نام لے گا؟"

"ارے بھئی تمہارا نام تو سارہ ہے نا۔ پارو تو سب تمہیں پیار میں کہتے ہیں۔ جو پیار نہیں کرتا وہ تمہیں سارہ کہہ سکتا ہے۔"

پارو نے ننھا کو جا کر تفصیل بتا دی اور پوچھا "انکل اب آپ ہمیں کیا کہیں گے؟"

انکل سوچ میں پڑ گئے۔ "بھئی یہ تو بہت مشکل کام ہے۔ سوچنا پڑے گا۔"

"مگر پہلے آپ یہ بتائیے کہ آپ کو ہم پر پیار کیوں نہیں آتا۔ ہم اتنے خراب تو نہیں ہیں۔"

انکل سے مزید ایکٹنگ نہ ہو سکی۔ انہوں نے پارو کو گود میں اٹھا کر پیار کیا اور کہا "بیٹے ہمیں آپ پر بہت پیار آتا ہے۔ ہم آپ کو پارو ہی کہا کریں گے۔"

"شکریہ انکل! ہمیں بھی فلموں میں آپ کی ایکٹنگ بہت اچھی لگتی ہے۔"

ننھا بے اختیار ہنس پڑے۔ "دیکھا آپ نے' کتنی چالاک بچی ہے' اس نے تو فوراً حساب بے باق کر دیا۔"

لاہور سے کراچی تک بھی ہم سب نے ساتھ ہی سفر کیا تھا مگر جب کراچی سے پرواز کے لئے پی آئی اے کے ہوائی جہاز میں سوار ہوئے تو پارو کی خرم کے ساتھ پکی دوستی ہو گئی۔ خرم کی عمر تو اس وقت گیارہ بارہ سال تھی مگر دیکھنے میں چھ سات سال کا معلوم ہوتا تھا۔ پارو نے بھر خرم کو اپنا ہم عمر ہی سمجھ لیا اور دونوں کی خوب گہری دوستی ہو گئی۔ اس طرح بچوں کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ اب باقی رہ گئے چھ سات سال سے زیادہ عمر کے لوگ۔ یعنی یونٹ کے بقایا ارکان۔ ان میں سے بیشتر حضرات ایسے تھے جنہیں اس سے پہلے یورپ اور امریکا جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا' بلکہ کبھی ملک سے باہر ہی نہیں گئے تھے۔ ان سب کے لئے ہم نے ایک ہدایت نامہ مرتب کیا۔ ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے بعد کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے؟ ائر ہوسٹس کو کس طرح مخاطب کرنا ہے۔ دوران سفر کن باتوں کا بہت زیادہ خیال رکھنا ہے۔ کوئی انگریزی میں مخاطب کرے تو اس کا کیا جواب دینا ہے۔ کسی مشکل میں پڑ جائیں تو پھر کیا کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔

سب سے پہلے تو ہم نے ہر ایک سے دریافت کیا کہ انگریزی کتنے لوگ جانتے ہیں۔ پچاس فیصد سے زائد نے بتایا کہ وہ انگریزی جانتے ہیں۔ یہ خاصی حوصلہ افزا بات تھی مگر جب انگریزوں سے واسطہ پڑا تو ان میں سے بیشتر بھی انگریزی میں فیل ہو گئے اور یس نو کے سوا کچھ نہ بول سکے۔ ان کی مشکل کا سبب بھی ہم جان گئے۔ ہمارے اسکولوں میں جس طرح انگریزی پڑھائی جاتی ہے وہ سب جانتے ہیں رٹ رٹا کر امتحان تو پاس کر لیتے ہیں مگر بولنے اور سمجھنے کے معاملے میں صفر۔ انگریزوں کا لب و لہجہ مختلف ہوتا ہے۔ ایک عام لفظ جس سے آپ بخوبی واقف ہیں وہ ایسے تلفظ کے ساتھ ادا کریں گے کہ آپ کے فرشتوں کو بھی پتا نہیں چل سکے گا کہ یہ کون سا لفظ ہے۔ دراصل ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں انگریزی خالص دیسی لب و لہجے میں بولی جاتی ہے اور ہم سب اس پر فخر بھی کرتے ہیں' حالانکہ تلفظ اور ادائیگی کسی بھی زبان کو بولنے اور سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ یہ کوئی تعریف کی بات نہیں ہے کہ ہم اردو' پنجابی یا سندھی لب و لہجے میں انگریزی

بولیں جو کسی انگریزی داں کی سمجھ میں نہ آئے۔ جب آپ کوئی غیر زبان سیکھ ہی رہے ہیں تو اسے مکمل طور پر اپنائیں۔ اس کی ٹانگ توڑنے کی کوشش نہ فرمائیں۔

ہم آپ کو سردار صاحب کا لطیفہ سنا چکے ہیں کہ انہیں ان کے پینڈو اور زمیندار باپ نے بڑے اہتمام کے ساتھ تعلیم کے لئے لندن بھیجا اور بہت مہنگے داموں ان کی تربیت کے لئے ایک انگریزی اتالیق کا بھی بندوبست کر دیا۔ چھ مہینے بعد جب سردار جی اپنے لخت جگر سے ملاقات کی غرض سے لندن پہنچے تو سب سے پہلے بیٹے کے اتالیق سے ملاقات ہوئی جو خالص پنجابی لہجے میں انگریزی بول رہا تھا۔ سردار جی بہت پریشان ہوئے کہ اس خاندانی انگریز کی زبان کو کیا ہو گیا۔ اس نے کہا: سردار صاحب آپ کا بیٹا مجھ سے زیادہ خاندانی نکلا۔ اس نے تو مجھے بھی انگریزی بھلا دی۔

ہم نے سب سے پہلے تو سب کو یہ سمجھایا کہ وہ بلا ضرورت انگریزی بولنے کی کوشش نہ کریں زلفی صاحب کہنے لگے ”آفاقی صاحب‘ اطمینان رکھئے۔ ہم تو ضرورت کے وقت بھی انگریزی نہیں بولیں گے۔“

دوسرے لفظوں میں ان سب نے ہمیں اپنا سرکاری ترجمان یا مترجم مقرر کر دیا۔

خرم صاحب اسکول میں پڑھتے تھے اور خاصی انگریزی بول اور سمجھ لیتے تھے مگر اس میں ان کے اسکول یا اساتذہ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ دراصل ان کا زیادہ میل جول فلم والوں اور ٹیلی ویژن والوں سے تھا۔ جہاں عموماً انگریزی بولی جاتی ہے۔ چنانچہ خرم کی جانب سے تو ہم بے فکر ہو گئے۔ خرم نے چائلڈ ایکٹر کے طور پر فلموں میں کام کیا تھا۔ ”کامیابی“ سے پہلے وہ پرویز ملک کی بہت کامیاب فلم ”قربانی“ میں کام کر چکے تھے۔ ان کے ساتھ معاملہ یہ گزرا کہ عمر کے ساتھ ساتھ ان کا قدو قامت نہیں بڑھا۔ دیکھنے میں وہ بدستور بچہ ہی نظر آتے رہے۔ بس اتنا ہوا کہ ان کے چہرے پر بچوں والی معصومیت اور بھولپن نہیں تھا۔ ہم نے خرم کے سپرد یہ ڈیوٹی کر دی کہ وہ یونٹ کے باقی تمام اراکین کو انگریزی بول چال سکھائیں۔ انہوں نے بڑی خوشی سے یہ ڈیوٹی قبول کر لی اور باقاعدہ کلاس لینی شروع کر دی۔

ہمارے یونٹ کے ایک ممتاز اور سینئر رکن کیمرا مین ریاض شاہ بخاری بھی تھے۔ ریاض بخاری پاکستان کے بہت نامور اور مایہ ناز کیمرا مین جعفر شاہ بخاری کے چھوٹے بھائی ہیں اور انہوں نے عکاسی کی تربیت اپنے بھائی سے ہی حاصل کی ہے۔ بہت اچھے اور قابل اعتماد عکاس ہیں۔ ایک خوبی یہ ہے کہ انتہائی برق رفتاری سے کام کرتے ہیں۔ ابھی ہدایت کار اگلے شاٹس کے بارے میں سوچنے بھی نہیں پاتا کہ وہ ایک شاٹ مکمل کر کے دوسرے کی تیاری شروع کر دیتے ہیں۔ ریاض بخاری انتہائی دلچسپ اور ہنس مکھ آدمی ہیں۔ ان کے ساتھ کام کرنے والے کبھی بور نہیں ہوتے۔ ان کے کچھ مخصوص الفاظ ہیں جو وہ عموماً بولتے رہتے ہیں۔ مثلاً ”ٹچن ٹاچ“۔ یہ لفظ سمندر کی مانند وسیع معنی رکھتا ہے۔ ان کے ساتھ کام کرنے والے فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ کس موقع پر ”ٹچن ٹاچ“ سے ان کی کیا مراد ہے۔ ان کی ایک اور پسندیدہ اصطلاح ”سپرد خدا“ ہے۔ یہ بھی ہزار معنی رکھتا ہے۔ اگر کوئی کام خراب ہو جائے تو ان کا مشورہ ہوتا ہے کہ اسے ”سپرد خدا“ کر دو۔ کوئی کام ٹھیک ہو جائے تو بھی وہ اسے ”سپرد خدا“ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ کسی کام میں الجھن ہو جائے تو بھی ان کا کہنا یہ ہوتا ہے کہ ”یہ تو سپرد خدا“ ہو گیا۔ کوئی ساتھی کام چھوڑ کر چلا جائے تو وہ بھی ”سپرد خدا“ ہو جاتا ہے۔ کوئی نیا ساتھی دستیاب ہو جائے تو اسے بھی وہ ”سپردِ خدا“ ہی کرتے ہیں۔ فلم ہٹ ہو جائے تو بھی ”سپرد خدا“ ہو جاتی ہے اور اگر فلاپ ہو جائے تب بھی ان کا تبصرہ یہی ہوتا ہے کہ وہ تو بس سپرد خدا ہو گئی ہے۔

کراچی سے ہمیں پی آئی اے کے ذریعے سفر کرنا تھا اور لندن سے برٹش ائیرویز کی پرواز لینی تھی جو ہمارے لندن پہنچنے کے دو گھنٹے بعد ٹورنٹو کے لئے روانہ ہوتی تھی۔ یعنی ہماری ائر لائن پی آئی اے تھی مگر بقول ریاض بخاری کے ’لندن کے بعد پی آئی اے نے ہمیں برٹش ائرویز کے ذریعے ”سپرد خدا“ کر دیا تھا۔ کراچی سے لندن تک جانے کے لئے ہمیں عجیب و غریب راستہ اختیار کرنا تھا۔ مثلاً پہلے کراچی سے ’بحرین‘ پھر بحرین سے فرینکفرٹ یا ایمسٹرڈیم (یہ صحیح طور پر یاد نہیں رہا) پھر وہاں سے کوپن ہیگن اور کوپن ہیگن سے لندن۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ڈیفنس سے بندر روڈ جانے کے لئے پہلے آپ ناظم آباد جائیں‘ اس کے بعد ائرپورٹ کا سفر اختیار کریں اور پھر وہاں سے شہید ملت روڈ سے ہوتے ہوئے بندر روڈ پہنچ جائیں۔ ریاض بخاری نے اس بلا وجہ کی طویل سفر پر سخت اعتراض کیا اور ہم سے کہا ”آفاقی صاحب‘ یہ کیا بات ہے۔ ہمارا جہاز فرینکفرٹ سے سیدھا لندن کیوں نہیں جا سکتا؟“

ہم نے کہا "اس لئے کہ یہ پی آئی اے والوں کی مصلحت ہے۔ یہ روٹ بھی انہوں نے ہی بنایا ہے۔ ہمارا اس میں قطعاً کوئی ہاتھ نہیں ہے۔"

کہنے لگے "سرپہ تو کوئی گل نہ ہوئی۔ آپ کا فرض ہے کہ انہیں سمجھائیں۔ بلاوجہ پٹرول پھونکنے کی کیا لوڑ ہے۔ یہ تو سرکاری خزانے کا بڑا نقصان ہے۔"

ہم نے کہا "وہ تو ہم اگلی بار سمجھائیں گے۔ فی الحال تو ہمیں کوپن ہیگن جانا ہی پڑے گا۔"

انہوں نے ایک سرد آہ بھری۔ بولے "آخر اس کا کوئی سبب تو ہونا چاہئے۔"

ہم نے کہا "سبب نہیں اس کے تو کئی درجن اسباب ہیں۔" انہوں نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا۔ ہم نے کہا "شاہ جی آپ اس فلائیٹ کے مسافروں پر ایک نگاہ ڈالئے۔ اس میں بیس پچیس فیصد سے زیادہ مسافر کوپن ہیگن کے ہیں۔ آپ کے پیچھے والی قطار میں جو بچہ مسلسل روئے جا رہا ہے اس کی ماں، باپ بہن بھائی ملا کر سات افراد ہیں۔ یہ سب کوپن ہیگن جا رہے ہیں۔"

"آپ کو کس نے بتایا؟"

"ائر ہوسٹس نے۔ اس مسلسل رونے والے بچے سے تنگ آ کر ہم نے پوچھا تھا کہ یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید بحرین جا رہے ہیں۔ مگر پتا چلا کہ کوپن ہیگن جا رہے ہیں۔"

انہوں نے اپنے آس پاس نگاہ دوڑائی اور بولے "واقعی۔ یہ سب کے سب تو پاکستانی ہیں۔"

ہم نے پوچھا "ایک ہی نگاہ میں آپ کو کیسے پتا چل گیا؟"

کہنے لگے "ان کے بچوں کی تعداد سے۔ یہ سب مسلمان ہیں۔ زیادہ پڑھے لکھے بھی نہیں لگتے۔ میرا خیال ہے کہ نوکریوں کے سلسلے میں واپس جا رہے ہیں۔"

ہم نے ان کی معاملہ فہمی کی داد دی۔ "آپ کی عقل مندی کا جواب نہیں ہے۔ اب فرمائیے کیا خیال ہے آپ کا؟"

بولے "فرمانا کیا ہے۔ اب تو اس معاملے کو سپرد خدا کر دینا چاہئے۔ یہ سب بچے کوپن ہیگن تک یوں ہی روتے رہیں گے اور ان کی مائیں آپس میں چخ چخ کرتی رہیں گی۔"

ہوائی جہاز نے پرواز شروع کی تو بچوں اور عورتوں کا شور و غل کچھ کم ہو گیا۔ مگر ائیر ہوسٹسوں کی شامت آ گئی۔ کئی بچے شوقیہ طور پر ائیر ہوسٹس کو بلانے والا بٹن دبا رہے تھے۔ ان کے والدین بھی انہیں اس کھیل میں مصروف دیکھ کر مطمئن اور خوش تھے۔ خواتین بار بار ائیر ہوسٹس کو طلب کر کے مختلف سوالات کر رہی تھیں یا پھر چائے، پانی وغیرہ کی فرمائشیں کرنے میں مصروف تھیں۔ بحرین کے ائر پورٹ پر گنتی کے چند مسافر اترے مگر درجنوں نئے مسافر ہوائی جہاز میں سوار ہو گئے۔ ان میں بھی اکثریت پاکستانیوں کی تھی۔ ہمیں خیال ہوا کہ شاید پی آئی اے والوں نے سیٹوں سے زائد مسافر بٹھا لئے ہیں مگر کچھ دیر کے ہنگامے کے بعد سب ہی جہاز میں سما گئے۔

اتنی دیر میں ریاض بخاری خبر لائے کہ غسل خانوں میں سے یوڈی کولون کی تمام شیشیاں اور صابن کی ٹکیاں غائب ہیں، حالانکہ کچھ دیر پہلے وہ گئے تھے تو یہ سب چیزیں موجود تھیں۔

"تو پھر غائب کیسے ہو گئیں؟"

"کہنے لگے "سب جی مسافروں نے سپرد خدا کر دیں۔"

ہم نے بہت بیرونی فضائی سفر کئے ہیں اور اکثر پی آئی اے کے ذریعے کئے ہیں۔ ہمارا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ پی آئی اے کی سروس دوسری کمپنیوں کے مقابلے میں کمتر نہیں ہے بلکہ بعض لحاظ سے بہتر ہے، مگر جس قسم کے پاکستانی مسافروں کی اکثریت پی آئی اے کے جہازوں میں سفر کرتی ہے ان سے عہدہ برآ ہونا پی آئی اے اسٹاف کا ہی دل گردہ ہے۔ تعلیم اور تہذیب کی کمی کے باعث ان لوگوں کو کسی چیز کا ڈھنگ ہے نہ سلیقہ۔ پی آئی اے کے عملے کو یہ ذاتی اور گھریلو ملازم تصور کرتے ہیں اور ان کے ساتھ مسافروں کا سلوک انتہائی افسوسناک ہوتا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کے باوجود الزام پی آئی اے والوں کو ہی دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے مسافر کسی اور فضائی کمپنی کے ذریعے سفر کریں تو انہیں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے۔

ہماری پچھلی نشستوں پر دو بچے تو لگاتار رونے میں مصروف تھے۔ نہ تو ان کی آواز کم ہوتی تھی نہ ہی وہ تھکتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک ٹیپ ریکارڈ لگا ہوا ہے۔ مزے کی

بات یہ کہ ان کے والدین نے انہیں قطعاً نظر انداز کر رکھا تھا۔
ایک بار لبنٰی نے ایک بچے کی ماں سے پوچھا" یہ بچہ کیوں رو رہا ہے؟"
انہوں نے پنجابی میں جواب دیا "اسے شوق ہے رونے کا۔"
لبنٰی نے کہا "آپ اسے چپ کیوں نہیں کراتیں۔ اس کا گلا خراب ہو جائے گا۔"
بولیں "تم فکر نہ کرو۔ اس کا گلا بہت مضبوط ہے۔ دن رات یہی کام کرتا ہے۔"
لیجئے، قصہ ختم۔ خیر بچوں کے رونے تک تو پھر بھی غنیمت تھا مگر جب ان خواتین نے آپس میں جھگڑنا شروع کر دیا تو مسافروں کا رہا سہا سکون بھی غارت ہو گیا۔ وہ اودھم مچا کہ خدا کی پناہ۔ آس پاس والوں نے جو غالباً ان کے دوست اور رشتے دار ہی تھے، دونوں پارٹیوں کی مخالفت یا حمایت میں بولنا شروع کر دیا۔
تنگ آ کر ہم نے ائر ہوسٹس کی مدد طلب کی "آپ انہیں خاموش کیوں نہیں کراتیں؟"
"سر انہیں چپ کرانا انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے۔"
ہم نے کہا "تو پھر کیا انہیں چپ کرانے کے لئے جنّات بلانے پڑیں گے۔"
وہ ہنسنے لگی "سر! ان لوگوں کو سمجھانا بہت مشکل ہے، مگر میں کوشش کرتی ہوں۔"
یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد نمودار ہوئی تو اس کے ساتھ ایک اور ائر ہوسٹس بھی تھی۔ وہ دونوں کھانے کی ٹرالی گھسیٹتی ہوئی لا رہی تھیں۔ کھانے کا سلسلہ شروع ہوتے ہی ہوائی جہاز میں خاموشی چھا گئی۔ ہم نے دل ہی دل میں ائر ہوسٹس کو بہت داد دی۔ مسافروں کا منہ بند کرنے کے لئے اس نے واقعی بہت اچھی ترکیب سوچی تھی۔
کھانے سے کافی دیر میں فراغت ہوئی۔ اس سلسلے میں یہ بھی ہوا کہ بعض مسافروں نے اپنی ٹرے کا کھانا اپنے بیگ میں ڈال لیا۔ ائر ہوسٹس کی نظر پڑی تو عذر یہ پیش کیا کہ اس وقت بھوک نہیں ہے، گھر جا کر کھائیں گے۔
رات تو پہلے ہی ہو چکی تھی۔ کھانے سے فراغت ہوئی تو سب نے اونگھنا شروع کر دیا۔ کچھ لوگ سو بھی گئے۔ چھوٹے اسکرین پر فلم بھی چل رہی تھی جو ظاہر ہے کہ مسافروں کی اکثریت کو پسند نہیں ہو گی۔ پھر آواز سننے کے لئے ایک ائر فون بھی حاصل کرنا پڑتا تھا جس کی فیس دو ڈالر تھی۔ اس لئے بہت سے حضرات و خواتین نے یہ جھنجھٹ

پالنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ جب تک خاموش فلم پسند آئی دیکھتے رہے۔ جب نیند کا غلبہ ہوا تو سو گئے۔ مگر کمال کی بات یہ ہے کہ ہمارے پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں بچوں کے رونے کی آوازوں میں ذرا سی بھی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ آوازوں سے تو کافی شناسائی ہو گئی تھی مگر فن کاروں کا چہرہ دیکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ رات ہوئی اور سب سو گئے مگر ان بچوں کے رونے کی آوازوں میں ذرا سی بھی کمی بیشی نہیں ہوئی۔ آخر ہمیں یہ اشتیاق پیدا ہوا کہ ان کی شکل تو دیکھی جائے۔ جنہوں نے جہاز کے سارے مسافروں کی زندگی وبال کر رکھی ہے۔ کسی بہانے ہم سیٹ سے اٹھے اور پچھلی سیٹ پر نگاہ ڈالی۔ دیکھا تو پچھلی سیٹوں پر تشریف فرما تمام خواتین و حضرات نیند کی آغوش میں گم ہو چکے تھے۔ ایک دو سال کا بچہ اور دوسرا اس سے قدرے بڑا بچہ مزے سے اپنی سیٹوں پر نیم دراز تھے۔ ان دونوں کی آنکھیں بند تھیں مگر آوازیں بدستور فضا میں نغمے بکھیر رہی تھیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان کے ماں باپ یا آس پاس والوں کو مطلق پروا نہیں تھی اور وہ چین کی نیند سو رہے تھے۔ ان دونوں گلوکاروں کا یہ مقابلہ کوپن ہیگن تک جاری رہا۔ جب کوپن ہیگن پر جہاز رکا تو ان کی ماؤں نے دونوں کو گھسیٹ کر اٹھایا، اپنے بیگ سنبھالے اور باہر نکل گئیں۔ ان کے رونے کی آوازیں بدستور جاری تھیں اور ہمارا خیال ہے کہ ائرپورٹ سے گھر پہنچنے تک ان کے نغمات کا سلسلہ ختم نہیں ہوا ہو گا۔
کوپن ہیگن کے وقت کے مطابق رات کے دس بج رہے تھے۔ ہمیں لندن پہنچنے میں ابھی مزید ایک ڈیڑھ گھنٹا لگنا تھا اور پریشانی کی بات یہ تھی کہ ہمارے ٹکٹ پر لندن سے ٹورنٹو کے لئے برٹش ائر کی پرواز کا جو وقت درج تھا وہ بھی دس بجے کا تھا۔ ہمارے ہمراہیوں کو اس بات کا احساس ہوا تو ان میں کھلبلی مچ گئی۔ ریاض بخاری صاحب ان کی ترجمانی کی غرض سے ہمارے پاس آئے اور بولے "سر' یہ معاملہ تو گڑبڑ ہونے لگا ہے۔ ہم تو بہت لیٹ ہو جائیں گے۔ پھر لندن میں کیا کریں گے؟"
ہم نے کہا "یہ تو خود ہمیں بھی معلوم نہیں ہے۔ ٹھہریں ابھی ائر ہوسٹس سے دریافت کر لیتے ہیں۔"
ہنس مکھ سی خوش وضع ائر ہوسٹس کو بلا کر ہم نے یہ مسئلہ پیش کیا تو اس نے بڑی بے پروائی سے کہا "تو پھر کیا ہوا سر! ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ رابطے کی پروازیں گڑبڑ ہو جاتی ہیں۔"

ہم نے کہا "تو پھر مسافر کیا کرتے ہیں؟"

بولیں "انتظار کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔ جب آپ کو دوسری فلائیٹ میں جگہ ملے گی تو آپ کو لندن سے ٹورنٹو بھیج دیا جائے گا۔" اتنا کہہ کر وہ ہمارے پاس سے رخصت ہو گئیں۔ دراصل ایک خاتون اپنے شیر خوار بچے کے لئے بوتل میں دودھ طلب کر رہی تھیں۔ وہ جاتے جاتے ہمیں ایک امید کا پیغام دے گئیں۔ "سر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ٹورنٹو جانے والی فلائیٹ بھی لیٹ ہو جائے۔"

ریاض بخاری کی پریشانی میں قدرے کمی واقع ہو گئی۔ کہنے لگے "آفاقی صاحب' یہ لڑکی جتنی خوب صورت ہے اتنی ہی عقل مند بھی ہے۔ دیکھا آپ نے کیسا نکتہ پیدا کیا ہے اس نے؟"

ہم نے کہا "واقعی بہت اچھا نکتہ ہے۔" مگر ہم نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ برٹش ائر کی پرواز لیٹ ہونے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ سوچا اگر وہ کچھ دیر اور خوش رہ سکتے ہیں تو کیوں نہ رہیں۔ بعد میں تو ان پر جو گزرنی ہے وہ گزر ہی جائے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لندن ائرپورٹ پر پہنچنے تک وہ بے حد خوش و خرم رہے۔

رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے جب ہمیں یہ خوش خبری ملی کہ ٹورنٹو جانے والی برٹش ائر کی پرواز عین وقت پر رخصت ہو چکی ہے۔

شاہ صاحب نے ایک آہ بھری اور بولے "سر ہم تو سپرد خدا ہو گئے۔"